ہر قسم کی نہایت اعلیٰ چھپائی و رنگین لیتھو پرنٹنگ کا کام
نیز فینسی پیپر باکس و بلاک بکفایت تیّار کئے جاتے ہیں

قادری پیپر بکس فیکٹری

نور منزل ۔ محمد علی روڈ ۔ بمبئی ۳

TEL:-27656

Kadri Paper Box Factory.

CARDBOARD BOX MANUFACTURERS AND PRINTERS

NOOR MUNZIL, MOHAMEDALI ROAD, BOMBAY 3.

ادبی مرکز ہند پبلشرز کا ماہنامہ

ایشیا

پروپرائٹرز ماہنامہ ایشیا ادبی مرکز ہند پبلشرز

ساغر نظامی

عبدالقادر محمد قادری

ادارہ

ذکیہ سلطانہ

ساغر نظامی

ناشر

ادبی مرکز ہند پبلشرز

کورٹ رائل کرائسٹ چرچ روڈ بائیکلہ بمبئی ۸

سالانہ چندہ آٹھ روپیہ

ششماہی چندہ پانچ روپیہ

قیمت فی پرچہ بارہ آنے

پرنٹر پبلشر ساغر نظامی نے قادری پریس نور منزل محمد علی روڈ بمبئی ۳ میں چھپوا کر ادبی مرکز ہند۔ اے۔ کورٹ رائل کرائسٹ چرچ روڈ بائیکلہ بمبئی ۸ سے شائع کیا

ریگلو پروڈکٹس

ریگلو ہیئر آئل

دورِ حاضرہ کا بہترین کیمیاوی روغن، جو گنج کو دور کر کے بالوں کو اگاتا۔ گرنے سے روکتا۔ مضبوط۔ دراز اور چمکدار بناتا ہے۔ دماغ کو تازگی بخشتا ہے۔ اسکے متواتر استعمال سے بالوں کی سیاہی قائم رہتی ہے۔ اور بوڑھاپے میں جوانی کی بہار لوٹ آتی ہے۔

ریگلو ٹانک

جگر کو تقویت بخشتا اور خون صالح پیدا کرتا ہے۔ وزن بڑھاتا اور چہرہ کو جوانی کا رنگ دیتا ہے۔ اس کے استعمال سے قوتِ جسمانی دونی ہوتی ہے۔ ضعفِ معدہ۔ طحال اور جگر کے لئے اکسیر کی حیثیت رکھتا ہے۔

منجن پائیریا

مرض پائیریا کی مخصوص دوا ہے۔ مسوڑھوں کی سوجن دور کرتا ہے۔ منہ کی بدبو مٹاتا ہے۔ اور دانتوں سے خون و پیپ کی آمد کو بند کر دیتا ہے۔ ہلتے ہوئے دانتوں کو اس طرح جما دیتا ہے گویا وہ کبھی ہلے ہی نہیں تھے

ریگلو بام

نزلہ۔ زکام۔ سینے کے جکڑنے۔ دردِ سر۔ جوڑوں کے درد اور ہر قسم کے درد کیلئے اکسیر ہے

ریگلو کیمیکل ورکس پردھان منیشن۔ جے جے ہسپتال۔ بمبئی ۳

فہرست

ایشیا

جلد (۱۰) — فروری سنہ ۱۹۴۹ء — نمبر (۱)

انجام سے آغاز تک!

ایشیا ۵ سال کے بعد پھر شائع ہو رہا ہے۔ التواء کی یہ مدت اتنی طویل ہے کہ اس کی اشاعت کا خیال بھی دل میں نہیں آنا چاہیے تھا لیکن یقین کیجیے کہ ان پانچ برسوں میں ایک لمحہ بھی اس خیال سے آزاد نہیں گذرا کہ ایشیا کو زندہ ہونا چاہیے۔

ایشیا ۱۹۳۵ء سے ۱۹۴۲ء تک جاری رہا۔ یعنی کامل ۵ سال تک اس نے ان تمام سیاسی، تہذیبی، علمی اور ادبی تحریکوں میں اپنی بساط کے مطابق حصہ لیا جو اس کے زمانے کی ترقی پسند تحریکیں تھیں اور جن تحریکوں کی کامیابی سے ملک کا مستقبل وابستہ تھا۔

ایشیا نے قومی تحریک کے ساتھ ساتھ ادب کی نئی تحریک کے لیے کام کیا۔ اس نے صاف سوچنے والے شعراء اور اہل قلم کا ایک ترقی پسند حلقہ اس وقت بنایا جب ترقی پسند تحریک شروع بھی نہیں ہوئی تھی اور جب یہ تحریک شروع ہوئی تو ایشیا سب سے پہلا ماہنامہ تھا جس نے اس کی تائید و تبلیغ میں نمایاں حصہ لیا۔ نوجوان ذہن کے لیے وہ مستقل ترغیب تھا۔ اس نے نیا ادب، نئے ادیب اور نئے ادب نواز پیدا کیے اور خاص طور پر اردو پڑھنے والے ہندو مسلم عوام میں سیاسی شعور پیدا کرنے کی ان تھک کوشش کی جس کی بنیاد ہنگامی سیاسیات پر نہیں، سیاست کی بنیادی باتیں جاننے پر تھی۔

ایشیا نہ صرف ہندو مسلم اتحاد کا دیوانہ تھا بلکہ اتحادِ ایشیا کے گیت گانے والوں میں سے تھا اس کی آرزو تھی کہ مشرق کے تمام بکھرے ہوئے تہذیبی رشتے اس طرح جڑ جائیں کہ پھر کوئی طاقت ان کو نہ توڑ سکے۔

وہ ان دیوانوں کا ایک کارواں تھا جو سود و زیاں سے آزاد ہو کر متحدہ قومیت کا خواب دیکھتے تھے، متحدہ ملک کا خواب دیکھتے تھے۔ انسانیت کا خواب دیکھتے تھے اور ان خوابوں کو حقیقت بنانے کے لیے انھوں نے اپنی فکری و عملی قوتوں کو وقف کر دیا تھا

خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہوئے۔ لیکن خواب شرمندۂ تعبیر ہوں گے۔ ہر چند کہ ۵ سال میں ملک کا نقشہ ہی نہیں بدلا، دنیا کا نقشہ بدل گیا ہے۔ لیکن ہر دم اک تازہ تغیر، اک نئی بے چینی، اک نیا کرب، اس بات کی دلیل ہے کہ کوئی بڑی پیدائش عدم میں کسمسا رہی ہے اور خواب حقیقت ضرور بنیں گے۔

۵ سال قبل ہمارے سامنے ملک کی آزادی اور تعمیر کا مقصد تھا۔ یہ مقصد آزادی کے بعد بھی پورا نہیں ہوا۔ تقسیم نے اس مقصد کی راہ میں نئی پیچیدگیاں پیدا کر دی ہیں ان پیچیدگیوں نے پہلی تمام کوششوں کو بے اثر کر دیا ہے۔ لہٰذا اب از سر نو نئے حالات کی روشنی میں تمام بنیادی و تعمیری کوششیں کرنی ہوں گی۔

جہاں تک ایشیا کے طریق کار کا تعلق ہے شاید مجھے یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اس کا دائرۂ فکر و عمل کبھی محدود نہیں رہا وہ مسائل کے متحدہ حل کا قائل ہے اس نے بار بار اس حقیقت کو دہرایا ہے کہ ہماری تہذیب ایک ہے اور ماضی کے اثرات سے آزاد ہو کر ہماری زندگی کی طرح نئی ہے اسی نئی تہذیب کو ہمیں سنوارنا اور نکھارنا چاہیے۔

چنانچہ ہم اب بھی جداگانہ ہندو مسلم تہذیب کے نام پر ہر اس تہذیب سوز تحریک کے خلاف آواز بلند کریں گے جس کے ذریعہ ہندو مسلمانوں کے تہذیبی رشتوں کو توڑنے کی کوشش کی جائے گی۔ ہم تہذیب و تمدن اور زبان و ادب کی تقسیم کی ہر ممکن مخالفت کریں گے اور اردو ہندی کے ادیبوں کو ایک جھنڈے کے نیچے جمع ہونے کی دعوت دیں گے تاکہ سب مل کر اپنے مشترک سرمایہ کی حفاظت کر سکیں۔

ہم جانتے ہیں کہ ہماری راہ کٹھن ہے اور سنہ ۳۵ء کے مقابلے میں سنہ ۴۹ء میں ہمارے فرائض بہت کچھ بڑھ گئے ہیں ان اہم فرائض سے عہدہ برآ ہونے کے متعلق وعدے اور دعوے کرنا آسان بات نہیں۔ ہم صرف اپنی ہمت کا اظہار کر سکتے ہیں اور جو کچھ کرنا چاہتے ہیں اس کے لئے شاید اعلان کی ضرورت نہیں۔ ہماری راہ صاف اور پُر امید ہے ہم ...... راہ کے پیچ و خم اور ہمت شکن پست و بلند کو کسی نہ کسی طرح عبور کریں گے اور اپنی منزل پہ پہنچکر دم لیں گے۔

ہم محسوس کرتے ہیں کہ اگر اس وقت بھی صحیح طور پر عوام میں صحیح ذہنیت پیدا نہیں کی گئی تو نہ ہم آزادی کی حفاظت کر سکیں گے اور نہ ملک ترقی کر سکے گا۔ کیونکہ اگر محض سیاسی انقلاب ذہنیت میں تبدیلی پیدا کر سکتا تو ملک میں ہرگز وہ خونی کھیل نہ کھیلا جاتا جو دھڑلے سے کھیلا گیا۔ اس لئے جب تک ادب کے ذریعہ عوام میں اتحاد، تعمیر، ترقی اور خیرسگالی کے جذبات پیدا نہیں کئے جائیں گے۔ ملک خطروں سے محفوظ نہیں ہو سکتا۔ تعمیر اور تحفظ کے لئے ہمیں فرقہ پرست، موقع باز، اور تمام انحطاط پسند طاقتوں کے خلاف جد و جہد کرنی ہے اور اس کے لئے آپ کا تعاون نہایت ضروری ہے۔

ہمیں ایشیا کے ناظرین سے توقع ہے کہ وہ ہمیں مفید مشورے دیں گے۔ اپنی امیدوں اور توقعات سے آگاہ کریں گے اور ہمارے کاموں پر تنقید کریں گے۔ تاکہ ہم اپنی خامیوں کو معلوم کر سکیں اور صحت کے ساتھ ان کی توقعات کو پورا کریں۔

ایشیا کے پہلے ہی نمبر سے آپ کو اندازہ ہوگا کہ اسے ملک کے تمام نئے اور پرانے بزرگ اور نوجوان، معتدل اور انتہا پسند، قدیم الخیال اور ترقی پسند شعراء ادیبوں اور انشا پردازوں کی والہانہ تائید و حمایت حاصل ہے۔ یہ ادیب ایک آواز، ایک نغمہ بن کر مایوس اور مردہ دلوں میں زندگی کی نئی جوت جگا رہے ہیں۔

ایشیا کی بزم ادب، مذہب نسل اور زبان کی پست و نامبارک قیدوں سے آزاد ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ ہندو مسلمان سکھ اور اردو ہندی کے لکھنے والے پہلو بہ پہلو اس میں شریک ہیں۔ اور اپنے اشتراک فن سے اس کی رونق کو چار چاند لگا رہے ہیں۔

ہر چند کہ مسائل کے متعلق ایشیا کی ایک طے شدہ حکمت عملی اور بنی بنائی راہ ہے جس میں تخریب اور رجعت کی کوئی گنجائش نہیں۔ لیکن جس طرح وہ خود اپنے لئے اظہار و بیان کی آزادی چاہتا ہے اسی طرح ہر مکتب خیال کے ادیبوں اور شعراء کے حق کو تسلیم کرتا ہے۔ اس کے دروازے سب کے لئے کھلے رہیں گے۔ یعنی جو ہماری رائے سے متفق نہیں انھیں بھی کامل آزادئ تحریر ہوگی لیکن ہم اپنے بنیادی مقاصد کی بہرحال حفاظت کریں گے اور اس تضاد سے ایشیا کو بچائیں گے جو تخریب و انتشار کا باعث بن سکتا ہے۔

ایشیا کا پہلا شمارہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ یہ آپ کا اپنا پرچہ ہے جس سے ماضی کی خوبصورت یادیں وابستہ ہیں گو یہ مضبوط بنیادوں پر جاری کیا گیا ہے۔ لیکن ہماری طرح اس کی زندگی اور ترقی کی ذمہ داری آپ پر بھی ہے اگر آپ نے تعاون کیا تو منزل ہم سے کچھ زیادہ دور نہیں ہے۔

آخر میں ہم اُن ادباء اور قائدین کا شکریہ ادا کرتے ہیں جنہوں نے ایشیا کی نئی زندگی کا خیر مقدم کیا۔ خاص کر محترمہ مادام صوفیہ بانی و مدیرہ انڈین پی۔ ای۔ این۔ محترمہ عصمت شاہد لطیف۔ محترمہ مسز کرشنا ہٹھی سنگھ اور آنریبل مسٹر بی جی کھیر وزیر اعظم بمبئی۔ ہز اکسلینسی سر کنور مہاراج سنگھ گورنر بمبئی بشر میس کرسہاس میئر آف بمبئی۔ حضرت جوش ملیح آبادی۔ ڈاکٹر ملک راج آنند کرشن چندر۔ خواجہ احمد عباس پنڈت سندر لال جی۔ شیخ عبداللہ وزیر اعظم جموں و کشمیر۔ رامانند صاحب ساگر۔ آنریبل ڈاکٹر سمپورنانند وزیر تعلیم و محنت حکومت یو۔پی۔ راجہ صاحب مہندر پرتاب بانی ورلڈ فیڈریشن۔ حسین شہید سہروردی سابق وزیر اعظم بنگال۔ مسٹر اے۔ اے۔ فیضی ممبر پبلک سروس کمیشن بمبئی گورنمنٹ۔ آنند کوشلیان جی۔ راجندر سنگھ صاحب بیدی۔ مسٹر ایس کے پٹیل ممبر کانگریس ورکنگ کمیٹی اور رکن کانسٹی ٹیوٹ اسمبلی (ہند) سید ممتاز حسین ایم۔ اے۔ ہز اکسلینسی سر سری پرکاش گورنر آسام۔ نواب محمد اسمٰعیل خان صاحب رکن دستور ساز اسمبلی (ہند) سر تیج بہادر سپرو (مرحوم) آنریبل نثار احمد خان شروانی وزیر زراعت یو۔پی گورنمنٹ۔ ڈاکٹر سچدانند سنہا وائس چانسلر پٹنہ یونیورسٹی مسٹر یوسف مہر علی سوشلسٹ لیڈر۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی اور آنریبل حافظ محمد ابراہیم وزیر مواصلات حکومت یو۔پی کا ان بزرگوں اور ساتھیوں کے پیغامات میں مقاصد کے مختلف پہلوؤں

کی طرف ہدایت ہے۔ یہ ذمہ داری کی ایک اہم دستاویز ہیں۔ جس کے ایک ایک لفظ میں ہم سے بڑی دور رس امیدیں قائم کی گئی ہیں ہم ان امیدوں کو پورا کرنے کی ہر ممکن کوشش کریں گے۔

ادب کی قدروں پر تقسیم کا اثر

تقسیم سے قبل اردو ادب جن راہوں سے گذرا وہ جد و جہد کی ایسی راہیں تھیں جن میں سینکڑوں پگڈنڈیاں آ کر ملتی تھیں۔ ان میں ماضی سے پھوٹنے والے بل بیچ بھی تھے اور حال سے نکلے ہوئے نئے راستے بھی۔ ان راستوں پر مختلف تصوّرات اور متضاد خیالات کاندھے سے کاندھا ملائے ایک بڑی شاہراہ کی طرف چلتے رہے۔ یہ شاہراہ برطانوی غلامی سے آزادی حاصل کرنے کی شاہراہ تھی۔ جو فرقہ پرستی اور رجعت پسندی کے حملوں سے محفوظ نہ تھی۔

لیکن اردو ادب نے اپنی نوبہ نو تخلیقات سے ان دونوں کے حملوں کا مردانہ وار مقابلہ کیا، اس مقابلے سے اس میں نئی توانائی پیدا ہوتی چلی گئی۔ جیسے جیسے قومی تحریک میں عوامی تصور ترقی کرتا گیا۔ ادب کے موضوع اور مقصد بھی نکھرتے گئے یہاں تک کہ ادب میں وہ گہرائی پیدا ہو گئی جو نئے سماجی شعور کے تقاضوں کو گرفت میں لا سکی۔ انداز فکر میں ایک عمق، جرأت اور حکیمانہ انداز جھلکنے لگا۔ بعض گوشوں میں تو ادب کی نئی تحریک قومی تحریک سے آگے بڑھ گئی تاہم نظریات اور عمل میں کوئی قطعی ربط پیدا کرنے کا عہد نہیں تھا۔ بہت کچھ بے ربطی موجود رہی۔ یہاں تک کہ ملک تقسیم ہو گیا۔ اور یہ بے ربطی نقطۂ عروج پر پہنچ گئی۔

تقسیم نے جہاں اور چیزوں کو تقسیم کیا ادب اور اس کی قدروں کو بھی الٹ پلٹ کر دیا۔ ہندوستانی وطنیت کا تصور کسی قدر توانا تصور تھا وہ پارہ پارہ ہو کر رہ گئی۔ پاکستانی اور ہندوستانی قومیت میں تبدیل ہو گیا دو قومیت اور دو وطن بن جانے کا یہ ایک لازمی نتیجہ تھا جس نے ادب کی مروجہ قدروں کو بھی ہلا دیا۔ جن کی گرفت اپنے فکر و عمل پر مضبوط تھی وہ اس تبدیلی کو برداشت کر گئے۔ لیکن جن کی فکر خام تھی وہ فرقہ پرستی اور فسطائیت کی رَو میں بہہ گئے۔ ان میں سے کئی ایسے تھے جنہیں وقت اور مصلحت نے ترقی پسندی کی "رعایتی سندیں" دلوا دی تھیں لیکن اب وہی ان ہاتھوں کو کاٹنے کے لئے بڑھ رہے ہیں جن ہاتھوں نے انہیں سندیں عطا کی تھیں۔

لیکن ان لوگوں کو یہ فراموش نہ کرنا چاہئے کہ تقسیم ہو کر دونوں ملکوں میں زندگی "جامد" نہیں ہو گئی ہے۔ اگر زمین ہے تو اس کے سینے سے نئے درخت ضرور پھوٹیں گے اور ان درختوں کی شاخوں میں کبھی پھل پھول ضرور آئیں گے۔ اگر موجودہ نظام کے خول سے نئی روح ابھرنی ہے اور ضرور ابھرے گی تو اس وقت زندگی و ترقی سے فرار کرنے والے یہ ادیب کہاں پناہ لیں گے۔؟

تقسیم نے ایک خاندان کے افراد کو دو سلطنتوں میں ضرور بانٹ دیا ہر دل ضرور زخمی ہے اور زخموں کا انجام اندمال کے سوا کچھ نہیں ہے لیکن آنکھیں محبت کے آنسوؤں سے خالی نہیں اور جب تک انسان میں انسانیت کی پیاس موجود ہے خالی نہیں ہو سکتیں۔

اُن ادیبوں اور شاعروں کو جنکے ادب میں فرقہ پرستی، رجعت پسندی اور مذہبی عصبیت کا زہر جھلکتا ہے یہ سوچنا چاہئے کہ ادب بدلتی ہوئی سیاسیات کا غلام نہیں ہوتا۔ ادب کی تعمیری جہت بھی اس کی ایک اہم قدر ہے اور اُسے لمحاتی ادب میں بھی باقی رہنا چاہئے۔

اب دونوں نو آبادیات میں جس اتحاد اور خیر سگالی کے جذبات ترقی پا رہے ہیں اور نزاعی مسائل کو مل بیٹھ کر حل کرنے کی ذہنیت پیدا ہو چلی ہے یہ ہند و پاکستان کے لئے نہایت مبارک آثار ہیں۔ اب ادیبوں کا فرض ہے کہ وہ عوام میں اتحاد و انسانیت کے جذبات پیدا کرنے کی ذمہ داری کا احساس کریں۔ اور اتحاد و خیر سگالی کے نئے رشتوں کو مضبوط کریں۔

اور انہی کا نہیں اردو ہندی دونوں زبانوں کے ادیبوں کا فرض ہے کہ رجعت پسندی کو ہند و پاکستان سے بیخ و بن سے اکھیڑ پھینکیں، یہ رجعت پسندی اور غلط مذہبیت لاکھوں بے گناہ انسانوں کی تباہی و بربادی اور قتل و غارت کا سبب بن چکی ہے۔ اسکی بنیادوں پر اگر مستقبل کی تعمیر کی گئی تو وہ بے بنیاد ہو گی اور ماضی سے زیادہ خوفناک نتائج پیدا کرے گی۔

آج جب ہر طرف ذہنی انتشار ہے، ہزاروں برس کی تہذیبی روایات الٹ پلٹ ہو رہی ہیں ادب کی نئی قدریں خطرہ میں ہیں۔ ہمیں آگے بڑھ کر انکی حفاظت کرنا ہے اور اس طریقۂ فکر کو ختم کر دینا ہے جو دو سلطنتوں کی علیحدہ علیحدہ سیاسی خود مختاری نے پیدا کیا ہے اور جسے رجعت پسند طاقتیں پھیلانا چاہتی ہیں یہ طریقۂ فکر کہ سیاسی خود مختاری کی بنیاد پر ہر تہذیبی علیحدگی اختیار کر لی جائے اُن سب سچے رشتوں کو بھی توڑ دے گا جو تقسیم کے بعد بھی ایک دوسرے کو ملاتے ہیں۔ اگر ایسا ہوا تو ہم ایک دوسرے کے لئے بالکل اجنبی ہو جائینگے اور اس سے بڑی بدبختی اور کوئی نہیں ہو گی۔

ذکیہ سلطانہ
ساغر نظامی

ڈاکٹر تیج بہادر سپرو

آزاد ہند کے آسمان پر ہزاروں نئے ستارے جگمگائینگے لیکن زندگی کے افق سے کبھی یہ ستارہ طلوع نہ ہوگا جو مشترک تمدن کا ستارہ تھا متحدہ تہذیب کا ستارہ تھا اور متحدہ قومیت کے عرش کی قندیل تھا۔!

سر تیج بہادر سپرو کی مسلسل علالت بجائے خود ہندوستان کا مستقل نقصان تھی لیکن ان کی موت تو ایک ایسا نقصان ہے جس کی تلافی کوئی آنے والا زمانہ نہ کر سکے گا۔ ان کی ذات متحدہ قومیت، ملی جلی تہذیب اور ہندو مسلم اتحاد کا ایک آدرش تھی؛ وہ قدیم تہذیب و اخلاق اور جدید تمدن و تعلیم کا ایک شاندار مظہر تھے۔ ان کی ہستی قانون، سیاست ادب، صناعت اور علم و عمل کا ایک پاکیزہ امتزاج تھی، وہ ایک جامع الصفات شخصیت تھے اور ان کی سب سے نمایاں صفت اپنی یک رنگی پر ان کا یقین تھا ان کے دماغ و روح کے درمیان ایسی کوئی خلا موجود نہ تھی جہاں زندگی کے کسی مسئلے کے متعلق شک اور تذبذب نے اپنا آشیانہ بنایا ہو۔

روح سے لے کر دماغ تک اور مذہب سے لے کر سیاست تک وہ ایک بالغ نظر، آزاد خیال مفکر تھے۔ جن کے اندازِ فکر میں کبھی دینی، سیاسی یا کلچرل عصبیت کا شائبہ تک محسوس نہیں ہوا۔ مادی ترقی کی معراج پر پہنچنے کے بعد وہ تہذیبی رجعت کے دام میں نہیں پھنسے نہ ماضی کی کال کوٹھری سے دوچار رہے اور حال کے ساتھ بڑھتے گئے۔ بالآخر اس مرکز پر قائم ہو گئے کہ ہزاروں سال میں ہندو مسلمانوں کے روزانہ میل جول سے جو کلچر، زبان اور زندگی پیدا ہوئی ہے وہ زندگی ہندوستانی قومیت کا ایک پورا نظام اپنے اندر مکمل کر چکی ہے۔ یہی نظام ہماری موجودہ نسلوں کے لئے ایک آدرشی نظام ہے۔ یہی ایک آئیڈیل تہذیب ہے جسے ہم اختیار کر چکے ہیں اور جو خود ہم میں بس چکی ہے۔!؟

سر سپرو کی صحبت میں یقین ہوتا تھا کہ ہم ایسے ملک کے باشندے ہیں جہاں صرف ایک قوم بستی ہے۔ جہاں ہندو مسلمانوں میں کوئی دوری نہیں ہے۔ جہاں انسانیت کے سوا کسی دوسرے مذہب کی حکومت نہیں ہے۔

وہ مجسم آدرش تھے، ایک اچھے ہندو کا، ایک اچھے مسلمان کا، ایک اچھے ہندوستانی کا اور ایک اچھے انسان کا ——— !؟ حیف وہ اچھا انسان، اس وقت ہم سے جدا ہو گیا۔ جب ہم سب کو اس کی سخت ضرورت تھی۔

سپرو کی موت ہند کے دل میں ایک گہرا زخم ہے جو آسانی سے نہیں بھرے گا۔ یہ ایک ہی زخم ہوتا تو شاید بھر بھی جاتا لیکن یہ احساس کہ نئے بننے والے سماج میں شاید اب کوئی دوسرا سپرو پیدا نہیں ہو سکے گا۔ بجائے خود ایک زخم ہے اور پہلے زخم سے کہیں زیادہ گہرا ہے؛

ڈاکٹر تیج بہادر سپرو فارسی اور اردو کے ممتاز عالم تھے تاریخ اردو کی نشو و ترقی سے متعلق ان کی مخلصانہ کوششوں کو کبھی فراموش نہ کر سکے گی۔

ہندی اردو کے سلسلے میں انھوں نے پوری رواداری اور وسیع القلبی سے مسائل کو حل کرنے اور دوسروں سے حل کرانے کی کوشش کی۔ ان کی ادب نوازی، اور اردو شاعری سے ان کا خلقی ذوق اردو کے تمام، قدیم جدید، نوجوان اور سن رسیدہ ادیب و شعراء کو ان کی ذات سے وابستہ رکھتا تھا۔ اور وہ بھی صحیح طور پر ان کے قدر شناس تھے، باوجود اختلاف خیال کے وہ اس عہد کے انقلابی شعراء

ماہنامۂ ایشیا فروری ۱۹۴۹ء

سے بھی اتنی ہی گہری دوستی رکھتے اور ان کی قدر و منزلت کرتے تھے جس قدر کہ وہ لکھنؤ اسکول کے شعراء کی عزت کرتے تھے۔ .... ان کی سعادتی نفاست نے انہیں ہمیشہ زندگی کی بدذوقیوں اور سیاست کی پستیوں سے محفوظ رکھا۔

ڈاکٹر سر تیج بہادر سپرو ایک ممتاز کشمیری خاندان کے فرد تھے۔ ان کے جد امجد پنڈت رادھاکشن سپرو کشمیر میں ڈپٹی کلکٹری کے عہدہ پر فائز تھے اور کشمیر کے سرزمین میں ان کا شمار ہوتا تھا۔

وہ ۱۸۷۵ء میں پیدا ہوئے ۱۴ سال کی عمر میں متھرا سے انٹرنس پاس کیا اور آگرہ کالج میں داخل ہوئے جہاں سے انھوں نے بی۔ اے اور ایم۔ اے کی ڈگریاں خصوصیت و سابقت کے ساتھ حاصل کیں۔ ۱۹۰۲ء میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی اور اس طرح ان کی شاندار علمی زندگی اپنے نقطۂ عروج پر پہنچی۔

قانونی زندگی کی ترقی کے ساتھ ساتھ وہ ملک کی عام سماجی و سیاسی تحریکات میں نمایاں شہرت حاصل کرتے گئے ۱۹۰۶ء میں وہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے ممبر بنے ۱۹۱۳ء میں یو۔ پی کی لیجسلیٹو کونسل کے رکن نامزد کئے گئے اور ۱۹۱۶ء سے ۱۹۲۰ء تک وہ امپیریل لیجسلیٹو کونسل کے رکن رہے۔

۱۹۱۸ء میں وہ یو۔ پی کی لبرل لیگ کے صدر ہوئے ۱۹۲۰ء میں گورنمنٹ آف انڈیا میں قانون کے ممبر مقرر کئے گئے۔ ۱۹۲۳ء میں امپیریل کانفرنس کے رکن کی حیثیت میں ان کی صلاحیت و تدبر کو سراہا گیا۔

تیج بہادر سپرو لبرل عقیدہ رکھنے والے سیاست دانوں میں ایک نمایاں حیثیت کے مالک تھے۔ ظاہر ہے کہ وہ انتہا پسند اور کانگریسی نہیں تھے۔ لیکن کلچرل مسائل اور ایک متحدہ قومیت کے ترکیبی عناصر کے متعلق انتہا پسندوں سے زیادہ صاف مضبوط اور مثبت زاویۂ نگاہ رکھتے تھے بے شک وہ انقلابی نہیں تھے۔ لیکن وہ ایک صلح جو اور زبردست محب وطن ضرور تھے۔ خواہ اس حقیقت کو انقلابی ذہن تسلیم نہ کرے لیکن یہ ایک بین حقیقت ہے کہ بالآخر انتہا پسند قوم پرستوں کو بھی اپنی بلندیوں سے سیاست کی اسی سطح پر اتر کر غلامی کا سدباب کرنا پڑا جو معتدلین کی سطح تھی۔

بہرحال وطن کی تعمیر میں تیج بہادر سپرو کی تعمیری کوششوں کو قومی سیاست کی تاریخ میں ضرور جگہ دی جائے گی۔ ۱۹۳۰ء میں سپرو جیکر مشن نے حکومت اور کانگریس کے مابین ایک گول میز کانفرنس کے لئے سمجھوتہ کی بنیاد رکھی۔ اور ڈاکٹر سپرو نے ذمہ دار حکومت کے مطالبہ کو منوانے کے لئے متقابل قوتوں کو ایک نقطے پر متحد کرنے کی جان توڑ کوشش کی۔ یہ انہیں کی اخلاقی کشش اور قوت ارادی کا اعجاز تھا کہ اگست ۱۹۳۱ء میں ان کی دعوت پر مہاتما جی گول میز کانفرنس میں شریک ہوئے۔

۱۹۳۴ء میں وہ پریوی کونسلر مقرر ہوئے۔ ۱۹۴۳ء میں ۶ ہندوستانی لیڈروں نے کانگریسی رہنماؤں کے خلاف لگائے ہوئے الزامات کے خلاف ایک بیان دیا جس میں انگریزی حکومت سے آزاد تحقیقات اور غیر جانبدارانہ ثالث مقرر کرنے اور رہنماؤں کو رہا کرنے کا مطالبہ کیا۔ تاریکی اور مایوسی کے اس ہمت شکن عہد میں جن ۶ رہنماؤں نے ہندوستان کے سیاسی تعطل کو ختم کرانے کے لئے قدم اٹھایا ان رہنماؤں کے رہبر تیج بہادر سپرو ہی تھے!

سیاسی میدان میں ان کی آخری جھلک کیبنٹ مشن کی آمد کے موقع پر دکھائی دی، اس کے بعد ان پر فالج کا حملہ ہوا اور وہ مفلوج ہو کر رہ گئے۔

پیغامات میں ان کا آخری خط پڑھ کر دل خون کے آنسو روتا ہے۔ عین اس وقت جب گہری تاریکی میں اس چراغ کی ضرورت تھی موت کے بے رحم جھونکوں نے اسے بجھا دیا۔ لیکن جوت ہمیشہ باقی رہے گی۔ ان کی زندگی ایک آدرش تھی ایک نمونہ تھی۔ جو ابد تک ہندوستانیت اور انسانیت کی جوت جگاتی رہے گی۔'

ادارہ

پیغامات

آنریبل مسٹر بی جی کھیر وزیرِ اعظم بمبئی

کیمپ جے پور
۱۹ دسمبر ۱۹۴۸ء

ہندوستان کی ذہنی اور کلچرل ترقی کے لئے ہمارے ذہین طبقہ کی لگاتار بے غرض کوشش بہت ضروری ہے، گذشتہ دور میں جب کہ ہم غیر ملکی اقتدار سے نجات حاصل کرنے کے لئے معروف پیکار تھے قوم کی تمام کوشش اور توانائی سیاسی سرگرمی کی خاطر وقف تھی، حتیٰ کہ ہماری کلچرل سرگرمیوں میں سیاسی تنگ نظری کارفرما رہی، اس لئے کہ ہم ایسی کسی چیز کو قبول کرنے پر آمادہ نہ تھے جو ہمارے سیاسی مشن کی کامیابی میں براہِ راست ممد نہ تھی، اب چونکہ سیاسی کشیدگی آزادی کی زیادہ خوش گوار اور کھلی فضا میں ختم ہو چکی ہے، ذہنی اور کلچرل سرگرمیوں میں ترقی کا بہت امکان ہے۔ ہمارے مستقبل کے لئے یہ ابتدا مبارک ہے کہ کلچرل نشاۃ الثانیہ کا مقصد پیش نظر رکھ کر بعض ادارے ہماری آزادی کے اوائل ہی سے بڑے صبر آزما کام کے منصوبوں کو لے کر پیش قدمی کر رہے ہیں۔ ادبی مرکز کا ایشیا بھی اسی قسم کی ایک کوشش ہے۔ میں اس کا خیر مقدم کرتا ہوں، بالخصوص اس لئے کہ اردو ہندی اور انگریزی کے توسط سے کام لیا جائے گا اور اس طرح ہمارے تمدن میں تین گراں قدر دھارے سموئے جائیں گے۔ میں اس کی کامیابی کی آرزو کرتا ہوں،

(بی۔ جی۔ کھیر)

مادام صوفیہ واڈیا۔ بانی انڈین پی۔ای۔این

۲۰ دسمبر ۱۹۴۸ء

عزیز دوست!

آپ کے ۵ تاریخ کے خط کا شکریہ۔ خط سے زیادہ خوشی تو یوں ہوئی کہ میں خود آپ کے مسکن کا پتہ چلانے کی کوشش کر رہی تھی۔ پچھلی مرتبہ جب سے میں نے آپ کا کلام سنا ہے۔ تب سے کافی مدت گزر چکی ہے۔

مجھے پنج ادبی مرکز اور "ایشیا" کی نئی زندگی کا حال سن کر بہت خوشی ہوئی۔ ایشیا نے پچھلے چند سالوں تک ہندوستان کی کلچرل اور ذہنی زندگی میں اپنا حق ادا کیا ہے اور آزاد ہندوستان میں ادبی مرکز اور ایشیا کے تازہ علمی و ادبی اضافہ کی حیثیت ایک اثاثہ کی ہوگی۔ میں اپنی نہایت مخلصانہ اور نیک آرزوئیں ان دونوں اداروں کے لئے بھیج رہی ہوں کہ یہ قائم و جاری رہیں۔

آپ کی مخلص
صوفیہ واڈیا

محترمہ عصمت چغتائی بی۔اے

بہن ذکیہ۔

یہ سن کر کہ "ایشیا" پھر سے جاری ہو رہا ہے۔ مسرت ہوئی۔ اُمید ہے کہ اس کی صورت دیکھ کر بے اختیار کچھ لکھ دینے کو جی چاہے گا۔ نیز اُمید ہے کہ "ایشیا" بجائے گنتی کے پرانے علم و ادب کے سہاروں کے نئے لکھنے والوں کی رہنمائی اور ہمت افزائی کرے گا۔ زندگی نے جو یہ تازہ کروٹ لی ہے اس نے نہ جانے کتنے حساس لوں کو چونکا دیا ہوگا۔

خاکسار عصمت

ہز ایکسیلنسی کنور سر مہاراج سنگھ گورنر آف بمبئی

گورنر ہاؤس بمبئی
۲۲/۲۳ دسمبر ۱۹۴۸ء

ڈیر مسٹر نظامی!

ہز ایکسیلنسی نے خواہش کی ہے کہ میں آپ کے ۰ از تاریخ کے خط کا شکریہ ادا کروں۔ اور ذیل کا پیغام بھیجوں۔

"یہ ضرورت مسلمہ بن چکی ہے اور اب اس پر زیادہ زور نہیں دیا جا سکتا کہ ہم اپنے پرانے کلچر کے ورثہ کو محفوظ رکھیں اور اسے مالا مال کریں۔ آج دنیا کو جسے مادیت سے نقصان پہنچا ہے، کلچر کے سہارے کی ضرورت ہے تاکہ وہ سربلند ہو سکے۔ میں "ایشیا" کی پوری پوری کامیابی کی آرزو کرتا ہوں۔ کیوں کہ میرے خیال میں یہ وہ جریدہ ہے جو اس نصب العین اور کلچرل اتحاد کے حصول کے لئے وقف ہے۔"

(ایل - ایم - ناڈکرنی)

سر تیج بہادر سپرو بار ایٹ لا

۱۹ ر البرٹ روڈ الہ آباد
مورخہ ۱۸ دسمبر ۱۹۴۸ء

جناب بندہ۔ تسلیم و نیاز

میں تو ڈھائی سال سے مرض فالج میں مبتلا ہوں۔ ایک قدم بھی نہیں چل سکتا نہ کچھ کام ہاتھ سے کر سکتا ہوں۔ میں نے اپنے سیکریٹری سے کہہ دیا ہے وہ خط آپ کو میری جانب سے لکھ دیں گے۔

میں آپ کے رسالہ کی کامیابی دل و جان سے چاہتا ہوں۔ مگر میں خود کوئی کتاب یا اخبار نہیں پڑھ سکتا کیوں کہ اخبار یا کتاب اپنے ہاتھ میں پکڑنا میرے لئے غیر ممکن ہے۔ زیادہ نیاز

بندہ

تیج بہادر سپرو بقلم نوبت لعل سری واستوا سیکریٹری

ڈاکٹر سچدانند سنہا بار ایٹ لا
اولین صدر دستور ساز اسمبلی ہند

سنہا لائبریری روڈ۔ پوسٹ بکس نمبر ۶۲ جی پی او۔ پٹنہ
۱۵ دسمبر ۱۹۴۸ء

میرے پیارے نظامی صاحب

آپ کا گیارہ دسمبر کا خط انگریزی اور اردو دونوں میں مجھے ابھی ملا۔ میں نے اسے اور ماہنامہ کے مقاصد بڑی دلچسپی سے پڑھا اور میں اس کی

مسز کرشنا ہاتھی سنگھ

"ایشیا" کے لئے میری بہترین آرزوئیں قبول کیجئے۔

کرشنا ہاتھی سنگھ

شاعر انقلاب حضرت جوش ملیح آبادی

میرے واسطے خصوصیت کے ساتھ یہ ایک بہت بڑی خوش خبری ہے کہ حضرت ساغر (جنھیں میں ہرگز "نظامی" نہیں کہوں گا) "ایشیا" کو دوبارہ جاری، اور ایک دار الاشاعت کو قائم کر رہے ہیں۔

ساغر صاحب اس درجہ مشہور، اور اسی کے دوش بدوش اس قدر مقبول و محبوب شاعر ہیں کہ انھیں میرے یا کسی کے تعارف کی احتیاج نہیں لیکن اُن کی اس خاص صفت سے شاید لوگ زیادہ واقف نہیں کہ وہ ایک نہایت ضابطہ پسند، خوش سلیقہ اور بیدار مغز انسان بھی ہیں۔ اور اسی کے ساتھ ساتھ جن حضرات نے اُن کے مجموعۂ کلام "بادۂ مشرق" کا مطالعہ کیا ہوگا۔ وہ میرے اس دعوے کی تصدیق کریں گے کہ جہاں تک کتابوں کی طباعت و اشاعت، اور اُن کی زیبائش و آرائش کا تعلق ہے، ہندوستان کا کوئی صاحب مطبع اور کوئی ناشر اُن کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ "مار گزیدہ" اور "سگ گزیدہ" کے ساتھ ساتھ اس بدبخت ملک میں ادیبوں اور شاعروں کا ایک مظلوم طبقہ ہے۔ جسے "ناشر گزیدہ" کا خطاب دیا جا سکتا ہے۔ میں اِن مظلوم ناشر گزیدگانِ ہند کو مژدہ ..... سناتا ہوں کہ ادبی مرکز بمبئی میں ساغر صاحب کی زیر نگرانی "ہند پبلشرز" کے نام سے ایک دار الاشاعت قائم ہوا ہے۔ جس میں اُن کے تمام حقوق محفوظ رہیں گے۔ اور اُن کی دماغی پیداوار کی فراخ دلی و دیانت داری کے ساتھ داد دی اور قدر افزائی کی جائے گی وہ اسے اپنا ہی دار الاشاعت سمجھیں۔ اور اس سے مستقلاً وابستہ ہو جائیں۔

ساغر صاحب کی طرح "ایشیا" کے باب میں بھی کسی تعارف کی ضرورت نہیں یہ "ایشیا" میرٹھ سے جس آب و تاب کے ساتھ نکل چکا ہے، وہ سب کو معلوم ہے اور اسی پر قیاس کر کے سمجھ لینا چاہئے کہ وہ شائع ہوتے ہی تمام جرائد پر چھا جائے گا۔

جوش

کامیابی کی آرزو کرتا ہوں۔

میں بہت ممنون ہوں گا اگر آپ مجھے زحمت کر کے مختلف انگریزی اردو اور ہندی کی مطبوعات کی ایک فہرست بھیجیں۔ تاکہ میں اس کے بارے میں اپنی رائے قائم کر سکوں۔

میں آپ کے منصوبہ کی کامیابی کی آرزو کرتا ہوں۔

آپ کا مخلص

ایس۔ سنہا

مسٹر میکر بہاس میئر آف بمبئی

از بمبئی

۲ دسمبر ۱۹۴۸ء

ڈیر مسٹر ساغر نظامی

آپ کا ۱۱ تاریخ کا خط ملا۔ مجھے یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ آپ جنوری ۱۹۴۹ء سے ادبی مرکز کے تحت ماہنامہ "ایشیا" کی اشاعت کا ارادہ کر رہے ہیں۔ ملک کے بدلے ہوئے حالات میں "ایشیا" کا مستقبل شاندار رہے گا۔ اس لئے کہ ہم اتحاد و ترقی اور کلچرل شائستگی جیسے نصب العین کے حصول کے بڑے متوقع ہیں۔ میں ماہنامہ کی پوری پوری کامیابی کی آرزو کرتا ہوں۔

آپ کا مخلص

میکر بہاس

میئر

مسٹر یوسف مہرعلی سوشلسٹ لیڈر

فاربیٹ اسٹریٹ بمبئی ۲۶

۲۶ دسمبر ۱۹۴۸ء

ڈیر ساغر نظامی صاحب

آپ کا خط ملا۔ اور مجھے یہ معلوم کر کے بڑی خوشی ہوئی کہ آپ "ایشیا" کو دوبارہ زندہ کر رہے ہیں۔ اس کوشش کے لئے بہت لوگ آپ کے ممنون ہوں گے کیوں کہ یہ بہت ہی اہم ہے کہ اردو اور ہندی کا پڑھنے والے دنیا کے سب سے بڑے برِاعظم کی زبردست بیداری سے واقف ہوں۔ ایشیا کی آبادی نصف دنیا کی آبادی کے برابر ہے

پروفیسر نجیب اشرف ندوی ایم۔ اے

آپ کے "ایشیا" اور ہمارے برِاعظم ایشیا کا حال یکساں رہا ہے، شاید یہ نام کی برکت یا اثر ہے، دوسری جنگ عظیم کے بعد ایشیا کی زندگی کا نیا دور شروع ہو رہا ہے اور اس مرتبہ مجھے یقین کامل ہے کہ وہ نہ صرف یورپ بلکہ ساری دنیا کی رہنمائی کرے گا۔ ان خوش گوار حالات میں آپ کے "ایشیا" کا بھی ایک نئی زندگی کے ساتھ منصۂ شہود پر جلوہ گر ہونے کا مژدہ خوش گوار تعلقات کی دنیا سامنے لا دیتا ہے، خدا کرے میرے یہ خواب شرمندۂ تعبیر ہوں۔ اس مرتبہ آپ نے جس جوش و انہماک سے اپنے کو اس کام کے لئے وقف کر رکھا ہے۔ کامیابی کی بڑی حد تک ضمانت ہے۔ اس لئے کہ ساغر جب ہی کارآمد ہے اور اس وقت تک کارآمد ہے جب تک کہ وہ گردش میں ہو۔

آپ کا

نجیب اشرف ندوی

ملک راج آنند

ڈیر ساغر صاحب

یہ پیغام آپ کے ماہنامہ کی عظیم ترین کامیابی کی آرزو کا حامل ہے۔ ہمارے ملک میں ماضی اور عصر حاضر دونوں کے ادبی اور کلچرل کاموں کے جائزے سے احساس کی قدریں پیدا کرنے کی سخت ضرورت ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر ہم بلند ترین آزمائشوں میں مسلسل ... تو ہم نے اپنی نشاۃ الثانیہ میں حاصل کیا ہے۔ اس توقف کے معیار سے بلند نہ ہوں گے۔ جتنے کہ دوسری جگہ حاصل کئے جا چکے ہیں۔ میں یقین کرتا ہوں کہ آپ کی رہنمائی میں بہترین تخلیقی اور تنقیدی تحریریں اس رسالہ میں شائع ہوں گی۔

آپ کا مخلص

ملک راج آنند

اور اس میں اتنے قدرتی وسائل و ذخائر ہیں کہ خواب و خیال میں بھی نہیں آسکتے ہیں۔ اس کے مختلف ملکوں میں سیاسی اور کلچرل بیداری کا ایک طوفان برپا ہے اور ہندوستان کو اس طوفان میں اپنا فرض انجام دینا ہے۔ میری یہ آرزو ہے کہ آپ کا ایشیا مظلوموں و محنت کشوں کی جد و جہد اور اُن کی اُمیدوں اور خوابوں کا ترجمان بنے۔

آپ کا مخلص

یوسف مہر علی

مسٹر ایس کے پاٹل ممبر آل انڈیا کانگریس کمیٹی

کانگریس ہاؤس بمبئی ۴

۳ر جنوری ۱۹۴۹ء

عزیز دوست!

مجھے آپ کا پچھلے ماہ کی ۲۹ تاریخ کا خط مل چکا ہے۔ حسب خواہش ایشیا کے لئے مختصر سا پیغام حاضر ہے

"ہندوستان کی آزادی حاصل ہو جانے کے بعد اوسط ہندوستانی کا نقطۂ نظر بدل جانا چاہیئے اور یہ اس لئے کہ ہماری مشکل سے حاصل کی ہوئی آزادی مستحکم ہو۔ ہر اخبار کی یہ کوشش ہونی چاہیئے کہ وہ اس سلسلے میں ہماری حکومت کی مدد کرے اور مجھے بھروسہ ہے کہ ایشیا بھی فرقہ وارانہ اتحاد، کلچرل بھائی چارہ، ذہنی ترقی اور قومی حکومت کے استحکام کے حق میں اپنا جائز حق ادا کرے گا اپنے ماہنامہ کی کامیابی کے لئے میری بہترین آرزوئیں قبول کیجئے۔

آپ کا مخلص

ایس۔ کے۔ پاٹل

مسٹر اے۔ اے فیضی (رکن پبلک سروس کمیشن حکومت بمبئی)

"ایشیا ایک مدت تک سوتے رہنے کے بعد پھر سے بیدار ہو رہا ہے۔ جس کی بڑی خوشی ہے۔ ہندوستان کی موجودہ ذہنی پسماندگی کے دور میں ایسے رسائل کی بہت ضرورت ہے جو ہمارے ملک کے عوام کی اور خصوصاً مسلمانوں کی صحیح طریقہ پر رہنمائی کریں اور اُنھیں فرقہ وارانہ ذہنیت کے ادبار سے نکال کر عقل و اتحاد کا راستہ دکھلائیں۔ خدا کرے ایشیا کو اپنے مقاصد میں کامیابی

کرشن چندر (رکن ادارۂ نیا ادب بمبئی) —

۲ر جنوری ۴۹ء

پیارے بھائی ساغر

اس کی مجھے بے حد خوشی ہے کہ ایشیا دوبارہ شائع ہو رہا ہے، اور آپ کی ادارت میں۔ اب آپ اسے آپ واقعی ایشیائی ادب کا ترجمان بنائیے۔ اس وقت پورے ایشیا میں عوام انقلاب کا دروازہ کھٹکھٹا رہے ہیں، اس وقت اگر ہم ادیب لوگ سوئے رہے تو کوئی ہمیں اٹھائے گا نہیں۔ عوام سوئے ہوؤں کو پاؤں تلے روند کر آگے بڑھ جائینگے مجھے اُمید ہے کہ ایشیا بڑھتی ہوئی زندگی کا ساتھ دے گا۔ لاشوں کے ادب سے اس کا کوئی واسطہ نہ ہوگا۔

کرشن چندر

خواجہ احمد عباس (رکن ادارۂ نیا ادب بمبئی)

جس طرح دنیا کے اُفق پر ایشیا کا روشن ستارہ اُبھر رہا ہے اُسی طرح یقین ہے۔ ساغر صاحب کا "ایشیا" بھی آسمانِ صحافت پر چمکے گا۔

"ایشیا" کو دنیا کی ترقی پسند قوتوں کے ساتھ چلنا ہے۔ اور تمام ترقی پسندوں کو "ایشیا کا ساتھ دینا ہے۔

احمد عباس

سیّد ممتاز حسین ایم۔ اے

ساغر نظامی صاحب نے ایک بار پھر ایشیا کی روح کو بیدار کرنے کی کوشش کی ہے۔ ایشیا جس آب و تاب اور نئے پیغام کے ساتھ میرٹھ کی پُر آشوب سرزمین سے نکالا گیا تھا وہی ایشیا آج پھر بمبئی سے نکالا جا رہا ہے۔ ساغر صاحب ایشیا کے ساتھ لازم و ملزوم ہیں اس دفعہ آپ ایشیا میں ایک نئی تبدیلی پائیں گے۔ اور یہ تبدیلی ایشیا کی زندگی کی تبدیلی کا نتیجہ ہے۔ آج پورا ایشیا اپنی آزادی کی آخری جنگ لڑ رہا ہے ہمارے ادیب اس کی روح کو ایک نئے پیغام حیات کے ساتھ مزین کر رہے ہیں۔ وہ پیغام زندگی کو لبیک کہنے اور تمام رجعت پسند طاقتوں کے خلاف جنگ کرنے کا پیغام ہے۔ میرا خیال ہے کہ ایشیا کا نیا پرچہ نہ صرف

حاصل ہو، اور موجودہ دورِ تاریکی میں ایک درخشاں ستارہ بن کر قوم و ملک کی رہبری کرے۔

آصف نعیمی

نواب محمد اسمٰعیل خاں صاحب ممبر کانسٹی ٹیوٹ اسمبلی بمبئی

مجھے یہ معلوم ہو کر بڑی مسرت ہوئی کہ میرے نوجوان دوست ساغر نظامی صاحب نے ماہانہ ایشیا کو دوبارہ جاری کرنے کا انتظام مکمل کر لیا ہے۔ ماہنامۂ ایشیا ایک بلند پایہ ادبی رسالہ رہا ہے جس سے معلومات میں اضافہ ہوتا رہا اور اس ماہانہ رسالہ کے متعلق یہ کہنا بھی ہرگز بے جا نہ ہوگا کہ یہ اردو ادب کا ایک معیاری رسالہ تھا۔ اربابِ ذوق اس کے بند ہو جانے پر ایک خاص کمی محسوس کر رہے تھے، ساغر نظامی صاحب مستحق مبارکباد ہیں کہ انھوں نے اپنی انتھک کوششوں سے اس کمی کو پورا کر دیا۔

میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ماہانہ ایشیا کو خاطر خواہ طور پر کامیاب کرے۔ اور یہ رسالہ ادبی دنیا کے لئے مفید معلومات اور ادبی ذوق میں اضافہ کا باعث ہو۔

محمد اسمٰعیل خاں
ممبر کانسٹی ٹیوشنٹ اسمبلی ہند
۲۰ر دسمبر ۴۸ء

آنریبل نثار احمد خاں شروانی وزیر زراعت یوپی

۱۲ر دسمبر ۱۹۴۸ء

ماہنامۂ ''ایشیا'' ایک عرصہ کے بعد پھر وجود میں آ رہا ہے یہ موقر جریدہ ساغر صاحب نظامی کی زیر نگرانی سرِ نو سے ماہ بماہ شائع ہو کر اعلیٰ ادب پیش کرتا تھا۔

میں ساغر صاحب سے ایک عرصہ سے واقف ہوں۔ کم عمری میں اُن کو شاعری کا شوق ہوا اور بہت جلد اپنے آپ کو اس نوجوان نے اپنا دنیا میں روشناس کرا لیا۔ آج ہندوستان کا ہر ادب نواز شخص اُن سے واقف ہے ان کی سیاسی نظمیں جو ان کے قوم پرورانہ جذبات کی آئینہ دار ہوتی ہیں۔ ملک کے طول و عرض میں خراجِ تحسین

انحطاط پسند طاقتوں کے خلاف جلال و جبروت کا مظہر ہوگا بلکہ نئی زندگی کی جمالی قدروں کا معمار بھی ہوگا

ممتاز حسین

راجندر سنگھ بیدی بی۔ اے

فیمس پکچرز لمیٹڈ۔ کیڈل روڈ
بمبئی

محترمی ساغر صاحب تسلیم

''ایشیا'' کی تجدید کی متعلق سنا۔ بیحد خوشی ہوئی۔ زبان کے مسئلہ میں جتنا جھگڑا ہے، اس کا سب سے بڑا حل یہی ہے کہ مروجہ زبان زیادہ سے زیادہ بولی جائے۔ اور نشر کی جائے۔

مجھے یقین ہے کہ ''ایشیا'' ایسا ماہنامہ اردو کے مستقبل کی بابت ہمارے سب شکوک رفع کرے گا۔ میں حتی الوسع ہر قسم کے تعاون کا یقین دلاتا ہوں۔

نیاز مند
راجندر سنگھ بیدی
۵ر جنوری ۱۹۴۹ء

رامانند ساگر بی۔ اے

''ایشیا'' کے دوبارہ اجرا پر میری طرف سے مبارکباد قبول فرمایئے۔

خدا کرے کہ ''ایشیا'' موجودہ دور میں ایشیا کی آزادی کا علمبردار ثابت ہو۔ اور مستقبل میں اس کا محافظ۔

رامانند ساگر

سید شہاب الدین دسنوی

آزادیٔ ہند کے بعد بھی ''ایشیا'' میں حرکت پیدا نہ ہوتی تو تعجب ہوتا۔ اب ''ایشیا'' کے سامنے نئے زاویئے اور نئے میدان ہیں۔ بادۂ اردو کے متوالے ''ساغر'' کی طرف آنکھ لگائے ہیں۔ ادبیات کے ایسے بچوڑ کی ضرورت ہے جو ہماری اخلاقی اور سماجی زندگی کے معیار

وصول کر چکی ہیں۔

ساغر صاحب ایک خوش الحان خوش گو شاعر کے علاوہ مشہور ادیب بھی ہیں۔ ان کی بیشتر تصانیف نے ہندوستان کے نوجوانوں کے دلوں میں آزادی کی ایک نئی روح پھونک دی۔

آج جب کہ ہندوستان آزاد ہے ہم لوگوں کو سب سے زیادہ ضرورت اس بات کی ہے کہ ملک کے سامنے ایک ایسا ترقی پسند صحت مند ادب پیش کیا جائے، جو عوام میں اتحاد۔ ترقی۔ یگانگت و تعمیر کی روح پیدا کرے۔

مجھے آسی ہے کہ "ایشیا" ساغر صاحب کی زیر نگرانی و ادارت ایسا ادب پیش کرے گا۔ ادبی دنیا میں یقیناً اس ماہنامہ کا خیر مقدم کیا جائے گا۔

میری دعا ہے کہ ساغر صاحب اپنے مقاصد میں کامیاب ہوں

نثار احمد شیروانی

پنڈت سندر لال جی (الہ آباد)

پیارے بھائی ساغر صاحب

آپ کا ۱۱ر دسمبر کا خط مجھے اب ملا۔ آپ اپنے ماہنامہ "ایشیا" کو پھر سے نکالنے جا رہے ہیں۔ مبارک!

میری دلی خواہش ہے کہ آپ اس ماہنامہ کے ذریعہ سب مذہب کے لوگوں، خاص کر اس ملک کے ہندو اور مسلمانوں کے دل ایک دوسرے کے زیادہ نزدیک لے آویں، فرقہ پرستی بلکہ فرقہ وارانہ نقطۂ نگاہ سے اوپر اٹھے، ہم سب کے قدم ایک مشترکہ قومیت، مشترکہ کلچر اور مشترکہ سماجی زندگی کی طرف تیزی کے ساتھ بڑھیں

میری یہ بھی خواہش ہے اور درخواست ہے کہ "ایشیا" کی زبان آسان بول چال کی اور ہندوستانی ہو۔ مثال کے طور پر ہندوستانی میں وکیل کی جمع وکلا نہیں، وکیل یا وکیلوں ہونی چاہئے۔ ایسے ہی مقصد کی جمع مقاصد نہیں مقصد یا مقصدوں۔ اردو کو بھی اگر اس ملک میں زندہ رہنا ہے تو یہی شکل اختیار کرنی ہوگی یعنی ہندوستانی بننا ہوگا ہندی اور اردو کی الگ الگ جانبداریوں سے ہٹ کر ایک ملی جلی پیاری قومی زبان کو روپ دینا اور بڑھانا ہی ہوگا۔

آپ کا بھائی

سندر لال

کو بدل سکے، بیمار دل و دماغ کی اصلاح کر سکے اور مرجھائی ہوئی روح میں بالیدگی پیدا کر سکے۔

مجھے امید ہے کہ "ایشیا" یہ خدمت انجام دے سکے گا

سید شہاب الدین دسنوی

بمبئی

۶ر جنوری ۱۹۴۹ء

اختر الایمان

رکن ادارۂ ماہنامۂ "خیال" بمبئی

"ایشیا" ان پرچوں میں سے ہے۔ جن پر اردو کے ماہناموں کو ناز ہے۔ ساغر صاحب سمجھ رہے ہیں کہ وہ پرچہ نکال رہے ہیں میں سمجھ رہا ہوں کہ یعنی آگے چلیں گے۔ دم لے کر والی بات ہے۔

ایشیا نے پہلے بھی اردو کی خدمت کی ہے آج بھی اس کی وہی نیت ہے۔ معیار کے بارے میں کچھ کہنا لا حاصل ہے۔

اختر الایمان

۷ر جنوری ۱۹۴۹ء

قاضی بدر الحسن بدر جلالی بی۔ اے

(علیگ)

برادر عزیز حضرت ساغر نظامی نے یہ خبر خوش عنایت فرمائی ہے کہ رسالہ ایشیا اپنے نئے جنم دن میں پھر زیب نظر و فکر ہونے والا ہے۔ اگرچہ انتظار کی گھڑیاں ابھی ختم نہیں ہوئی ہیں اور آنکھیں دیدار کے لئے مضطرب ہیں۔ پھر بھی خبر نیک سے جو مسرت قلبی ہوئی ہے۔ وہی اپنے عزیز بھائی کی نذر کرتا ہوں۔ ع

بریں مژدہ گر جاں فشانم رواست

ہم ہندیوں کی تمنائے سیاست کا ایک رگ روشن اور دلفریب پہلو اتحاد ایشیا کے حسین خوابوں کی واقعی تعبیر میں پنہاں ہے، اس لئے حضرت ساغر کے "ایشیا" کی نشاۃ ثانیہ ان آرزوؤں کی تکمیل کا ایک عنوان معلوم ہوتا ہے جو اتحاد ایشیا کی آفرینش سے وابستہ ہیں۔ ایشیا یقیناً ہمارے ذوق ادب کی ایک رنگین پناہ گاہ ثابت ہوگا اور ہمیں دستگیر

قیادت کا سبق دے گا۔

"ایں دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد"

بدر جلالی

قاضی عبدالغفار مراد آبادی

ہماری بزم ادب میں "ایشیا" ایک ہمدم دیرینہ ہے جو پھر اس بزم میں واپس آرہا ہے اور ایسے وقت واپس آرہا ہے جبکہ اس کی بہت ضرورت تھی۔ تقسیم ہند نے وہ سب کچھ تقسیم کر ڈالا جو ہمیں عزیز تھا۔ ہماری شورہ پشت سیاست نے ۔ صرف ملک کو ، خاندانوں کو اور دلوں کو..... تقسیم کر دیا بلکہ میں تو کہتا ہوں کہ ہندوستان کی انسانیت کو تقسیم کر ڈالا! اور ہماری بدبختی پر ایک ایسی مہر لگا دی جو سند ہے ہماری سیاست کی رسوائی پر!! اس بدبخت تقسیم نے ہماری ادبی محفلوں کو بھی اس قدر برہم کر دیا کہ اب "داماں باغباں و کف گلفروش" کی کوئی پرچھائیں بھی کہیں نظر نہیں آتی۔ اس محفل کو پھر از سر نو سنوارنا ہے اور اس ویرانے کو پھر آباد کرنا ہے۔ جس گوشہ میں بھی کوئی چراغ تہ داماں باقی ہو اُسے جلد سے جلد منظر عام پر آجانا چاہئے غلط سیاست ملکوں اور قوموں کو تو تباہ کر سکتی ہے لیکن دلوں اور دماغوں کے آتش خانوں کو سرد نہیں کر سکتی۔

اردو ادب کے تمام حامیوں اور خادموں کی بہترین تمنائیں حضرت ساغر کے ساتھ ہیں۔ میرا پیام صرف اتنا ہی ہے۔ جو اقبال کے ایک مصرعہ میں سما جاتا ہے سہ

گلشن بہ گریباں کش اے بو بہ گلاب اندر!

محمد عبدالغفار

لکھنؤ   ۱۴ر جنوری سنہ ۱۹۴۹ء

ڈاکٹر دوست محمد خاں

اگر آپ اب بھی میدان میں نہ آتے تو تاریخ آپ کے ادبی گناہ کو کبھی معاف نہ کرتی۔ میں دل و جان سے "ایشیا" کا خیر مقدم کرتا ہوں۔ اور اس کی کامیابی کی ہر ممکن کوشش کروں گا۔

دوست محمد

شیخ محمد عبداللہ وزیر اعظم حکومت جموں و کشمیر

محترمی ساغر صاحب

تسلیم۔ آپ کے دونوں خطوط ملے ، یاد آوری کا بہت بہت شکریہ۔ یہ آپ نے جس کام کا بیڑا اٹھایا ہے۔ موجودہ حالات میں وہ بہت ہی اہم ہے ہندوستان کے باشندوں میں صحیح ذہنی شعور پیدا کرنا وقت کا سب سے اہم تقاضا ہے۔ جسمانی غلامی سے ذہنی غلامی زیادہ مہلک ہوا کرتی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ہندوستان نے سال ہا سال کی انتھک کوششوں اور قربانیوں کے بعد جسمانی غلامی سے آزادی تو حاصل کر لی ہے۔ لیکن انگریز کی سامراجی طاقت نے ہندوستان کو نہ صرف جسمانی طور پر غلام بنایا تھا بلکہ ہندوستانیوں کے ذہن کو بھی غلامی کے سانچے میں ڈھال دیا تھا۔ اور جب تک ہندوستانیوں کے سوچنے سمجھنے کے طریقے وہی رہیں گے۔ جو کہ ڈیڑھ سو سال کے عرصہ میں انگریز نے ان کو سکھلائے تھے تب تک یہ خیال کہ ہمارا دیش سامراجی غلامی سے آزاد ہو گیا ہے بہت بڑا دھوکا ہے۔ ہندوستانیوں کو یہ امر پورے طور پر ذہن نشین کر لینا چاہئے کہ جن کمزوریوں کی وجہ سے ہندوستان انگریزی سامراج کے چنگل میں پھنسا تھا اور جن کی وجہ سے ہندوستان کے دو ٹکڑے ہو گئے۔ جب تک وہ کمزوریاں موجود رہیں گی ہندوستان کی آزادی ہر وقت خطرے میں ہے۔ اس لئے وقت آگیا ہے کہ ہندوستان کے ادیب اس اہم فریضہ کی طرف اپنی ساری توجہ مرکوز کریں۔ کیونکہ ذہنی طور پر آزاد کرانا ایک ادیب ہی کا کام ہے آپ نے اس فرض کو انجام دینے میں جو ابتدا کی ہے میں اس کے لئے آپ کو تہ دل سے مبارکباد دیتا ہوں۔ اور آپ کی کامیابی کے لئے دعا کرتا ہوں۔

آپ کا مخلص

شیخ محمد عبداللہ۔

حسین شہید سہروردی

میں آپ کو مبارکباد دیتا ہوں کہ اردو ماہنامہ "ایشیا" کو اس مقصد سے زندہ کر رہے ہیں کہ اس سے بنی نوع انسان کی خدمت ہو سکے اور ہماری پُر آشوب زندگی کی گتھیاں سلجھ سکیں۔ لوگوں میں آپس کے اشتراک ، بھائی چارہ اور رواداری کو ترقی دینا۔ ایک دوسرے کا لحاظ و احترام کرنا اور اس بات کو ترقی دینا کہ لوگ ایک دوسرے کو اچھی طرح سمجھ سکیں آج یہ چیزیں ایسی ہیں جن کے لئے کام کرنے کی ضرورت ہے اور میں آپ کی کوششوں میں ہر طرح کی کامیابی کی آرزو کرتا ہوں

آپ کا مخلص

شہید سہروردی

آنریبل ڈاکٹر سمپورنانند وزیر تعلیم و محنت

حکومت یو۔ پی

لکھنؤ ۲۲ جنوری ۱۹۴۹ء

یہ ضروری ہے کہ ہندوستان کے کلچرل اتحاد پر وہ لوگ زور دیں جن کی رائے اس موضوع پر مستند ہے۔ ہمارا کلچرل ورثہ بہت شاندار ہے جس میں بیسیوں سوتے مختلف منبعوں سے نکل کر اس میں سموئے گئے ہیں اور جن سے وہ ورثہ سرسبز و نہال ہوا ہے۔ لیکن اب صورت یہ ہے کہ اس نے ایک مستحکم دھارے کی شکل اختیار کر لی ہے جس کے حیات بخش فرائض صرف ہندوستان تک ہی محدود نہیں ہیں، میری آرزو ہے کہ "ایشیا" کو اپنی کوششوں میں کامیابی حاصل ہو۔

سمپورنانند

مولانا حفظ الرحمٰن

ماہنامہ ایشیا ہندوستان ممتاز اور مؤقر جرائد میں ترقیع ماہنامہ ہے۔

عمدہ اور مفید ترین مضامین کی اشاعت، بہترین ترتیب اور طباعت کے اعتبار سے اس ماہنامہ کو اردو کے اخبارات میں نمایاں جگہ حاصل ہے۔

میں نے ایشیا کے بعض پرچے جستہ جستہ دیکھے ہیں اس میں شک نہیں کہ ایشیا نے اپنی زندگی میں جو بلند پایہ علمی، اخلاقی اور ادبی خدمات انجام دی ہیں وہ ہمیشہ علم و ادب کی دنیا میں قدر کی نگاہ سے دیکھی جائیں گی۔

میری آرزو ہے کہ ملک کے علمی حلقے ایشیا کی قدر پہچانیں اور اسے ماضی سے زیادہ مستقبل کی کامیابیاں نصیب ہوں۔

خادم ملک و ملت

محمد حفظ الرحمٰن

۸ جنوری ۱۹۴۹ء

مخمور جالندھری

ساغر بھائی

آداب عرض۔ ایشیا کا نیا جنم مبارک! یہ جان کر خوشی ہوئی کہ ایشیا کو اب مضبوط بنیادوں پر کھڑا کیا جا رہا ہے اور آپ نے ایشیا کی جس پالیسی کا خط میں اظہار کیا ہے امید کہ آپ اسے برقرار رکھنے کی انتہائی کوشش کریں گے۔

آپکا

مخمور جالندھری

ادیب لکھنوی بی۔ اے

بلدری (ضلع مراد آباد)

ارمان تھے جو دل میں ان کی تائید ہوئی
زندہ پھر اہل دل کی امید ہوئی
پھر علم و ادب کی ہو گی سچی خدمت
صد شکر کہ "ایشیا" کی تجدید ہوئی

پروفیسر رشید احمد صدیقی

یونیورسٹی علی گڑھ۔ ۲۱ جنوری ۱۹۴۹ء

ساغر صاحب محترم۔ آداب

گرامی نامہ صادر ہوا۔ یاد فرمائی اور عزت افزائی کا شکر گزار ہوں۔ آپ نے خوب کیا کہ ایشیا کے احیاء کا ارادہ کر لیا۔ ایشیا جب نکلتا تھا تو آپ کے لطف و کرم سے اس کے مطالعہ کا موقع ملتا تھا۔ میں اس کا جب بھی معترف تھا اور مجھے یقین ہے کہ آپ کی ادارت میں وہ اب بھی ...... اور مقبول رہے گا۔

کل میں لکھنؤ میں تھا، ایک دوست کے یہاں شام کی چائے پر بہت سے نامور اہل قلم مل گئے۔ آپ کے ایشیا کا بھی تذکرہ آ گیا سب نے بڑی مسرت کا اظہار کیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ ایشیا کے حق میں یہ بڑی مبارک بات ہے۔ میرے نہ لکھنے پر میرے سب دوست شکوہ سنج ہیں۔ کیا کروں شرمندہ ہوتا ہوں اور کچھ کر نہیں پاتا۔ آپ مجھے ہمیشہ معاف فرماتے آئے ہیں، جب میری خو نہ بدلتی ہو تو آپ اپنی وضع کیوں بدلیں۔ یعنی آپ برہم ہوتے رہیں میں بیچارگی پر اکتفا کروں۔ امید کہ آپ مع الخیر ہوں گے۔

رشید احمد صدیقی

ساغر نظامی

طوفان سے پہلے طوفان کے بعد!

ابھی جب ۱۲ر نومبر کو بمبئی میں طوفان آیا تو میرے مکان کے پہلو میں جو تناور درخت تھے وہ بھی گر پڑے۔ مکان سے نیچے اُترا تو دیکھا دسیوں بوڑھے درخت سڑکوں پر گرے پڑے ہیں۔ یہ مجھے روز آتے جاتے بُرے معلوم ہوتے تھے۔ بے ہنگم، بدشکل، نفاست سے محروم، تہذیب کے دروازے سے دھتکارے ہوئے بےبس گندے انسانوں کی طرح وہ راستوں کی خوبصورتی کے دشمن تھے۔ کسی نے کہا سڑکیں گھنی چھاؤں سے محروم ہوگئیں کوئی بولا راستے سونے ہوگئے۔ تھکے ہارے ان درختوں کے سائے میں گھڑی بھر دم توڑ لیتے تھے، میں نے کہا ان کے سائے میں دم لے کر دیر میں راہ طے کرنے والوں کے سہارے مٹ ہی جانے چاہیے تھے۔ ہمیں ان جامد بوڑھے درختوں کا سایہ نہیں چاہیے۔ طوفان مُبارک ہے کہ اُس نے نئی تخلیق کی راہیں کھولیں ہیں۔ ہم جُھکے اور پھیلے ہوئے عمر رسیدہ درخت نہیں چاہتے۔ ہم تازہ دم نئے پھوٹنے والے پودے چاہتے ہیں۔ جو نئی آب و ہوا میں پھلیں پھولیں اور راستوں پر نئی خوبصورتی بکھیریں۔ اگر سڑکیں بھی پھٹ جاتیں تو بڑی خوشی کی بات تھی۔ سیمنٹ کی سڑکیں بننے کی راہ کھلتی۔ یہ ڈامر کی کالی کلوٹی سڑکیں اب نگاہوں کو بالکل نہیں بھاتیں۔

میرے یہ فقرے سننے والوں کی سمجھ میں نہیں آئے اور وہ طوفان کی تباہ کاریوں کی داستان کہتے رہے۔ میں نے کہا تخریب و تعمیر لازم و ملزوم ہیں۔ گرے ہوئے درختوں۔ جلے ہوئے مکانوں اور بہتی ہوئی کشتیوں یا طوفان کی زد میں آئے ہوئے انسانوں کی شمار سے فائدہ؟ اب گزران حادثوں پر آنسو بہانے سے کیا حاصل، کہ طوفان کیا بہالے گیا، کیا ڈبو گیا اور زندگی کو کس درجہ توڑ مروڑ کر رکھ گیا—! ؟ کر سکتے ہو تو اپنی دنیا کی ناطاقتی، اپنی قوتِ مقابلہ کی خامی اور اپنی زندگی کی بےبسی کا اندازہ کرو۔ طوفان کی قہاری کا شکوہ کیوں ہے؟ قہر کے چشم و ابرو میں رافت اور محبت کی پوشیدہ کیفیت کو بھی تو دیکھو۔ طوفان ایک پیغام تھا، ایک ہدایت تھا، ایک اشارہ تھا، تمھارے ساحلوں، تمھاری کشتیوں، تمھارے مکانوں تمھارے باغوں اور تمھاری کمزور و بےبس زندگی کے لئے! تمھاری دنیا اس لئے اُلٹ گئی کہ اس کی بنیادیں کمزور تھیں، ساحل کے پتھر اس لئے دور جا پڑے کہ اُن میں قوتِ مقابلہ باقی نہیں رہی تھی۔ کشتیاں اس لئے اُلٹ گئیں کہ ان کے بادبان فرسودہ ہو چکے تھے، مکان اس لئے گر گئے کہ اُن کی بنیادوں میں گھُن لگ چکا تھا۔ پودوں سے پتیاں اور پتوں سے پھول ٹوٹ کر خاک میں اس لئے مل گئے کہ ان کی نزاکت طوفان کی قوت سے ٹکر نہیں لے سکتی تھی۔ اور پیڑ اس لئے گر گئے کہ ان کی جڑیں زمین میں گہری نہیں تھیں۔

طوفان زندگی پر اک انتقادی نظر ہے۔ تخریب کا پیغام تعمیر ہے، ایک ضابطہ ہے۔ ایک نئی تحریک ہے تاکہ ہم اپنی زندگی کی خامیوں پر نظر ثانی کر سکیں—! ؟

تقسیم ہند

جس طرح سمندروں میں طوفان آتے ہیں، خلا میں طوفان آتے ہیں، زمین زلزلوں سے شق ہوتی ہے۔ اسی طرح قوموں کی حیات میں بھی طوفان آتے ہیں۔ عام طوفانوں کی طرح "تقسیم" بھی ایک طوفان تھی، خوفناک، بھیانک اور خونیں، قدرت کے طوفان غیر شعوری ہوتے ہیں، یہ انسانوں کا شعوری اور اختیاری طوفان تھا جو ہماری زندگی کی خوشی بہالے گیا۔ اس کی ہر موج بجائے خود ایک طوفان تھی جس کے تھپیڑوں میں تاریخ ابد تک ہچکولے کھاتی رہے گی۔ اس طوفان نے تہذیب و تمدن، سیاست و مذہب اور ہماری جملہ روحانی و اخلاقی قدروں کو بیقدر بنا دیا۔ اس کی موجوں نے ہماری زبان و ادب کی رہی سہی حرمتوں کو تہ و بالا کر دیا۔ یہ تو

وہ چیزیں ہیں جن کا ہم شمار کرسکتے ہیں۔ لیکن بے شمار متاع ایسی ہے جس کی بربادی کا ہمیں اندازہ نہیں۔

اس طوفان کے ایک نہیں، ہزار المناک پہلو ہیں۔ لیکن غور کرنے کے بعد تو اس کے کچھ اثباتی رُخ بھی ہمیں صاف نظر آسکتے ہیں۔

پہلی نظر میں جس پہلو پر نگاہ جمتی ہے وہ ہماری قومی جدوجہد کا پہلو ہے۔ اس طوفان نے ہماری قومی تحریک کی خامیوں اور ماضی کی اکثر فروگذاشتوں کو بے نقاب کردیا ہے۔ جو لوگ اسلامی تہذیب و تمدن زبان و ادب اور ہمارے ماضی و حال کے تمام ورثہ کی حفاظت کے مدعی تھے۔ ان کے ہر دعویٰ کو باطل کردیا ہے اور جو لوگ ایک ملی جلی تہذیب، متحدہ قومیت، ملکی وحدت اور مشترک وطنیت کے معمار تھے انھوں نے اپنی تعمیروں کو اپنے ہی ہاتھوں طوفان میں غرق کردیا اور خود نہ جانے کن نامعلوم سمتوں میں بہہ گئے!؟

اس پار کا ذکر نہیں، اس پار کے دو قومی نظریہ رکھنے والوں پر تقسیم کے سامنے آنے والے نتیجوں نے ثابت کردیا کہ ان کی راہ غلط تھی انہیں معلوم ہوگیا کہ تقسیم کے بعد وہ ان طریقوں سے اپنے کسی ثقافتی ورثہ کی حفاظت نہیں کرسکتے۔ جن طریقوں پر ان کو یقین کامل تھا کہ وہ ان کی جداگانہ قومیت کے جملہ امتیازات کی پوری حفاظت کرسکتے ہیں۔

تقسیم کے واقعی نتیجے

تقسیم کا پہلا نتیجہ تبادلۂ آبادی کی تباہ کاریوں کی صورت میں رُونما ہوا۔ جس نے بالآخر یہ حقیقت واضح کردی کہ بٹوارہ سے کہیں زیادہ اتحاد اور اشتراک کی ضرورت تھی اور انہیں دو صوبوں میں ہندی انسانیت کی: انکی بہتری اور فراغت مضمر تھی نہ ہند سے پاکستان جانے والوں کو آسودگیٔ روح و قلب نصیب ہوئی اور نہ پاکستان سے ہند آنے والوں کو آتمک چین ملا۔

ان طوفانوں سے ہٹ کر نئے حالات سے پیدا شدہ وہ اہم سیاسی مسائل تھے جو دونوں حکومتوں کی متحدہ کوششوں کے بغیر حل نہیں ہوسکے۔ جیسے جیسے زخم بھر رہے ہیں ہمیں اندازہ ہورہا ہے کہ ہم نے اپنے ہی ناخنوں سے اپنا منہ نوچا ہے انسانیت کے رُخ پر جتنی خراشیں ہیں وہ ہمارے ہی نتیجۂ جنون کی کارفرمائیاں ہیں لیکن ہم علیحدہ ہونے کے بعد کبھی ایک ہونے کی ضرورت سے انکار نہیں کرسکتے۔ ہم ایک خون، ایک جسم، ایک روح ہیں، تقسیم کے بعد جو سب سے عجیب حقیقت سامنے آئی ہے وہ لازمیتِ اتحاد ہی ہے جس سے انکار کا نتیجہ تقسیم کی صورت میں ظاہر ہوا ——!؟

متحدہ قومیت کا خواب

متحدہ قومیت کا خواب محض خواب نہیں تھا ایک حقیقت تھا جس کی اساس تاریخ میں بہت گہری ہے اس اساس کو ایشیائی فلسفے کے مابعد الطبیعیاتی تصوّر کے تطابق نے مضبوط کیا ہے۔ مشرق کی اقوام مادہ پرست نہیں وہ روح کی الہیاتی گہرائیوں کی قائل ہیں یعنی ایشیائی ثقافتی اتحاد کی اصل بنیاد ایک الہیاتی تصوّر ہے جو تمام ایشیائی مذاہب میں کسی نہ کسی شکل میں موجود ہے اسی روحانی رشتے کے پیشِ نظر تمام مشرقی قومیں ایک ہی قوم متصوّر ہوسکتی ہیں کیونکہ وہ ایک ہی مذہب کو مانتی ہیں۔ اگر متحدہ قومیت کے داعی یہ کہتے تھے کہ ہندو اور مسلمان ایک ہی قوم ہیں تو ان کی دلیل کمزور نہیں تھی۔ دونوں قومیں روحانی طاقتوں اور آسمانی قوتوں کی قائل ہیں اور دونوں ایک خدا کو مانتی ہیں۔

طوفان کیوں آیا؟ ...... یہ ایک وسیع اور اہم سوال ہے۔ اسکا جواب دینے کے لئے تاریخ اور وقت کے پہلوؤں سے پھوٹنے والے قدرتی حالات و واقعات کا تجزیہ کرنا پڑیگا۔ یورپ کے تجارتی انقلاب کے بعد ہمارے ملک میں برطانوی سامراج کے منحوس قدم آئے۔ تاریخ کے ارتقائی عمل کے لحاظ سے صنعتی انقلاب نے زندگی میں کسی قدر تبدیلی پیدا کی اور انگریزی حکومت نے ہندوستان میں قدیم جاگیرداری کا خاتمہ کردیا۔ ہم ایک زنداں سے نکالے اور دوسرے قیدخانے میں ڈال دیئے گئے۔ جس کا صحن قدرے - - - - - - -

کشادہ تھا۔ لیکن برطانوی سامراج کی غلامی کا ردِّ عمل ہندو مسلمانوں پر اس شعور کے ساتھ نہیں ہوا کہ وہ ایک نظام سے آزاد ہوکر دوسرے نظام میں داخل ہورہے ہیں، پہلا جال زیادہ سخت تھا جسے ارتقائی عمل نے توڑ دیا ہے اور نیا جال اس کے مقابلے میں کمزور ہے جسے وہ آسانی سے توڑ سکتے ہیں۔ بلکہ اس انقلاب کا اثر ہندو مسلمانوں پر رجعتی صورت میں ہوا۔ غلامی کی زنجیریں توڑنے کی جتنی کوششیں کی گئیں وہ پرانی زنجیروں کی یاد میں کی گئیں، جتنی تحریکیں اٹھیں وہ پیچھے واپس جانے کے لئے تھیں آگے بڑھنے کے لئے نہیں عوام کا ذہن خودی شعور اور بالغ نہیں تھا ہندومت کی نشاط الثانیہ اور احیائے اسلام کے دور رس نتائج تک

نہ پہنچ سکا اور ہمارے سیاسی مفکرین کے پاس (جو خود دراثنت کی دقیانوسی قیدوں سے آزاد نہیں تھے) لے دے کر صرف ایک نسخہ تھا کہ وہ عوام کو ماضی کے نام پر بیدار کریں اس نسخۂ کیمیا کے اجزائے ترکیبی میں سب سے بڑا جزو مذہب کا تھا۔ جس کا نام لے کر غلامی کے خلاف عوام کا مورچہ بنایا گیا ہمارے سیاسی و اخلاقی طبیبوں کی تشخیص ہی غلط تھی۔ انھوں نے مرض کی حقیقی علت کو معلوم نہیں کیا جو جاگیرداری سے لے کر سرمایہ دارانہ عہد تک عوام کی روح کیں تعفن لگاتی رہی تھی۔ عوام کے مذہبی احساس کو بیدار کیا گیا تا کہ برطانوی غلامی کی زنجیریں توڑی جا سکیں، برطانوی غلامی کو اسلامی تہذیب و تمدن اور مسلمانوں کے اخلاق و اعمال کے زوال کی بنیاد قرار دیا گیا۔ سیاست دانوں سے لے کر شاعر اور ادیبوں تک نے ایک ہی راگ گایا کہ ہماری نجات مسلمانوں کے قرونِ وسطیٰ کے واپس لانے میں مضمر ہے اور اس مقصد کے حاصل کرنے کے لئے برطانوی غلامی کی زنجیریں توڑ دینا ضروری ہے۔ اس طرح مسلم عوام کے ذہن پر یہ چھاپ پڑی کہ آزادی کے معنی اسلامی حکومت کے قیام اور ہندوستان میں مسلم اقتدار کے ہیں۔

اسی طرح ہندو رہنماؤں نے جن خطوط پر ہندو عوام کو جنگ کے لئے تیار کیا ان کے ڈانڈے بھی' پراچین تہذیب، ہندو سنسکرتی اور ۲ ہزار سال قبل کی تمام ہندو روایات سے جا ملتے ہیں اور انہی کے احیاء کے وعدوں پر قوم کی ذہنی تربیت کی گئی اس طرح آہستہ آہستہ ہندو مسلمانوں کے فکر و عمل میں مسلسل تضاد پیدا ہوتا چلا گیا اور وہ اس وقت نمایاں ہوا جب آزادی کی منزل قریب آئی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اس تضاد کا پس منظر بہت وسیع ہے جس میں ہمیں دوسرے اسباب کی نشانیاں بھی ملتی ہیں جن کا تعلق ہمارے ملک میں سرمایہ دارانہ نظام کی خامی اور سماجی نقائص سے بھی ہے لیکن بہر حال یہ ہمارے سیاسی مفکرین کی ناپختگی تھی کہ انھوں نے قومیت کے واضح تخیل کی بنیاد پر ہندوستانی عوام کی تربیت نہیں کی۔ ان کے اعمال و افکار میں ترقی پسندی کا اتنا ہی جزو تھا کہ وہ "آزادی" چاہتے تھے باقی رجعت پسندی ہی رجعت پسندی تھی جس کے گرداب میں، وہ پھنس کر رہ گئے جن مسلمان اور ہندو عوام کو تقریباً ڈیڑھ سو سال آزادی کا یہ مفہوم بتایا گیا کہ "شاہی" پھر واپس آجائے گی اور آزادی کی تعبیر پر مسلم اقتدار قائم ہوگا یا قدیم آریہ ورت کا آریائی اقتدار ہندوؤں کو حاصل ہو جائیگا اور وہ رام راج کی برکتوں سے مالا مال ہو جائیں گے ان کے ذہن آزادی کی یہ غیر منطقی توجیہہ کیوں کر کر سکتے تھے کہ حقیقی آزادی کا مقصود ایک نئے آدرش پر موقوف ہے جو متحدہ قومیت کی بنیاد پر نئی قوم کی محکم تعمیر کے مترادف ہے۔

زہر سے زہر کا تریاق

ادھر ہندو اور مسلمان رہنما گزرے ہوئے دور کی غیر مرتقی مذہبی ثقافت کے نام پر عوام کو انگریز سے ٹکرا رہے تھے ادھر انگریز بھی ان زہریلے نسخوں سے غافل نہیں تھا جو ہمارے سیاسی و اخلاقی طبیب غلامی اور محکومی کے جراثیم کو ہلاک کرنے کے لئے تجویز کر چکے تھے زیرک انگریز نے اس زہر کا تریاق انہیں کے زہر سے حاصل کیا اس نے اس اتحاد کو جو قدیم مذہبی سیاسی شعوروں کی بنیاد پر پیدا کیا جا رہا تھا مذہب ہی کے نام پر ختم کرنیکا پلان بنایا۔ اور ان تضادوں کو دھڑلے سے استعمال کیا جو قومی تحریک کے اجزائے ترکیبی میں موجود تھے۔ مذاہب کے جزوی اور فروعی اختلافات کے نام پر برطانوی سامراج اور ملک کے غداروں نے قومی تحریک کا ہر ممکن توڑ کیا اور اُسے نمایاں کامیابی اس لئے ہوئی کہ ہندو مسلم عوام میں آج تک جس جذبے کو اُبھارا گیا تھا وہ دین دھرم کی غلط تعبیر پر مبنی تھا۔ اس جذبے کے دو دھارے ایک دوسرے کے تحت الشعور تخالف سے غافل ہو کر آزادی کے جنون میں غلامی کی آہنی دیواروں سے ٹکرا رہے تھے۔ انگریز نے پہلے ان دھاروں کا بند باندھا اور پھر انھیں دو مخالف سمتوں میں موڑ دیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے یہ دھارے بے پناہ سیلاب میں تبدیل ہو گئے اور ملک میں اختلاف و نفاق کا ایک تلاطم برپا ہو گیا۔

ہندو مت اور اسلام کے نام پر ملک میں جو آگ لگائی گئی وہ آگ کلائیو اور ہیسٹنگز کے عہد سے لے کر ماؤنٹ بیٹن کے عہد تک ہمارے اخلاق و انسانیت کو پھونکتی رہی۔

جیسے جیسے انگریز کو طوفانِ آزادی کی خشونت اور ہمہ گیری کا اندازہ ہوتا گیا نئے نئے بند باندھتا گیا اس نے ہندوستان کی تاریخ میں ترمیم و تنسیخ کی، اس نے مذہبی عصبیت کے نیم مردہ احساسات کو زندہ کیا اور مشترک قومیت کی داغ بیل کو مٹا دینے کی ہر ممکن کوشش کی۔ اور سیاست کے بطن سے بالآخر فرقہ پرستی کی غیر نسل پیدا ہوئی۔ جس نے ہندوستان کو تمام عالم میں رسوا اور بدنام کر کے چھوڑا۔

غلامی کے خلاف لڑائی میں قوم پرستوں کو وہ تمام مظالم سہنا پڑے جو حکومت، بیوروکریسی، فرقہ پرستی اور دوسرے وطن دشمن

عناصر کی طرف سے اُن پر توڑے گئے اور وہ انگریزی ڈپلومیسی کی بھڑکائی ہوئی آگ نہ بجھا سکے۔ انھیں تسلیم کر لینا چاہئے کہ اتحاد شکن قوتوں کے مقابلے میں کوئی فوری اور موثر اقدام اُن کے بس کا نہیں تھا، وہ کوئی ایسی تحریک بر سرِ کار نہ لا سکے۔ جو سائنٹفک اصولوں پر مذہب زدہ عوام کی ذہنی تربیت کر سکتی یا اُن کو مذاہب کی مشترک حقیقتوں سے روشناس کرا دیتی۔

میرے خیال میں جنگِ آزادی کا وہ دَور جو برطانوی سامراج کے نئے نئے داؤ پیچ کی زدوں میں گزرا۔ ہماری زندگی کی پچھلی تہوں میں المناک آثار پیدا کرتا رہا۔ مذہب زدہ عوام غیر شعوری طور پر کچھ مدت کے لئے سامراج سے ٹکرائے لیکن ان کے ذہن صاف نہیں تھے، مقصد کی تصویر دھندلی تھی اور منزل کے آثار مبہم۔ اور اسکا اصل سبب یہ تھا کہ ہندو مسلم عوام باہمی محبت کی بنیاد پر نہیں بلکہ ایک مشترک غنیم کے مقابلے میں نفرت اور غصّہ کے ماتحت متحد ہوئے تھے۔ اس کمزور بندھن کو ہمارا حریف جب چاہتا کمزور کر دیتا تھا۔ جیسے ہی مُلک میں مذہبی تضادوں کے نام پر رجعتی تحریکیں اٹھیں یہ اتحاد ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ اور اس شکست کی گونج میں لوگ صلح، علاقوں اور رشتوں کی لذت کو بھی بھول گئے۔ یہاں تک کہ ہماری وطنی زندگی تلخی اور کڑواہٹ کا ماتم بن گئی۔ صد حیف کہ اس ماتم میں لیڈروں کا غیر ضروری جوش سب سے زیادہ نمایاں تھا۔

دیسی زبانوں کا ادب اور قومی تحریک

اس کے باوجود کہ قومی تحریک میں مثبت اور صحت مند عناصر کی کمی تھی لیکن اُس نے ایک نیم مذہبی سیاسی ماحول ضرور پیدا کر دیا جس سے کم و بیش دیسی زبانوں کا ادب متاثر ہوا۔ ہندی، بنگالی، گجراتی اور مراٹھی وغیرہ کے ساتھ نہتہ میں قومیت کی بنیادوں پر کچھ تخلیقات ہوئیں کچھ شعرا اور افسانہ نگار اور ادیب بھی پیدا ہوئے جو تازہ انقلاب کے ساتھ چلنے کی کوشش کرتے تھے لیکن ان سب کے ادب کا خمیر مذہبیوں کی پرانی مٹی سے گوندھا گیا ہے اور ان کی تخلیقات سے پرانی اور رجعت پسندانہ ذہنیت جھانکتی معلوم ہوتی ہے۔

اسی طرح اُردو زبان میں جو قومی ادب پیدا ہوا اس کے عناصر ترکیبی میں بھی ماضی کی روایات اور مذہبیت رچی ہوئی تھی

اور یہ تصوّرات، نئی اور تازہ دَم قومیت کے مطابق نہیں تھے اکثر ادیبوں اور شاعروں کا آغاز قوم پرستی سے ہوا اور انجام پین اسلام ازم پر! ادب کی اس دو رنگی سے صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ زندگی کی ہر جہت میں دو دھارے بہتے رہے اور ان دھاروں کو ایک کرنے کی کوئی نمایاں کوشش قومی تحریک کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ صوبائی زبانوں کے ادب میں تخلیقی اختلاف موجود تھا۔ جسے کم از کم ۱۹۳۵ء تک ہمارے ادیبوں اور شاعروں نے مٹانے کی کوئی جد و جہد نہیں کی اور نہ کوئی خاص مفاہمت ہی پیدا کر سکے۔ جو ہماری کلچرل یگانگت کا موقف بن جاتی۔ بلکہ اس کے خلاف ہندی اُردو کی کشمکش کی ایک طویل داستان ملتی ہے جس پر قومی تحریک کے سر بر آوردہ افراد کے دستخط ہیں۔ حالانکہ یہ طویل داستان ہندو اور مسلمان کے درمیان تہذیبی اور لسانی خلیج حائل کرنے کے لئے فورٹ ولیم کالج میں برطانوی حکمت عملی نے تصنیف کی تھی، دونوں قوموں کو اس حکمت عملی کے پیچھے چھپی ہوئی اس سازش کو آشکارا کرنا چاہئے تھا لیکن دونوں زبانوں کے ماننے والے اس سازش کا شکار ہو گئے اور بالآخر ادب و سیاست کی دوری نے زبان کے مسئلہ کو خطرناک صورت دے دی۔ ہر سیاسی حلقہ سے اس سلسلہ میں جتنے قدم اٹھائے گئے وہ متحدہ قومیت کے بنیادی اصولوں کی تکذیب اور فرقہ پرستی کی تصدیق کرتے ہیں۔

قومی تحریک کے ناخداؤں نے ادب کو اپنے دائرۂ عمل سے بالکل خارج رکھا اور اس کی افادیت سے فائدہ اٹھانے سے حیرت انگیز طور پر احتراز کیا۔ اگر ادب کی پست سطح پر آنا ان کی شان کے منافی تھا تو وہ خود ہی کوئی ایسا ادارہ قائم کر سکتے تھے۔ جس کے ذریعہ عوام میں صحت مند سیاسی شعور پیدا کیا جا سکتا!۔ لیکن انھوں نے یہ بھی نہیں کیا۔

عوامی انقلاب کی بنیاد

ادب سے قومی تحریک کے بانیوں کی روگردانی کوئی معمولی فروگذاشت نہیں ہے۔ یہ فروگذاشت ہمارے وطن کی بہت سی خرابیوں کی ذمہ دار ہے۔ ملکوں کا مستقبل یوں ہی نہیں بن جاتا، قومیں محض سیاسی داؤ پیچ سے نہیں بنا کرتیں، قوم تعمیر کے مسلسل عمل کا نتیجہ ہوتی ہے۔ انقلاب کوئی ناگہانی تخلیق نہیں ہے۔ انقلاب کے لیے دنیا کے ہر ملک میں برسوں ادب کے ذریعہ جد و جہد کی گئی ہے۔ انقلابِ فرانس کوئی حادثہ نہیں تھا اور نہ انقلاب روس کوئی وقتی سانحہ تھا۔ اس کے لئے عوامی اعصاب کو بہت پہلے سے

تیار کیا گیا تھا۔ ۱۹۱۷ء سے قبل اشتراکیت کے موضوع پر کروڑوں کتابیں عوام میں پھیل چکی تھیں، اشتراکیت کے متعلق روسی عوام میں جو مضبوط اعتقاد پیدا ہوا وہ اعتقاد سینکڑوں ادیبوں کی ذہنی کاوشوں کا نتیجہ تھا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو پرولتاری انقلاب ناکام بھی ہو سکتا تھا — !؟

جس عہد میں ہماری قومی تحریک نے بال و پر نکالے انقلاب روس اسی عہد کا واقعہ ہے لیکن تاریخ کے اس عظیم انقلاب سے ہمارے رہنماؤں نے کچھ نہیں سیکھا کسی ایسی اجتماعی ادبی تحریک کا تصور ان کے ذہنوں میں نہ ابھر سکا جو اس بات کی ذمہ دار قرار پاتی کہ وہ عوام کے ذہن کو ایک واضح مقصد کے سانچے میں ڈھال دے گی — !؟

میرے خیال میں عوامی انقلاب کی کامیاب ابتدا اسلام نے کی، دنیا اس سے پہلے عوامی رجحان کی تربیت اور ترقی کی قائل نہ تھی اس کامیاب ابتدا کی اساس ادب اور فصاحت و بلاغتِ کلام پر رکھی گئی۔ سب سے پہلا انقلاب قرآن کریم کی فصاحت اور بلند ترین ادبیت کے ذریعہ برسرِ کار لایا گیا اور دنیا کے اس انمول ادبی ذخیرے نے عرب کی زندگی کے طور طریقے تمیزی کی کایا پلٹ دی یہ عین قانونِ فطرت تھا۔ انسانوں کے شعوب زندگی میں انقلاب اور کامیاب انقلاب کے لئے ادبی و شعری ٹھوکروں اور جھکولوں کی ضرورت ہمیشہ رہی ہے، قرآن نے فصحائے عرب کو خاموش کر دیا، کہانت کے سحر ساز نغمے ختم ہو گئے۔ شعراء کی عریاں نگاری دفن کر دی گئی، قصیدہ خوانوں کے غلو اور مخلوق پرستی کو معدوم کر دیا گیا۔ نئے ادب، نئے اندازِ بیان نئے حُسنِ فصاحت اور جمالِ بلاغت کی آغوش میں انقلاب پسند اجتماع کو پروان چڑھایا گیا۔ قدرت کے اسی قانون کے ماتحت ہندوستان کے ادب کی روح انقلاب بیدار ہوئی، اور اس کمی کو پورا کرنے کی ایک کوشش کی گئی جو ہندوستان کی سیاسی انقلابی تحریک میں نمایاں تھی یعنی یہاں کے متوقع انقلاب کی بنیاد ادب اور لٹریچر پر نہیں رکھی گئی تھی بلکہ غلامی اور محکومی کی مجبوریوں اور معذوریوں پر !

اردو ہندی کے شاعر نئے ماحول کی خود پیداوار ہیں جن کی شاعری نے تحریک آزادی کو کافی قوت بخشی لیکن سیاسی اداروں سے ان کا کوئی رابطہ نہیں رہا قومی سیاست کے خداؤں نے بندگانِ ادب سے کبھی واسطہ نہیں رکھا۔ ادب سے کوئی محکم سیاسی و ملکی افادیت پیدا ہوتی تو کیوں کر ہوتی — !؟

انجمن ترقی پسند مصنفین

۱۹۳۶ء میں نوجوانوں کے چھوٹے سے گروپ نے ایک انجمن بنائی اور اس کے مینفسٹو میں ادب کے نئے مقاصد کی تعیین و تشریح کی میرے خیال میں ادیبوں اور شاعروں کا یہ نیا تصور قانونِ ہند مجریہ ۱۹۳۵ء کی لغویتوں نے پیدا کیا جس نے ہندوستانی عوام کی توقعات کے بالکل خلاف وہ سیاسی آئین ہندوستان کو دیا جو ہمارے مشترک ادب اور ہمارے ملے جلے کلچر کے لئے زہرِ ہلاہل بن گیا۔ یہیں سے اردو ہندی ادب میں سیاست و ادب کا ایک شفاف آمیزہ ترکیب پانے لگا۔ جس نے ادب کی نئی قدروں کی داغ بیل ڈال دی اور عوام کے ذوق و معیار کو متاثر کرنا شروع کر دیا۔

ترقی پسند مصنفین کی انجمن نے صاف صاف اپنے مینفسٹو میں اعلان کیا :— "ان کا فرض ہے کہ وہ اس قسم کے اندازِ تنقید کو رواج دیں جس سے خاندان، مذہب، جنس، جنگ اور سماج کے بارے میں رجعت پسند اور ماضی پرستی کے خیالات کی روک تھام کی جا سکے"

اور اس طرح رجعت و فرقہ پرستی کے خلاف قومی محاذ سے ہٹ کر ایک نیا مورچہ قائم ہوا۔

چند ہی برسوں میں یہ تحریک نوجوانوں میں مقبول و کامیاب ہو گئی۔ انجمن نے نئے لکھنے اور پڑھنے والے پیدا کئے، ادب میں نئے موضوعات کا اضافہ ہوا۔ ادب کی تکنیک بدلی اور نئے تصور کو پروان چڑھانے کے لئے انجمن کو بہت کچھ بنیادی مرحلوں سے بھی گذرنا پڑا۔ پرانے سماجی تصورات پر نئی تحریک ایک ضرب تھی اس لئے اسے مخالفت کے طوفانوں سے بھی ٹکرانا پڑا، چند ہی برسوں میں یہ سب کچھ ہوا لیکن وسیع پیمانے پر عوام کو متاثر کرنا اس کے بس کی بات نہ تھی۔ کیونکہ ظاہر ہے یہ تحریک قومی جدوجہد کے اس موڑ پر معرضِ وجود میں آئی۔ جب ملک ذہنی طور پر دو حصوں میں بٹ چکا تھا اور عوام فرقہ پرستی کے غلط راستے پر

پڑ چکے تھے۔ اور اس صورتِ حال کا ردِّ عمل مثبت نہیں منفی ہو رہا تھا۔

سیاست اپنے نت نئے تجربوں اور داؤ پیچ میں مصروف تھی، ادب کے بے نواؤں کی بات سننے والا کوئی نہ تھا۔ یہ درست ہے کہ بعض رہنماؤں نے انفرادی طور پر انجمن سے دلچسپی کا اظہار کیا اور اس کی افادیت کو بھی تسلیم کیا اس کے باوجود کسی کی سمجھ میں یہ نہ آیا کہ ادبی انقلاب، سیاسی انقلاب کی بنیاد ہے۔ اس لئے اس تحریک کی پشت پناہی صالح و مثبت نتائج پیدا کرے گی اور اس کے ذریعہ رجعت و فرقہ پرستی کو ختم کیا جا سکے گا۔

کچھ ہی برسوں میں نئے نظریوں، اور نئی سیاسی صورتِ حال نے انجمن اور قومی تحریک کے درمیان بھی خطِ فاصل کھینچ دیا۔ اور اس طرح قومی لیڈرشپ نے ادب کو اپنانے کے اس موقع کو بھی کھو دیا۔

یہاں تک کہ دو متقابل قوتوں لیگ اور کانگریس کی سیاسی رقابتوں نے ایک نئے المیہ کا آغاز کیا۔ میرے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ میں بارہ برس کی المناک سیاسی تاریخ دہراؤں نہ میرا یہ مقصود ہے کہ میں اگلے پچھلے گناہوں کا شمار کروں۔ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ملک کا دردناک انجام کوئی حادثاتی واقعہ نہیں ہے۔ اس انجام کی نشوونما ہماری فحش غلطیوں اور سیاست کی بنیادی خامیوں کی گود میں ہوئی ہے۔ یہ انجام ہندو مسلمان اور سکھ ہر فرقہ کی ناعاقبت اندیش لیڈرشپ اور برطانوی سامراج کی سفاکانہ ریشہ دوانیوں کا نتیجہ ہے

تقسیم سے برسوں پہلے ذہنوں میں دو حکومتوں کا تصور گھر کر چکا تھا۔ ہندوؤں کے ذہن میں ہندو راج کا اور مسلمانوں کے ذہن میں حکومتِ الٰہیہ کا، یہ تصور اس غلط تربیت کا نتیجہ تھا جو دونوں فرقوں کو دی گئی تھی۔ ہر چند کہ اس تربیت کی بنیاد کوئی بدنیتی نہیں تھی۔ لیکن یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ سیاسی ذہن کا عدمِ بلوغ اس کا اصل سبب تھا۔ عوام تو عوام رہنماؤں کے ذہن پرانی روایتوں سے آزاد نہیں تھے۔ ان کے ذہن میں بھی قومیت کا تصور صاف نہیں تھا اگر صاف ہوتا تو تاریخ کی دوسری ہی شکل ہوتی۔

یہاں میں ہندو مسلم سکھ لیڈرشپ کے متعلق احترام اور بے باک گفتاری کے ساتھ دو لفظ کہہ دینا چاہتا ہوں کہ انھوں نے مصلحِ اعظم کا لباس تو پہن لیا لیکن اصلاح اور تربیتِ عام کے سلسلے میں وہ اپنے یقین اور اعتقاد پر اٹل رہنے کے بجائے عوامی جذبات کی رَو میں بہتے چلے گئے۔ انھوں نے مضبوط اور رواداری ذہنیتیں بنانے کا کبھی عزم نہیں کیا وہ تو صرف ووٹوں اور رائیوں کے حصول کے لئے عوام کے لاشعوری جذبات کو مطمئن کرنے میں لگے رہے۔ ہمیں رہنماؤں کی اس کہکشاں میں ایک ہی سب سے زیادہ روشن ستارہ ملا تھا اور اس طرح ملا تھا جس کی استقامت بالحق اور اصرار بالصداقت نے اس سے آخری اور سب سے زیادہ قیمتی قربانی تو لے لی مگر اس کو عوامی رَو میں نہیں بہنے دیا۔ اس نے اپنی اور دوسروں کی شعاعوں کو غلط سمتوں میں پڑنے سے ممکن طور پر روکا لیکن تاریکی بڑھتی ہی چلی گئی۔

اگر تحریکِ آزادی میں مختلف سیاسی رجحان رکھنے والے قائدین کا رول حریفانہ نہ ہوتا اور تمام انقلابی حلقے اپنی متحدہ قوت سامراج سے مقابلے کے لئے استعمال کرتے تو انگریز کی حکمتِ عملی ناکام بنائی جا سکتی تھی۔ یہ غلامی اور سیاسی ذہن کی ناپختگی تھی کہ اپنوں ہی سے ٹکراؤ کے لئے میدان تیار کیا گیا اور عوام کے ذہن ان کے حلقوں میں محدود کر دیئے گئے وہ اپنے دام سے آزاد ہو کر صیاد کو نہ دیکھ سکے جو کمین گاہ میں بیٹھا ہوا ایک دوسرے کے خلاف تیر چلانے کے لئے اُکسا رہا تھا۔

سیاست میں عوام کا رول

یہ سادہ لوحی کچھ ہندوستانی عوام ہی میں نہیں، ہر ملک کے عوام کا رول سیاسیات میں ایک ہی رہا ہے۔ یعنی آنکھ بند کر کے وعدوں کے چکر میں آ جانا جو بلند آواز سے تریاق کے نام پر زہر فروخت کرے اُسے مسیحا سمجھنا، جو راستوں کو زیادہ پُرپیچ بنائے اُسے اپنا رہبر خیال کرنا، جو ان کے جذبات کے خرمن میں چنگاریاں چھپا دے اُسی کو اپنا دوست سمجھنا۔ اور خود اپنی قوت کا احساس کبھی نہ کرنا۔ عوام بھولے ہیں۔ شریف ہیں۔ سادہ لوح ہیں، وہ اپنے دُکھ کی دوا چاہتے ہیں اور جو بھی ان کے دُکھ کو دور کرنے کا وعدہ کرے اسی کے ہاتھ میں ہاتھ دیدیتے ہیں۔ ہندو مسلم عوام دونوں کی ایک ہی کیفیت ہے۔ اس سے بڑھ کر سادہ لوحی

اور کیا ہو سکتی ہے کہ سی۔ پی کے ۵ فیصدی مسلمان اس خیال میں
مگن رہے کہ تقسیم کے بعد ان کی کلچرل انفرادیت باقی رہے گی۔۔۔!؟

تقسیم اور اس کا ردِّ عمل

اور جب یہ طوفان آکر اتر گیا تو بجائے آنکھیں کھُلنے کے
ہمیں اور کم نظر آنے لگا۔ نئی جغرافیائی حد بندیوں نے ہماری
آنکھوں پر نئے پردے ڈال دیئے اور یہ غیر قدرتی نہ تھا۔ تقسیم
نے ایشیا کی سیاسیات میں ہند کو نقصان پہنچایا، تقسیم نے
انسانیت کو تقسیم کر دیا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ تقسیم ہمارے سر تھوپی
گئی یا ہم نے اُسے رضامندی سے اختیار کیا۔۔۔!؟

میں تفصیلات میں نہیں جانا چاہتا لیکن تقسیم تو اُس تربیت
کا منطقی نتیجہ تھی جو ہر حلقے میں مذہب کا سہارا لے کر عوام کو دی
گئی اور پھر جب ایک ایسا مرحلہ آگیا جہاں پہنچ کر کوئی راہ باقی نہیں
رہ گئی تو ہمارے رہنماؤں نے رضامندی سے اسے منظور
کر لیا۔ ظاہر ہے کہ عوام الگ الگ خواب دیکھ رہے تھے اور اپنے
خوابوں کی تعبیر اُن تصورات کی روشنی میں چاہتے تھے۔ جن کی انہیں
تعلیم دی گئی تھی۔ مقاصد کے اختلاف نے ان کے خوابوں میں خوفناک
تضاد پیدا کر دیا تھا اس لئے اگر اُن پر تقسیم کا ردِّ عمل ہوا تو غیر متوقع
اور غلط نہیں تھا، ہندو عوام ایک متحدہ ملک کا سپنا دیکھ رہے
تھے، اور مسلم عوام ایک ایسے پاکستان کا خواب دیکھ رہے تھے
جس میں پورا بنگال اور پنجاب سمایا ہوا ہو اور جس کا خون ہند
کے مسلم اقلیتی صوبوں کی شریانوں میں بھی پوری تازگی و روانی
سے دوڑ رہا ہو۔ اُن غریبوں کا کیا قصور تھا؟ اُن سے وعدہ ہی
یہ کیا گیا تھا کہ علیحدگی کے معنی تمام ہند میں ان کی جداگانہ
وحدانیت کے قیام کے ہیں۔۔۔!؟

لیکن عوام سے قطع نظر جن رہنماؤں نے تقسیم کو بخوشی
منظور کیا وہ بھی اس کے ردِّ عمل سے اپنے ذہن کو محفوظ نہ
رکھ سکے۔ اتنے خوفناک طوفان کے بعد جس میں انسان اور
انسانیت خس و خاشاک کے مانند بہہ گئی۔ رہنماؤں کو
حقائق کو تسلیم کر لینا چاہئے تھا۔ اپنے غلط اقدامات اور غلطیوں
پر کڑی نظر ڈالنی چاہئے تھی لیکن تقسیم کے بعد بھی خندقیں نہیں
بھری گئیں، مورچے نہیں توڑے گئے۔ بلکہ اس قسم کا طرزِ عمل
اختیار کیا گیا، گویا جنگ کا یہ اولین مرحلہ ہے!؟ طوفان
کے بعد بھی نئے نئے طوفان آتے رہے اور ہر طوفان ہماری رہی
سہی متاعِ انسانیت کو بہائے جاتا رہا۔

مسلم عوام اور اُن کی بے بسی

اور ان طوفانوں میں ہندی مسلم عوام کی بے بسی، مایوسی
اور ذہنی انتشار کی کوئی حد نہیں رہی ان کے لئے نئی نئی مشکلیں
پیدا ہو گئیں۔ انھیں راہ بتانے والا تو درکنار کوئی بھٹکانے والا
بھی موجود نہیں رہا۔ انھیں اپنے گناہ سادہ لوحی کی بہت بڑی قیمت
ادا کرنی پڑی۔ یہاں رہ کر بھی اور یہاں سے ہٹ کر بھی، یہاں
رہ کر وہ بہت دنوں اُن فاسد جذبات سے آزاد نہ ہو سکے
جنھیں وہ بغیر کسی دلیل اور منطق کے دلوں میں باقی رکھے ہوئے
تھے۔ اپنی تباہی خانہ خرابی اور بربادی کے اسباب وہ اب
بھی نہیں سمجھ سکے تھے۔ تقسیم کے نتائج کو وہ ہم وطنوں کے جبر و ظلم
سے تعبیر کرتے رہے۔ لیکن اس جال کے حلقے زیادہ دنوں مضبوط نہ
رہ سکے۔ حالات اور اس کے تدریجی ارتقاء نے اُن حلقوں کو
جلد ہی پگھلا دیا، وہ آزاد ہوئے اور اس بوجھ سے سبکدوش
ہو گئے جو ان کے احساس کی کمر توڑے دے رہا تھا۔ خارجی اور داخلی
احساسات و تاثرات انسان کو کبھی آزاد نہیں چھوڑتے۔ جیسے ہی انھیں
اس بار سے سبکدوشی حاصل ہوئی ایک نئی کیفیت نے انھیں آگھیرا
وہ اپنی روح میں ایک خلا محسوس کرنے لگے۔ ان غریبوں
نے کبھی اپنے دماغ سے نہیں سوچا تھا اور ماضی کی گمراہیوں نے
اس تعلق کو ان کی نگاہوں سے مطلق پوشیدہ رکھا تھا جو انھیں
اپنی مادرِ وطن سے ہونا چاہئے تھا۔

یہاں سے ہٹ کر مسلم عوام اُن تمام روحانی آسودگیوں
کے رشتے سے کٹ گئے۔ جو صدیوں کے رہن سہن اور
کلچرل مداومت کا نتیجہ تھیں۔ گناہ سادہ لوحی کی یہ قیمت
کوئی معمولی قیمت نہیں تھی۔ روحانی آسودگی۔ خارجی ماحول
اور داخلی مزاج کے مسلسل تعاون و ہم آہنگی کا نتیجہ
ہوتی ہے اسے کوئی حادثاتی محبت یا ہنگامی نفرت پیدا نہیں
کر سکتی۔ چنانچہ دونوں طرف تقسیم کے بعد کے احساسات
اس کی کھلی ہوئی تصدیق ہیں۔ نہ جانے والوں کو چین ملا
نہ یہاں آنے والوں کو۔

ہندی مسلمانوں کی نئی اجتماعی حیثیت

اور جو یہاں رہ گئے بالآخر اب ان کی آنکھیں کھلی ہیں اور انھوں نے محسوس کر لیا ہے کہ ہندو مسلمان بھائی بھائی ہیں۔ ایک ماں اور ایک خون نے انھیں جنم دیا ہے اور ہند کی خاک ہی سے ان کا ازلی و ابدی رشتہ ہے۔ ملک تقسیم ہو سکتا ہے مگر روحوں کو تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ وہ دوسرے ملکوں کے مسلمانوں سے کٹ جائینگے نہیں، وہ اُن سے اور قریب ہو جائیں گے۔ اپنے ہم وطنوں کے ساتھ ترقی کرنے کے بعد ان کی نئی اجتماعی حیثیت ہوگی اور وہ اس عظیم الشان قوم کا ایک صالح اور زندہ قوت حصہ ہوں گے جو ۳۵ کروڑ افراد پر مشتمل ہے۔

اس نئی اجتماعی حیثیت و قوت کا اندازہ کرنا ہندی مسلمانوں کا پہلا کام ہے، بعید از قیاس تصورات میں اگر کچھ اور وقت برباد کیا گیا تو رہی سہی قوت بھی ضائع ہو جائیگی۔ حالات کے جبر سے تبدیل ہونا یا تبدیل کرنا سب سے بڑی اخلاقی پستی ہے، مسلمان جن بلند اصولوں کے ماننے والے ہیں۔ اُن اصولوں کی توہین ہے۔ اگر وہ اپنے سینوں میں جھانکیں تو انھیں محسوس ہوگا کہ ایک نئے تزکیۂ نفس کی ضرورت انھیں پکار رہی ہے۔ یہ تزکیۂ نفس ان کے مرجھائے ہوئے یقین کو ازسرِ نو شاداب کر دے سکتا ہے۔ ان کے لئے ایک ہی راستہ ہے کہ وہ ہر جنجال سے آزاد ہو جائیں اور پوری خود اعتمادی کے ساتھ ایک نئی زندگی کا آغاز کریں۔

اکثریت کی غلامی

تقسیم کا ردِ عمل گوناگوں بد مذاقیوں اور حماقتوں کا ایک سیلاب بھی اپنے ساتھ لایا، ان متعدد بد مذاقیوں میں سے ایک بد مذاقی ہندی مسلمانوں کا یہ احساس بھی ہے کہ وہ اکثریت کے غلام ہو گئے۔ یہ احساس ماضی کے احساسِ کمتری کا ہی ایک حصہ ہے۔ یہ نیا نہیں پُرانا زخم ہے اور اس وقت تک نہیں بھر سکتا جب تک، ان میں روحانی تبدیلی نہ ہو۔ جب تک اس پر وطن سے محبت اور خود اعتمادی کا مرہم نہ رکھا جائے۔ یہ مرہم کسی طبیب کے پاس نہیں ہے، کسی رہنما کے پاس نہیں ہے۔ یہ ہندو مسلمان شعراء اور ادیبوں کے پاس ہے جنہوں نے ہر نازک موقع پر ٹوٹتے ہوئے اعصاب کو تازہ تر قوت بخشی ہے اور آج بھی انہیں کی ایک ایسی جماعت ہے جس کے افراد تعصب سے پاک ہیں، جس میں ہندو، مسلمان، اور سکھ ایک آواز ہو کر انسانیت کی صدا لگاتے ہیں اور مایوس عوام کی ٹوٹی ہوئی ہمت بندھا رہے ہیں، مسلم عوام کے اس زخم کو یہی لوگ ہی بھر سکیں گے جو مسلمانوں کے دلوں میں احساسِ کمتری نے ڈال دیا ہے۔

ملک ایک خطرناک طوفان کو عبور کرنے کے بعد جس دور میں داخل ہوا وہ تھی آندھیوں کی آماجگاہ تھا۔ فضا یہاں بھی صاف نہ تھی یہ دور بھی تقسیم کے ردِ عمل کا تختۂ مشق تھا۔ جس کی پوری تصویر پیش کرنا اپنے رِستے ہوئے ناسوروں سے خود پردہ اٹھانا ہے میں اس المناک تشریح کے لئے تیار نہیں۔ لیکن تقسیم کے اداکاروں کی عریانی بہر حال انسانوں کے لئے درسِ عبرت بنی رہے گی۔

اس پار کا تو کہنا ہی کیا۔ اس پار والوں نے تو رشتوں کو خود توڑا تھا اور اتحاد کی ہر شکل کے خلاف لڑے تھے لیکن اس پار کی بد مذاقیوں کی نہ جانے کتنی آندھیاں ہماری بلندیوں کو زمین بوس کر گئیں۔ وفاداری کے مطالبات زبان و تمدن کے رجعت پسندانہ انقلابات جداگانہ وحدانیت کے طعنے اور طبقاتی تصادم کے بیدار کرنے کے لئے خاموش تھپکے اور ایسے کتنے آوازے بلند ہوئے جن کی گونج آج تک باقی ہے۔

وفاداری کی روح

اصل میں یہ نفرت و غصہ کی آخری قسط تھی جو تقسیم کے کھاتوں سے برآمد کی۔ یہ آوازے لگانے والے اگر ٹھنڈے دل سے غور کرتے تو آسانی سے اس نتیجے پر پہنچ جاتے کہ ہند کی مذہبی اور طبقاتی نیرنگیوں کے باوجود ایک قوم ایسی طبعًا موجود ہے۔ جسکے اندر تاریخی اور وطنی نیرنگی ہے جسکے بغیر نہ مسلمان وفادار شہری ہو سکتا ہے اور نہ ہندو اور نہ کوئی دین دھرم والا۔ انہی مختلف اجزاء کی نئی ترتیب و تنظیم پر ایک صحت مند ذہنیت رکھنے والی متحدہ قومیت کا انحصار تھا جو وطن عزیز کی صحیح اور وفادار اور محب ہو سکتی تھی لیکن وفاداری کی یہ روح کوئی بہ جبر پیدا ہونے والی کیفیت نہیں۔ وفاداری

اُس گداز طبعی کا نام ہے جسے خلوص و صداقت کا جذبہ انسانی معاشرے میں پرورش کرتا ہے۔ خلوص و صداقت کی یہ کیفیت ہمسایوں کی بے ساختہ محبت اور حکومت کے حسنِ سلوک سے پیدا ہوتی ہے جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ وطن سے محبت محض ایک داخلی اور روایتی کیفیت ہے وہ لوگ انسان کے اس نفسیاتی زاویئے سے ناواقف ہیں کہ کوئی داخلی کیفیت خارج کے اثرات کے بغیر مکمل نہیں ہوسکتی۔

ایک چھوٹی سی مثال غالباً اس کو واضح کردے گی۔

(۱) فرض کیجئے اگر کسی ملک میں زید کی دس نسلیں پیدا ہوئیں اور وقت و ماحول کی ہزار ناسازگاریوں کے بعد ان کی داخلی کیفیت (حب الوطن) کبھی عصری حالات سے متاثر نہ ہوسکی تو اس نتیجے کی ذمہ داران نسلوں کی قدامت پرستی اور کم شعوری تھی لیکن گیارہویں نسل کے لئے لازمی نہیں کہ وہ نیا شعور اپنے ساتھ نہ لائے۔ وہ محسوس کرتی ہے کہ جس ملک میں وہ بستی ہے جس سوسائٹی میں وہ سانس لیتی ہے اور اس کے افراد جس ملک کے شہری ہیں اس ملک کے دوسرے بسنے والوں کی حقیقی محبت بھی انہیں حاصل ہے یا نہیں!؟ اور ان کا وہ بیگانہ دلکش تشخص جس کے گل بل پر وہ زندہ تھی وہ بھی محفوظ ہے یا نہیں!؟ اگر اس کا جواب نفی میں ہے تو وہ روحانی رشتہ جو ان کے اور مقدس وطن کے درمیان داخلیت کی بنیاد پر ہے ٹوٹ جائے گا اور اس کے بعد وہ گریز و فرار کے لئے مجبور ہوگی۔ جیسا کہ ہوا۔

ہندی مسلمان اور کلچرل وحدت کا مسئلہ

تقسیم کے بعد ہندی مسلمانوں کی جو پوزیشن ہو جاتی ہے اس پر زیادہ غور کرنے کی ضرورت نہیں، تقسیم کا سیلاب، جداگانہ انتخاب، جداگانہ حقوق اور دو قومی نظریہ ان کے ہر تعلقے کو بہا لے گیا۔ اور اب ان کی واضح پوزیشن یہ ہے کہ وہ ہندوستانی قوم کا ایک موثر اور ذی قدر جزو ہیں۔ فرقہ پرستی اور مذہبی بنیادوں پر اب یہاں کسی کو تعمیرِ قومی کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ جو اس اجتماع میں شریک ہیں اور جو یہاں بستے ہیں، ان کا ایک ہی مقصود ہے اور ایک ہی منزل! ان حقائق کو جانتے ہوئے بھی ایک شورِ قیامت بپا ہوا کہ

"مسلمانوں کو چاہیئے وہ خود کو الگ نہ دکھائیں اور کلچر میں ہندوؤں کے ساتھ شامل ہو جائیں"۔

ادھر یہ مطالبہ، ادھر صرف ایک جذبۂ فرار! — صرف ایک خوف زدہ رمیدگی، ؟ کلچر اور اس سے تعلق رکھنے والے مسائل قومی تعمیر کی ابتدائی منزلوں میں بڑی قیمت رکھتے ہیں۔ حاکمانہ جبر اور بزرگانہ استدلال سے یہ مسائل حل نہیں ہو سکتے۔ ان پر غور کرنے اور نتائج نکالنے کے لئے سکونِ فکر اور مخلصانہ جد و جہد کی ضرورت ہوا کرتی ہے۔ افسوس ان مسائل کو اضطرابی حالات میں چھیڑا گیا۔ ایسا کیوں ہوا!؟ مجھے دہرانے کی ضرورت نہیں۔ وہ دماغ بھی جو تمام عمر متحدہ قومیت کا خواب دیکھتے رہے تھے دو قومی نظریہ میں اپنے خواب کی تعبیر ڈھونڈنے لگے یہ ہم میں سے بعض کے لاشعوری تقاضے تھے جنہیں تقسیم کے ردِ عمل نے ناسور کی طرح ابھار دیا۔

آیئے ذرا اس مسئلہ پر ایک نظر ڈالیں اور دیکھیں کہ لوگ کس قدر واقعیت پرست ہیں اور کس قدر جذباتی!؟

کلچر کی تعریف

سیاست کی بازی گرانہ تعبیروں نے "کلچر" جیسے وسیع المعنی لفظ کو مبہم و محدود کر دیا ہے۔ جس چیز کو کلچر کہا جاتا ہے اس کی حقیقت اس سے کہیں زیادہ وسیع ہے۔

جرمنی اور انگریزی زبان میں لفظ کلچر کے معنی "تربیتِ نفس" کے ہیں اور کلچر کا بنیادی اثر یہ ہے کہ نفسِ انسانی کو مہذب و بلند کرے۔ تاکہ انسان کا داخلی و خارجی نشو و نما اس طرح ہو سکے کہ کوئی ترکیبی عنصر غیر متوازن نہ رہ جائے۔ نفسِ انسانی،،، کے تزکیئے و اصلاح اور خارجی اظہار کے جتنے ذرائع اور نظام ہو سکتے ہیں وہ تمام ذرائع و نظام "کلچر" سے وابستہ اور اس کی تعریف میں داخل ہیں۔

اس میں کسی قوم کے تمام انفرادی اور اجتماعی اعمال، رہن سہن کے طریق رسم و رواج، معاشی و سیاسی نظام تمام اخلاقی ادارے۔ ممتاز تخلیقی تقاضے۔ جنسی رجحانات، جمالیات نیز موروثی مافوق العادت روایات (مائی تھالوجی) اور نسلی امتیاز و عصبیت کے امتزاج سے مرتب ہونے والے زندگی کے اجتماعی طور طریق بھی شامل ہیں۔

ہندو مسلم کلچر کی وجہِ مشترک

اتنے گوناگوں رنگ اور خطوط ہیں۔ جن سے تمدن کی

مکمل تصویر بنتی ہے۔ ہر تمدن کا ایک محور ہوتا ہے جس کے گرد تمدن کی قندیل گردش کرتی رہتی ہے۔ ایشیائی تمدن کا مرکزی نقطہ جس کے چاروں طرف مشرقی کلچر گھومتا رہا اور آج بھی گردش کر رہا ہے وہ مورد فی فنشیات ہیں جو "روح" اور اس کی نیرنگیوں کی حامل ہیں۔ گویا ہندو اور مسلمانوں میں سب سے بڑی وجہ مشترک "روح سے تعلق ہے" اور یہ وجہ مشترک تقسیم کے بعد بھی فنا نہیں ہوئی ہے۔ نہ صرف ہند کے مسلمان بلکہ پاکستان کے مسلمانوں اور ہندوؤں کا کلچر بھی ایک ہے۔

ملاحظہ فرمائیے "پاکستان کا کلچر" از عبد الواحد جادہ پیما

"ہم میں سے ۹۰ فیصدی ہندو آبا و اجداد کی اولاد ہیں! علامہ اقبال کو تو اپنے برہمن نسل ہونے پر فخر تھا کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ ہم پاکستانیوں ہی کے آبا و اجداد ایرین کلچر کے جنم داتا تھے ٹیکسلا دار العلوم کے راج تھے اجنٹہ و پرشین امپائر کے معمار تھے۔ گندھارا مکتب فن کے فنکار تھے اور اگر وہ نہیں تھے تو کیا عرب یا جاپانی ان کے جنم داتا تھے؟"

یاد رہے کہ ہمارے کارناموں نے تاریخ عالم میں شہرۂ آفاق امتیاز حاصل کیا ہے مگر ہم ہیں کہ آج تک ان کے وارث بننے سے انکار کرتے رہے اور وہ صرف اس لئے کہ یہ سب کچھ ہم نے زمانۂ ماقبل اسلام میں حاصل کیا تھا لیکن مصریوں نے اہرام سے انکار کیا ہے؟ نہ عراقیوں نے دجلہ و فرات کی قدیم تہذیب کے ورثہ سے۔ ایرانیوں نے تو "اہرمن و یزدان" تک کو اسلام کا "شیطان و خدا" بنا لیا ہے۔ اور خود عربوں نے اسلام کے بعد بھی کعبہ کا نام کعبہ ہی رہنے دیا اور غیر عرب کو عجمی کہنا بھی ترک نہ کیا۔ لیکن نہ معلوم کیوں ہم ہی نے اپنے آپ کو اسلام کا "صدقہ" بنا کر اپنی ہزار ہا سال کے مایۂ ناز ماضی اور تخلیقی ورثہ کو دریا برد کر دیا ہے۔ اگر اسلام کا کلچری اقتضا یہی ہے جو میں سمجھتا ہوں کہ نہیں ہے۔ تو یقیناً "کلچری لا اسلامیت" کے معنی ہوں گے۔ ایسی بزم جہاں ہر کاسہ خالی ہو۔!؟ اب وقت آ گیا ہے کہ مغلی تاریخ کے اس صفحۂ خیر تصور سے ہم چھٹکارا پائیں اور اپنی ٹھکرائی ہوئی تاریخ کو جو دیگر اقوام کے لئے باعث ہزار رشک رہ چکی ہے اور جس کے تخلیقی کارنامے آج بھی تاریخ عالم کا سنہری باب ہیں پھر اپنے سینے سے لگا لیں۔

جو قوم اپنے قدیم ماضی کے تسلسل اور اس کے ساتھ اپنے احساس فخر کو کھو بیٹھتی ہے وہ قوم اپنے مستقبل کے تیقن اور اس کے اعتماد کو بھی ضائع کر دیتی ہے۔

تو گویا کلچر کی ایک اور بنیادی قدر یہ ہوئی کہ قطع نظر اس سے کہ فلاں یا فلاں تاریخی دور کے کارنامے کس مذہب کا کلمہ پڑھ کر سرانجام دیئے گئے۔ ہر کلچری وحدت کے لئے ضروری ہے کہ اپنے قدیم ماضی سے ذہنی تسلسل قائم کرے اور حتی الامکان اسے اپنائے ورنہ کلچر میں تمکنت پیدا نہیں ہو سکتی اور اس کی ارتقائی نوعیت بھی ختم ہو جاتی ہے"

مسلمانوں کی جداگانہ وحدت

اور اگر مسلمانوں کے کلچر کی ایک علیحدہ جزوی شکل بھی ہے اور وہ اس سے روحانی طور پر وابستہ رہنا چاہتے ہیں تو ایک لادینی جمہوری ریاست میں انہیں اس کی آزادی اسی طرح ملنی چاہیئے جس طرح عیسائیوں، سکھوں، اور دوسری ہندوستانی اقلیتوں کو مل سکتی ہے۔ ہر چند کہ میں اس کا قائل نہیں ہوں کہ مسلمانوں کی کوئی الگ تہذیبی زندگی ہے یا ہونی چاہیئے۔ اس مسئلہ میں آگے چل کر بتاؤں گا کہ وہ کونسا آدرش ہے جس کے سانچے میں ہم ایک تازہ دم قومیت ڈھال سکتے ہیں اور اس کے لئے کس قسم کے قدیم و جدید سر و سامان کی ضرورت ہے۔

"کلچر" کی بحث اگر یہیں تک محدود رہتی تو درست تھا لیکن بعض نے "زبان ......" کو کلچر کی بنیاد قرار دیدیا۔ ایک صاحب کا خیال ہے کہ "اردو زبان کی بنا پر مسلمان خود کو جداگانہ وحدانیت سمجھنے لگے ہیں مسلمانوں کو پہلا کام یہ کرنا ہوگا کہ وہ اردو سے الفت کرنی چھوڑ دیں" (۱)

آگے چل کر انہیں صاحب نے فرمایا

(۲) "اردو زبان ہندو مسلمانوں میں رابطہ و خیال کے تبادل میں ایک آہنی دیوار کی طرح حائل ہے" اسی ذیل میں انھوں نے چین کی لسانی وحدت کا تذکرہ کیا تھا جس کا مقصود یہ

تھا کہ چین کے مسلمانوں کی زبان چینی ہے۔ اسی طرح ہندی مسلمانوں کی زبان اگر ہندی ہو تو غلط نہیں ہے۔ (۳)

آیئے اب ان تینوں باتوں کے ذیل میں اختصار کے ساتھ زبان کے مسئلہ پر اجتماعی نقطۂ نظر سے یہ غور کریں کہ اس باب میں عام رائے کیا ہے۔ مسلمان کیا چاہتے ہیں؟ اور اردو کی صحیح پوزیشن کیا ہے۔ ۲۶ برس سے کانگریس کا کیا موقف رہا ہے اور اب ہند کی جمہوری دستور ساز اسمبلی کو اس باب میں کیا فیصلہ کرنا چاہیے۔

(۱) جہاں تک مسلمانوں کی "جداگانہ وحدانیت" کا سوال ہے اس کا تصور ہی غلط ہے اور اگر یہ کوئی جداگانہ وحدانیت ہے تو اس میں صرف مسلمان ہی نہیں، ہندو، پارسی، سکھ، عیسائی اور دوسری قومیں بھی شامل ہیں جو اردو زبان بولتی اور لکھتی ہیں۔ اس میں ہر قوم کے جہازی اور مل مزدور بھی شریک ہیں اور مہاتما گاندھی اور سر تیج بہادر سپرو مرحوم بھی، اس میں تارا چند بھی شامل ہیں اور جواہر لال جی بھی۔ اور وہ تمام ہندو مسلم سکھ پارسی اور دوسری قوموں کے عوام بھی جو صوبہ جاتی زبانوں کے ساتھ اردو زبان بولتے ہیں۔

(۲) متحدہ قومیت کا تصور محض سیاست نے پیدا نہیں کیا۔ اس کی داغ بیل اسی وقت پڑ گئی تھی جب مسلمان ہند میں آئے اور ان کی نئی نسلوں کا خمیر یہاں کی مقدس مٹی سے گندھنے لگا۔ ایرانی اور ہندی فنِ تعمیر کے میل نے ایک نئے حسن کو اُجاگر کیا۔ ایرانی مصوری اور موسیقی نے ہندی چترکاری اور سنگیت کے گلے میں باہیں ڈالیں اور ایرانی گل بوٹے اجنتا کی نقاشی سے بغلگیر ہوئے۔ اس ملن کا حسین و جمیل مظہر تاج محل ہے۔ یہ تمدنی ہم آہنگی کی سب سے بڑی مثال ہے۔ آریہ نسل ایرانیوں کو جو نسلی تعلق آریہ ورت اور اس کے کلچر سے تھا وہ ایک نئے حسن کی تخلیق کا سبب بنا۔

اور یہ گھلاؤ اور یہ ملاؤ بڑھتا ہی چلا گیا۔ یہاں تک کہ انھوں نے نسلی زبان بھی بھلا دی اور ایک نئی زبان کو قبول کر لیا جو نسلی اشتراک و اتحاد کے امتزاجی عمل سے پیدا ہوئی اور اردو اس عظیم الشان اجتماع کے قدرتی اتحاد کا نتیجہ ہے۔ تقریباً ساڑھے تین سو برس کے عرصہ میں اپنی فطری جاذبیت و قبولیت نے اسے ہندو مسلم عوام کی زبان بنا دیا ہے۔

لسانیات کے ماہر جانتے ہیں کہ اردو زبان میں ۸۰ فیصدی سنسکرت کے الفاظ کسی نہ کسی صورت میں موجود ہیں اور یہ تمام ہندوستان میں کسی نہ کسی شکل میں بولی جاتی ہے۔ آپ اسے اردو کہئے یا ہندی، ہندوستانی کہئے یا اور کوئی چوتھا نام رکھ لیجئے۔ لیکن یہی ایک ایسا رشتۂ اتحاد ہے جو ساری قوموں کو ملاتا ہے۔ اور جسے آپ ملک کی قومی زبان بنا سکتے ہیں۔

اردو صرف بولی نہیں ہے۔ جسے نظر انداز کیا جا سکے اردو کی بنیاد پر خود کو مسلمان "جداگانہ وحدانیت" تصور کرنے کا گناہ کبھی نہیں کر سکتے۔ اردو ادب کی قدیم و جدید تاریخ ہندو انشا پردازوں، افسانہ نگاروں اور شعراء کی ذہنی اور دماغی کاوش سے شاندار بنی ہے۔ رتن ناتھ سرشار، نسیم اور چکبست جیسے عظیم الشان شاعر . . . . . . اردو نے پیدا کئے اور عین اس وقت جب اس کی کشتی گرداب میں ہے، اس کے ناخدا رگھوپتی سہائے فراق، آنند نرائن ملاؔ، کرشن چندر، وشوا متر عادل، اوپندر ناتھ اشک، راجندر سنگھ بیدی، رامانند ساگر اور بہت سے ہندو سکھ مسلمان شعراء اور افسانہ نگار ہیں۔ اردو زبان کا ایک ترقی پسند اعلیٰ ادب ہے اقبال اور جوش جیسے عظیم المرتبت شاعر اور ابوالکلام آزاد جیسے حکیم و ادیب اس نے پیدا کئے ہیں۔

اس کی بزم میں سیاسی تنگدلی گناہ اور تہذیبی امتیاز پاپ ہے۔ اس کے آسمان پر جو ستارے چمک رہے ہیں اُن سے انسانیت منور ہے۔ اور ان کے دل انسانی وحدت کی جوت سے روشن ہیں۔

اردو سے ترکِ محبت کا مطالبہ ایک تہذیبی جبر ہے۔ یہ ایسا ہی ہے کہ جیسے مہاراشٹر، گجرات اور بنگال کے ہندوؤں کو ان کے زبان و ادب کے ساتھ محبت کرنے سے روکا جائے۔ ان سے کہا جائے کہ وہ ٹیگور، نذر الاسلام، بنکم چٹرجی، ہارو، نرشیر، جبر وار اور منادی جیسے شاعروں اور ادیبوں کو اپنے دل سے فراموش کر دیں!؟

(۲) اردو کو "آہنی دیوار" کہنا بھی تاریخی طور پر غلط ہے، ایک کھلا ہوا ظلم ہے، اردو زبان نے فرقہ پرستی کے پہاڑ کو کاٹ کر متحدہ قومیت کا ایک گنگا جمنی سنگم بنایا اور تمام صوبوں کے عوام کو ایک نئی بولی کی لڑیوں میں پرو دیا ہے۔ اردو نے مذہب اور فرقہ داری کے دبیز و دزنی حجابات کو چاک کرنے میں نمایاں امداد کی ہے اس کی محبت سے دست بردار ہونے کی دستاویز لکھوانا

ہرگز وطن دوستی نہیں۔

لسانی وحدت اور قومیت متحدہ

(۳) چین کی لسانی وحدت کی مثال ہندوستان پر صادق نہیں آتی۔ ہندوستان ایک عظیم الشان ملک ہے، وہ کئی تہذیبوں اور متعدد مذاہب کا سرچشمہ ہے۔ وہ ایک ساز ہزار پردہ ہے جس سے لاکھوں نغمے پھوٹتے ہیں۔ وہ ایک لازوال نغمہ ہے جس میں سینکڑوں لَے باہم دگر مل کر ایک مخصوص زمیتر زیر و بم پیدا کرتی ہیں۔

ملک کے مختلف حصوں میں مختلف بولیاں بولی جاتی ہیں مگر اردو ایک ایسی وسیع و مشترک زبان ہے جو ملک کے ہر قریب و بعید حصے میں عوام کے اظہار و بیان کا ذریعہ بنتی ہے۔ یہی دہلی میں بولی جاتی ہے یہی مشرقی پنجاب میں اور اسی زبان کا دائرۂ اثر مغربی و مشرقی پنجاب سندھ و سرحد، یوپی، بہار اور سی پی اور برار و دکن کو گھیرے ہوئے ہے؛

بنگال، مدراس اور بمبئی بھی اردو کے اثر سے بے خبر نہیں ہے۔ بمبئی ایک بین الاقوامی شہر ہے لیکن دہلی اور لکھنؤ کے بعد آج اسے اردو کا مرکز کہا جا سکتا ہے۔

ان مقامات پر اردو صرف بولی ہی کی حیثیت نہیں رکھتی بلکہ ان مقامات پر اس نے اپنا تخلیقی پرتو ڈالا ہے ملک کے ان حصوں نے اردو زبان کے بہترین شاعر اور ادیب پیدا کئے ہیں، اور یہاں سے اردو کے سینکڑوں اخبارات و رسائل شائع ہوتے ہیں بمبئی اور ہندوستان کے دوسرے حصوں میں عظیم الشان پبلشنگ ہاؤس ہیں جہاں سے بڑی تعداد میں کتابیں شائع ہوتی ہیں اور جن کے مالک ہندو ہیں۔ اردو کی وسعت اور دلکشی و تاثیر کا زندہ ثبوت وہ مسلمان ہندو اور سکھ ادیب و شاعر ہیں جن کی ذہنی اور روحانی کاوشوں نے قومی تعمیر میں سیاست دانوں سے بڑھ کر حصہ لیا ہے؛ صرف بمبئی شہر بلکہ گجرات کا وسیع علاقہ اردو شعراء و ادباء کا میدان عمل رہا ہے اور آج بھی ہے۔

اردو کی قوت جاذبہ

اردو زبان میں پذیرائی اور جذب کرنے کی ایک طبعی قوت ہے یہ ہر اجنبی عنصر کو اپنے وجود میں سمو لیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس میں گھلے ملے ۹۰ فیصدی سنسکرت کے شبد بھی سنسکرت کے لفظ نہیں معلوم ہوتے۔ سامراج، سماج، مُدرا، اندولن سنسکرتی کرانتی جاگرتی اور دسیوں نئے الفاظ آج اردو ہی کے الفاظ معلوم ہوتے ہیں۔ یہ وہ دلکش خصوصیات اور فطری اہلیتیں ہیں جن پر رتن ناتھ سرشار اور چکبست لوٹ ہوئے اور متاخر ہندو شعراء و ادباء کی ایک پوری نسل کے نام اس کی فہرست میں نظر آتے ہیں۔ معترضین کو دلائل کی روشنی میں یہ غور کرنا چاہئے کہ آج کل تمام ترقی پسند ہندو شعرا نے اردو ہی کو کیوں اپنے خیالات و محسوسات کے اظہار کا ذریعہ قرار دیا ہے۔؟

سیاسی جدوجہد کا منتہا "کلچر"

یہ یاد رکھنا چاہئے کہ تمام تر سیاسی جدوجہد (جس میں اقتصادی ماحول بھی شامل ہے) کا منتہا "کلچر" ہے سیاست تمدن کا ایک شعبہ ہے جس کی مساعی بھی تمدن کی حفاظت و ترقی پر منتج ہوتی ہیں۔ سیاسی مسائل کو کبھی تمدنی مسائل پر اہمیت نہیں دی جاتی۔

آزادی تو دنیا کے بعض حصوں میں غیر متمدن قبائل کو بھی حاصل ہے مگر آزادی ہی محض آزادی کا حاصل نہیں، آزادی کا مقصود کلچر اور کلچرل خود مختاری ہے۔ سیاسی جدوجہد کے پُر از مصائب میدانوں کو طے کرنے کے بعد اب ہم کلچر کی جنت بنانے کے لئے بڑھ رہے ہیں۔ تہذیب کی اس نئی جنت کو ہندو جنت اور مسلم جنت بنانے کا گناہ ہمیں نہیں کرنا چاہئے۔ ہمارا ستارۂ اقبال اب تاریکی کے جال سے آزاد ہو رہا ہے۔ اس کی امر جوت سنسار پر پڑ رہی ہے۔ دنیا ہمارے ایک ایک فعل کو بغور دیکھ رہی ہے، اور ایشیا کی مایوس و مجبور نگاہیں ہماری طرف اٹھ رہی ہیں۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم اس آدرش کو پیش نظر رکھیں جو ثقافتی روا داری اور ترقی پسندی سے مرکب کیا گیا تھا۔ ماضی نے جو امانت ہمارے سپرد کی ہے ہمیں اُسے زمانے کی حاسدانہ نگاہوں سے بھی بچانا ہے اور اپنی تنگ نظریوں سے بھی۔ اور کبھی نہ بھولنا چاہئے کہ آج کے ہندو و مسلمانوں کا کلچر ایک ہے۔ زبان ایک ہے وطن ایک ہے اور وطن کے وقار کی منزل بھی ایک ہے۔ اگرچہ تاریخ نے مختلف تمدنوں کے دھارے ملا کر یہ ایک دھارا بنا لیا ہے۔ اس سے

جو شاخیں پھوٹتی ہیں اُن کے بہاؤ کے کچھ منفرد رُخ بھی ہیں۔ ان منفرد رخوں کے بند باندھنا ترقی اور تخلیق کو روکنا ہے۔ یعنی کسی قوم کی منفرد کلچرل خصوصیات کو بہ جبر ترک کرانے کا ظلم بھی اصل میں جبریہ تبدیلیٔ مذہب ہی کے خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔

صوبہ جاتی زبانوں کی بقا اور ان کے ادب کی ترقی

میں تو ہمہ گیر اردو ہی نہیں، صوبہ جاتی زبانوں کی بقا اور ترقی کا بھی قائل ہوں۔ ہمارے ملک کی جتنی تہذیبی خصوصیات ہیں ان کے پنپنے کی پوری آزادی ہونی چاہئے۔ بنگالی، مرہٹی، گجراتی، تامل، تلیگو، ملیالم، کنیڑی وغیرہ اپنی مستقل شاعری و ادب رکھتی ہیں۔ اور انہیں نہیں مٹایا جا سکتا تو اردو زبان جو سنسکرت پر مبنی ہے اُسے کیوں کر مٹایا جا سکتا ہے

ایک نئی تحریک

ڈاکٹر کاٹجو گورنر مغربی بنگال نے اپنی ایک تازہ تقریر میں قومی زبان کے مسئلہ پر اظہار خیال کرتے ہوئے اپنے اس عقیدہ کو دُہرایا ہے کہ قومی زبان سنسکرت ہونی چاہئے۔

"علاقوں کی تمام زبانوں کا سرچشمہ مختلف حد تک اور بعض کا بڑی حد تک سنسکرت ہی ہے میری رائے میں یونیورسٹیوں میں سنسکرت کی تعلیم سے نہ صرف علاقائی زبانوں کو بے حد ترقی اور وسعت حاصل ہوگی بلکہ ایک الجھے ہوئے مسئلہ کا ایک متفقہ حل بھی اچھی طرح مل جائے گا۔

مجھے کوئی شبہ نہیں ہے کہ اگر اسکولوں اور کالجوں میں سنسکرت کی تعلیم کو وسعت دینے کے لئے کل ہند پیمانے پر سنجیدگی سے کوشش کریں تو مختلف علاقائی زبانوں پر سنسکرت کا اثر اس قدر غالب ہو جائیگا کہ بطور خود ہی ایک قومی زبان پیدا ہو جائے گی جس پر سب متفق ہونگے

ہندی اور خاص کر اردو کی طرف اشارہ:—

مجھے معلوم ہوا ہے کہ جب ہر شعبے میں علاقائی زبانوں کے حق میں جذبات بھڑک رہے ہیں یہ امید موہوم ہے کہ کسی ایک علاقہ کی زبان کو ہندوستان کی قومی زبان کی حیثیت سے قبول کر لیا جائے گا۔

(خطبۂ صدارت جلسۂ تقسیم اسناد ناگپور یونیورسٹی، ۲۰ر جنوری ۴۹ء)

تاریخ ماضی کی طرف جست نہیں لگا سکتی

یہ ایک نئی صدا ہے اور واحد ہے لیکن اکثریت کے قدامت پرست حلقوں کے لاشعوری تقاضوں کو ضرور اُبھارتی ہے۔ یہ ایسی صدا ہے جو اُن ترقی پذیر آدرشوں کی بلند نوائی سے ٹکراتی ہے جو صدیوں کی جاں فشانیوں کا نتیجہ ہیں یہ خیال ہمارے تمام متحدہ نظام ہائے عمل کو صفحہ سادہ بنا دیتا اور تصورات کو اور بھی مبہم و پیچیدہ کر دیتا ہے جسے ہم سمجھنے سے قاصر ہیں۔ یہ ماضی پرستی کا شاہکار ہے جس کی جگہ ہمارے ترقی پسند حال اور تیزی سے آنے والے مستقبل کے تصور کرنے میں نہیں ہے۔

سنسکرت جو علماء اور پیشواؤں کی زبان رہی کبھی پراچین ہند میں عوام کی زبان نہ بن سکی، آج اس کے قومی زبان بننے کے کیا امکانات ہو سکتے ہیں؟ علاقائی زبانوں میں اس کے جتنے عناصر ہیں ان کی ہیئت مختلف ہو چکی ہے اور تمام علاقائی زبانیں سنسکرت پر مبنی بھی نہیں ہیں۔ اس لئے وہ تعلیم کے بعد بھی خالص سنسکرت میں تبدیل نہیں ہو سکتیں۔ ہاں ان کو مٹا دینا مقصود ہے تو یہ ایک جداگانہ بات ہے۔

موجودہ ارتقائی دور میں جب سماج اپنے قومی دائرہ کو توڑ کر بین الاقوامی حدود تک وسیع ہو رہا ہے۔ پرانی تہذیب کے خول تحلیل ہو چکے ہیں اور ایک نئی عالمگیر تہذیب کے خوبصورت چہرے ڈھل رہے ہیں، ہندوستان کو رجعت کے اختیار کرنے میں نقصان رہے گا۔ اس کی پہلی ضرورت ارتقاء سے ہمدوش رہنا ہے۔ ماضی تو ماضی وہ اپنے پابہ رکاب حال پر بھی قناعت نہیں کر سکتا۔

یہ ارتقائی تقاضوں کے خلاف ہوگا کہ ۶ ہزار سال کی قدیم یا چودہ سو برس کی پرانی تہذیبوں کا احیاء کیا جائے سچ پوچھئے تو یہ انداز فکر ہی غلط ہے اگر ہندوستان و پاکستان کے چالیس کروڑ ہندو اور مسلمان متحد ہو کر اپنی تمام کوششوں کو بروئے کار لے آئیں تب بھی جو تاریخ بننے والی ہے ماضی کی طرف جست نہیں لگا سکتی۔

ارتقا کا تدریجی عمل

ہمارا شاندار ملک بے گنتی تہذیبی خزانوں کا مالک ہے سینکڑوں فلسفے اس کی مٹی میں دبے ہوئے ہیں اور ہم ثقافتی حیثیت میں دنیا کی کسی مہذب اور ترقی یافتہ قوم سے پیچھے نہیں ہیں جتنے عظیم فلسفوں کی آغوش میں ہماری روح نے تربیت پائی ہے۔ ان کے تقاضے بھی عظیم ہیں۔ اگر ان تقاضوں کو ہمیں پورا کرنا ہے تو ہمیں نہایت وسیع تہذیبی زاویۂ نگاہ قائم کرنا ہوگا۔

کلچر کی ترتیب یا تمدن کا احیاء ایک دو دن کی انسانی کوششوں کا نتیجہ نہیں ہوا کرتا۔ ارتقا کا تدریجی عمل صدیوں میں کلچر کو ایک مستقل ترتیب دیتا ہے۔ اسی طرح کسی تمدن کا احیاء ترتیب سے بھی زیادہ مشکل فریضہ ہے۔ کسی قدیم تمدن کو از سر نو بحالہ زندہ کرنے میں ہم رجعت کے جال میں گرفتار ہو سکتے ہیں اور ترقی پذیر فضاؤں میں پرواز سے محروم ہو کر حال و مستقبل کے رشتے سے کٹ جاتے ہیں۔ چونکہ ثقافتی ترتیب میں اقتصادی انقلاب بھی بہت کچھ کام کرتا ہے۔ اس لئے پرانے اقتصادی نظام کی قبول کی ہوئی ثقافت اس انقلابی اور اضطرابی دور میں جبکہ ہر قسم کی جاگیردارانہ اور ساہوکارانہ نظام تل پٹ ہو رہا ہے رائج کرنا اس زمانے کی قوتوں سے جنگ کرنا ہے۔

ہم ہندوستان والوں کو یہی زیبا ہے کہ کلچر اور ثقافت کی راہوں میں ہم جو بھی قدم اٹھائیں اپنی استطاعتوں کو دیکھ بھال کر اٹھائیں۔ ایسا نہ ہو کہ زمانے کی ترقی پذیر ضربیں قدم اٹھانے سے پہلے تاب رفتار کو ختم کر دیں۔

قانون کے ذریعہ کلچر کی ترتیب

لہٰذا کسی پرانے فرسودہ تمدن کا مطلق احیاء تو ممکن ہی نہیں زندگی کا ارتقائی عمل قدم قدم پر سد راہ بنے گا اور ہم دھندلے ماضی کا روشن حال سے پیوند نہیں لگا سکیں گے۔ میرے نزدیک کسی .... نئی ثقافت کی تخلیق یا قدیم کلچر کا احیاء حکمران قانون کے زور سے ممکن نہیں ہے۔ دفتریت اور اس کا خود ساز قانون ہمیشہ سے ایک ایسا جال رہا ہے کہ بڑی سے بڑی خلاق اور ضابطہ پسند شخصیت بھی بغیر پھنسے نہیں رہ سکتی اس لئے سرزمین ہند کی صوبہ جاتی اور مرکزی حکومتوں کا اس خیال میں مگن رہنا کہ وطن کے بہترین دماغوں سے بے پروا ہو کر محض حکمران نظام کے بل پر وہ کوئی معجزہ دکھا سکتی ہیں۔ خوش فہمی سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔

میرے خیال میں کلچر سے تعلق رکھنے والے نئے فعال، پرزے فٹ کئے بغیر وہ پرانی مشین کو نہیں چلا سکتے۔ جب تک انہیں ملک کے بہترین مفکر، شعراء، انشا پرداز، سائنس داں، فلسفی، یعنی علوم و فنون کے ماہرین کا تعاون حاصل نہ ہو۔

غلامی کے ورثہ میں جو قانون ہمیں ملا ہے وہ قانون ہماری سماجی و تمدنی ضرورتوں کی کفالت نہیں کرتا۔ لیکن اس کے علاوہ بھی۔ اگر کوئی دوسرا قانون آیا تو ظاہر ہے کہ اول تو وہ الہامی نہیں ہو سکتا اور جمہوری قانون کی حیثیت میں قطعی تو ہو ہی نہیں سکتا بہرحال قانون کی کوئی بھی نوعیت ہو۔ اس کے لئے عوام کی قبولیت شرط ہے۔

(میں اس مضمون کے تسلسل کو توڑ کر "قانون و اعتقاد" کے بیان پر پہلی قسط کو ختم کرتا ہوں)

قانون اور اعتقاد

انسانی سماج میں "قانون" اور "اعتقاد" ہی دو ایسے ذریعہ ہیں جن پر ضابطۂ تمدن کا دارومدار ہے۔ قانون کی ایک مادی اور اعتقاد کی ایک روحانی قدر ہے قانون کے ذریعہ عوام کی اجتماعی زندگی اور اس سے تعلق رکھنے والے مسئلوں کو حل کیا جاتا ہے ہر سچے شہری کا فرض ہے کہ قانون کا احترام کرے جو اس نے بنایا ہے اور اس کے لئے بنا ہے۔ لیکن یہ یاد رکھنا چاہیے کہ قانون روایتی طور پر ایک جبر کی کیفیت بھی اپنے اندر پوشیدہ رکھتا ہے۔ عوام قانون کا احترام کرتے ہیں۔ محبت نہیں کرتے۔ لاقانونیت سے اس لئے بچتے ہیں کہ وہ انہیں پیس دے گی۔ اس لئے نہیں بچتے کہ وہ قانون کو اپنی سوشل زندگی کی میزان خیر و شر سمجھتے ہیں!؟

قانون اور انسانی فطرت کے درمیانی خلا میں قانون شکن فطرت آسودہ رہتی ہے۔ جب تک یہ خلا مضبوط "اعتقاد" کے دار الامن میں تبدیل نہ ہو جائے۔ سماج امن و راحت سے محروم رہے گا۔ جب تک قانون پر عوام کا اعتقاد نہ ہو۔ قانون عوام کے دلوں میں پیوست نہ ہو جائے کوئی حکومتی ادارہ اپنے فرائض ادا نہیں کر سکتا اور ادا کرے گا تو ان کی تکمیل جبر کے بغیر نہ ہو سکے گی۔ اس قسم کی کامیابی قطعی عارضی ہوگی۔ لامحالہ

قانون کے نفاذ و اجراء پر نظرِ ثانی کرنی پڑے گی اور از سرِ نو تعمیر کی بنیادی اینٹ ہی کو درست کرنا ہوگا۔

تعمیر کی بنیادی اینٹ

تعمیرِ قانون کی بنیادی اینٹ یہ ہے کہ قانون پر عوام کا مضبوط اعتقاد ہو۔ اور یہ اعتقاد قانون کے ڈنڈے سے پیدا نہیں کیا جاسکتا۔ وہ قانون بنانے اور قانون کا نفاذ کرنے والے برسرِ اقتدار جمہوری اداروں کے اُس احساس سے پیدا ہوگا کہ عوام ان کے لئے نہیں، وہ عوام کے لئے ہیں" قانون کے لئے عوام نہیں، عوام کیلئے قانون ہے۔ انہیں عوام میں اس طرح ممتاز نہیں ہونا چاہیئے کہ وہ حاکم ہیں، اس طرح نمایاں ہونا چاہیئے کہ وہ عوام کی خدمت، امن و راحت اور تعمیر و ترقی کے ذمہ دار ہیں۔ ان کی ذمہ داریوں کے لاتعداد شعبے ہوں گے اور ہر شعبے میں قانون کی حفاظت "قانون سے نہیں اس اعتقاد کے ذریعہ کرنی ہوگی جو عوام کے داخلی و خارجی جذبہ قبول کا نتیجہ ہو۔ نتیجہ اسی وقت برآمد ہوسکتا ہے جب کسی ملک کے جمہوری ادارے اخلاقی معلم کے فرائض بھی ادا کریں۔ اور ان زنجیروں سے محفوظ رہیں جو انھیں دفتری اقتدار کے دام میں جکڑ سکتی ہیں۔

ایک ایک گوشہ میں انھیں بے شعوری اور جہل کے جراثیم ہلاک کرنے کے لئے علم کا آبحیات لے کر جانا پڑے گا۔ انسانیت، حب الوطنی، وفاداری، حقِ ہمسائگی۔ عوام و حکومت کے تعلقات، شہریت کے فرائض، مذہب، مختلف فرقوں کے باہمی ربط و تعلق، فرقہ پرستی، غلط مذہبیت، ذہنی غلامی، رسوم پرستی، جہل و تاریکی، غداری تمدنی اقدار کا تعارف، تحفظ، تبدل اور تعین اور اسی قسم کے دوسرے مسائل کا حل محض قانون کی گرہ میں نہیں "اعتقاد" کی مٹھی میں ہے۔

شدید ہنگامی ضرورتوں سے قطع نظر میرے نزدیک فرقہ پرستی اور ایسی ہی خطرناک تحریکوں کو پولس اور فوج کے ذریعہ دبا نا بھی کامیابی کا ایک عارضی و سطحی طریقہ ہے۔ قانون کے ذریعہ سیاسی و سماجی بیماریاں جڑ سے دور نہیں ہوسکتیں جب تک ان کے مٹانے کی کوشش قانون کی حدود سے باہر بھی نہ کی جائے جب تک فرقہ پرستی کے خلاف عوام کو تعلیم نہ دی جائے تاریخ اور مذہب کا صحیح تجزیہ کر کے انہیں فرقہ پرستی کی سمیت سے واقف نہ کرایا جائے۔ اُس کا زہر نہیں مر سکتا۔

قانون گمراہ عوام کو گرفتار کر کے جیل میں ڈال سکتا ہے لیکن ان کے غلط اور مجرمانہ افعال سے باز نہیں رکھ سکتا۔ قانون سزا دیتا ہے۔ اصلاح نہیں کرتا۔

سنگھی تحریک یا اسی قسم کی دوسری تخریبی تحریکات کو موثر اور پائیدار ادب کے ذریعہ عوام کے ذہنوں سے نکالنا ہوگا۔

اسی طرح میری آرزو ہے کہ ہندی مسلمانوں اور ان کی حکومت کے درمیان سے قانون کی ذات ہٹ جائے۔ اور اس کی جگہ اعتقاد لے لے ——!

اس حقیقت کو کبھی فراموش نہ کرنا چاہیئے کہ حاکمانہ غرور اور دفتری پندار، محکومیت اور بے چارگی سے پیدا ہوتا ہے۔ جمہوری ملک کے عوام نہ محکوم ہوتے ہیں اور نہ بے چارہ۔ یہ حکومت گر اور قانون ساز ہوتے ہیں۔ جبرِ قانون کا جادو ان پر نہ چلے گا ان کے تو قومی اور وطنی اعتقاد کو بیدار کرنا ہوگا۔ ورنہ پرانے اور نئے حاکموں میں کیا امتیاز رہے گا۔ اصل میں یہ تصور ہی غلط ہے کہ پرانے باغی بامِ عروج پر پہنچ گئے ہیں۔ یہ تصور زہرِ قاتل ہے اور ان کی عمر بھر کی قربانیوں کو ختم کر دیتا ہے۔

تاریخ میں باغی کی جاذبیت اسی وقت قائم رہ سکی ہے جب کہ باغی نے حاکم ہو کر تعمیری مسائل کے متعلق اپنا باغیانہ زاویۂ نگاہ باقی رکھا ہے۔ کیونکہ باغی محض حاکم بننے کے لئے باغی نہیں ہوتا، وہ تو پورے نظام سے بغاوت کرتا ہے اور جب تک پورا نظام نہ تبدیل ہو جائے وہ باغی ہی رہتا ہے۔ اور بلاشبہ جب تک فرسودہ و کہنہ نظام کی جگہ نیا اور توانا نظام نہ لے لے اُسے باغی ہی رہنا چاہیئے۔

اگر اُس نے نئی حیثیت سے پیدا شدہ تغافل کی جھونک میں اپنی باغیانہ جاذبیت کو خیر باد کہہ دیا تو پھر اُس کی ذات میں رہ کیا جائے گا ——!؟ دفتر کے چلانے والے تو انسانوں کے انبوہ میں پیدا ہوتے ہی رہتے ہیں لیکن باغی کی تخریبی فطرت میں بناؤ کا جو جذبہ پوشیدہ ہے اصل دولت تو وہ تعمیری جذبہ ہے اور وہ صدیوں کے بعد کسی وجود میں اُبھرتا ہے۔

"عوام" جو ہمیشہ اس کا محول رہے ہیں، جنہیں اُس نے بغاوت کے انداز سکھائے ہیں اُسے پہچانتے ہیں ان کے نفسیاتی عمل اور ردِ عمل سے آنکھ بند کرنا باغیانہ دانشوری کے خلاف ہے۔ حاکمانہ تیور عوام اور حکام کے درمیان ایک خطِ فاصل کھینچ دیتے ہیں اور ان کے مزاجوں میں خشونت

سبب بے تعلقی پیدا کرتے ہیں۔
پھر ایک دوسری حقیقت بھی فراموش نہ کرنی چاہئے کہ گذشتہ نصف صدی سے زیادہ انھیں ہمیشہ اجنبی حکام کے خلاف تعلیم دی گئی ہے۔ اس تعلیم کے اثرات سے وہ ابھی آزاد نہیں ہوئے ہیں۔ یعنی اجنبی اور جانے پہچانے حکام میں اگر کوئی نمایاں وجہ امتیاز ان کو دکھائی نہ دی تو وہ اور بھی ہاتھ سے نکل جائینگے۔
یہ ایک کمزور خیال ہے کہ حاکمانہ تیور شخصیت کے خال و خد میں نئی دلکشی پیدا کرنے کا سبب بنتے ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ اس نئی دلکشی کو بے رونق عوام کی عقیدت و محبت سے کیا تعلق!؟ غریبوں کے ہاتھوں کی موٹی موٹی بوٹی اور حاکمانہ تیوروں کے مابین کوئی نقش مماثلت نظر نہیں آتا۔!؟
اور اگر ہے تو ایک مضحکہ انگیز عدم توازن! ــــ سپاس متعلد

خطوط سے کسی آزاد اور عظیم انسان قوم کا باجبروت اور حسین چہرہ ہرگز نہیں بن سکتا۔
اس چہرہ کو بنانے کیلئے فطری اور اکتسابی تمام تر توانائی کو کام میں لانا ہوگا۔ تمام داخلی و خارجی توانائیاں خرچ کرنی ہوں گی۔ دل کے تازہ و شاداب خون سے اس میں رنگ بھرنے پڑیں گے۔ یعنی اپنی روح اس چہرہ کے خطوط میں حل کر دینی ہوگی ــــــ !؟
معتوب کے چہرہ کی تمام رونق فنا کی سیاہی میں تبدیل ہوگی۔ تب جا کر اس چہرہ پر نور مسکرائیگا
(باقی)

ارتقاء

زندگی اس محبوبۂ ہزار شیوہ کے مانند ہے جو ہر نفس ایک نئے جمال میں جلوہ گر ہو، نئے روپ میں ظاہر ہو، نئے لباس میں مسکرائے۔
آج دنیا تبدیل ہو رہی ہے، گویا زندگی، گویا وہ محبوبۂ ہزار شیوہ ان ہولناک حادثوں کے غسل کدے سے نکل کر حال کی لطیف و نازک چادر اوڑھے تعمیرِ نو کے توشہ خانے میں جا رہی ہے۔
یہ لطیف و نازک چادر عبوری دور کا عارضی لباس ہے، جب زندگی تعمیرِ نو کے توشہ خانے سے بن سنور کر نمودار ہوگی یہ حال کی حبابی چادر دیکھتے ہی دیکھتے تحلیل ہو جائے گی
جن خیالات کو کل بغاوت و سرکشی کا شاہکار سمجھا جاتا تھا آج رجعت پرستی کا انتزاع فائقہ ہیں، اور آج جن تصورات کو زندقہ و الحاد سے تعبیر کیا جا رہا ہے وہ حقیقت و بغاوت کے سرچشمے کا محض ملتبہ ہیں!
آنکھ اس مافوق البشر کو دیکھنا چاہتی ہے جو ارتقاء کی منزلِ مقصود معلوم کر سکے۔ کس کا جگر ہے جو اس کے بطن میں پوشیدہ معجزات کی ہمک بھی سن سکے!؟

ساغر

ذکیہ سلطانہ ساغر

اَمر جُوت

(۱) اندھیرا ہر طرف چھایا ہوا ہے
اندھیرا ہی ازل ہے اور اندھیرا ہی اَبد کی جوت ہے شاید
اسی تاریک چادر کی تہوں میں
عدم کے خواب سے تاریخ جاگی
اسی تاریک چادر میں تمدّن مسکرایا کھِلکھلایا جگمگایا
یہی تاریک چادر خاورِ تہذیب کا مشرق بنی آخر
یہی تاریک چادر اوڑھ کر حیوانیت نے روپ دھارن کر لئے لاکھوں
اسی تاریک چادر میں سمٹ کر گم ہوئی ہستی
یہی مشرق یہی مغرب
اندھیرا ہی ازل ہے اور اندھیرا ہی اَبد کی جوت ہے شاید

(۲) اندھیرے کی اسی دیوارِ چیں کو
کبھی سقراط کی حکمت نے ڈھایا
کبھی عیسیٰ کے خونِ گرم و تازہ نے کیا رنگیں
کبھی گوتم کی موسیقی کے سایوں نے اسے گھیرا
کبھی ضربِ محمدؐ نے کیا ٹکڑے
حُسینِ ابنِ علی کے خونِ ناحق کے تھپیڑوں سے کبھی کانپی کبھی لرزی
فضا میں ایک چنگاری سی تڑپی
اور اسکے بعد۔ اس کے بعد
چھائی پھر وہی منحوس تاریکی ۔ وہی منحوس تاریکی
اندھیرا ہی ازل ہے اور اندھیرا ہی اَبد کی جوت ہے شاید

(۳) اندھیرے کی جبینِ آہنی سے
یہ کیسی جوت پھوٹی مسکرائی جگمگائی
یہ کس کی مسکراہٹ سے بنی انسانیت گلشن
یہ کس نے ہند کی تاریک دُنیا کو کیا روشن
دکھی دُنیا ستاروں سے بنی دُلہن

ضمیرِ زندگی میں کروٹیں لینے لگی اک مستقل دھڑکن
ورق تاریخ نے تیزی سے اُلٹے
تغیّر لے کے سازو برگِ تعمیرِ جہاں آیا
بنی آدم کی دُنیا کو سجانے
دلِ سقراط و عیسیٰ جھوم اُٹھے
جبینِ بُدھ سے نکلی اک نئی جوت
اندھیرے ہی سے پھوٹا اک نیا سوت
اندھیرا اپنی ہستی کھو رہا ہے
اندھیرا نور میں حل ہو رہا ہے

(۴) نئے دیپک کی جوتی مسکرائی
جہاں کو کردیا روشن
جہاں کو ، مانوتا کو ، زندگی کو ، قلب وجاں کو کردیا روشن
سیہ خانے میں اپنا جال لے آئے نئے خاکے
نئی دُنیا بنانے کی تمنّا کے نئے خاکے
کہ پھر ظالم اندھیرا جنگجو حاسد اندھیرا
لئے تاریکیوں کے جال آیا
نگارِ امن کے دیپک پہ ٹوٹا
کبھی کرنوں کبھی دیپک کو لوٹا
زمیں سے آسماں تک موجِ خوں ہے
ابھی تک آدمی صیدِ زبوں ہے
اندھیرا ہی ازل ہے اور اندھیرا ہی ابد کی جوت ہے شاید

(۵) اگر سقراط کا دیپک ہے روشن
سراجِ ابنِ مریم گر ابد تک بجھ نہیں سکتا
کوئی جھونکا اگر شمعِ شہیدِ کربلا کو چھو نہیں سکتا
تو اے تاریک دُنیا تو اے مایوس انساں !
بجھا سکتی نہیں ہے کوئی آندھی
یوں ہی روشن رہے گی شمعِ گاندھی

ترجمہ
پنڈت پیارے لال شرما

موسیو پال رچرڈ

ہمالیہ کا پیغام

موسیو پال رچرڈ فرانسیسی عالم وفلسفی مشرق کی روحانی اور اخلاقی قدروں سے کافی متاثر تھے ...... ویدانتی کلچر نے انھیں اتنا موہ لیا تھا کہ وہ آربندو گھوش جیسی برگزیدہ ہستی کے ساتھ پانڈیچری میں کافی عرصہ تک رہے۔ اس کے بعد وہ ہمالیہ کے ایک برف آلود مقام پر کچھ مدت عزلت گزیں بھی رہے جہاں انھوں نے ایشیا اور ہند کے حال و مستقبل پر گہرا سوچ وچار کیا۔ ان کے یہ افکار "ہمالیہ کا پیغام مادر ہند کے نام" سے فرانسیسی زبان میں شائع ہوئے۔ جن کا ترجمہ انگریزی زبان میں کتابی صورت میں چھپ کر بےحد مقبول ہوا۔

ذیل میں ان کی کتاب کے اوّلین اوراق کا ترجمہ شائع کیا جاتا ہے جس کے ترجمہ کرنے والے پنڈت پیارے لال شرما (مرحوم) وزیر تعلیم یو۔پی ہیں جن کی یاد آج بھی سینکڑوں دلوں میں باقی ہے۔

ویدانتی تصوّرات کی نفاست وانفعالیت سے متاثر ہونے کے باوجود موسیو پال کا فکر منفی اور فرار پسند نہیں ہے ان کے سوچ میں شاداب روحانیت اور فکر کی زندگی وتابندگی پائی جاتی ہے۔ اس میں کیا شک ہے کہ متحد ایشیا ہی آنے والے زمانے میں تمام دنیا کے امن کا ضامن ہو سکتا ہے۔ اس اتحاد میں ہمارے وطن کو بہت بڑا رول ادا کرنا ہے۔ ایشیا کے مستقبل سے ہندستان کا مستقبل وابستہ ہے۔

ہر چند کہ ان خیالات کا محور زیادہ واضح نہیں ہے پھر بھی اثباتی وارتقائی کیفیت موجود ہے۔ اس سے زیادہ ہم روحانی مفکرین سے اور کیا توقع کر سکتے ہیں !؟

میرے پاس شرما جی کی یہ یادگار محفوظ تھی جسے میں ناظرین تک پہونچاتا ہوں۔

ساغر

کوہ ہمالیہ کا سلسلہ جہاں تک نظر جاتی ہے ان پہاڑوں کے سمندر میں ایک مسرتِ نامتناہی ہے۔ اور یہ سرور، یہ مسرت متحرک ہے جس طرح تیز نبض متحرک ہوتی ہے۔ یا جیسے اک زندہ لفظ، اور ایک زندگی بخشنے والی آواز۔ سنو! ———— وہ آواز تجھ کو کہتی ہے وہ مادرِ ہند سے خطاب کرتی ہے۔ بھارت ماتا اس پیغام کو سن جو ان بلندیوں سے تیرے لئے آیا ہے۔ جو ہمالیہ کا پیغام ہے۔ یہ آواز تجھ سے کہہ رہی ہے۔

وہ ساعت قریب ہے۔ وہ پر عظمت گھڑی جب تو آزاد ہوگی قریب ہے کہ تیری آرزو بر آئے، مگر صرف وہی نہیں جو تو نے چاہا تیری آرزو سے بہت زیادہ، بہت ارفع، زیادہ بیّن، اور واضح، زیادہ متحرک وہ کسی سے مغلوب نہ ہونے والی آرزو حتیٰ کہ تو بھی اس کی طاقت سے مجبور ہوگی!

یورپ کی قدیم روح کے ساتھ ساتھ اس کا خاتمہ ہو رہا ہے

یورپ اور اس کے مقبوضات کے ساتھ ساتھ یہ رخصت ہو رہی ہے۔ جب جسم ہوتا ہے تو اس کا کوئی عضو کب بچ سکتا ہے تم اسے کسی سلطنت کا خاتمہ نہیں بلکہ یورپ کی سلطنت کا خاتمہ سمجھو اس پر غنیمت نہ بیچ نہ اس کی تقلید کر البتہ اس سے اپنا ورثہ حاصل کر اس سے سیکھ کر تجھے کیا کرنا چاہیے (دنیا کے لئے) نور اور روشنی دے اور یہ بھی سیکھ کر تجھے کیا نہ کرنا چاہیے کہ تو اضمحلال و انحطاط سے محفوظ رہے۔

جو گذر گیا اسے خیر باد کہہ اور جو آئندہ سامنے آئے اسکی طرف رجوع ہونا وہی سوچ جو ایک جگہ ڈوبتی ہے تو ایشیا کی جانب اُٹھتی ہے گویا وہ ایشیا کو جگانے آ رہی ہے۔ وہی آفتاب جو گذرے ہوئے دن میں مشرق سے گذر کر مغرب کی طرف دورہ کر رہا تھا لیکن اب وہ یہاں نمودار ہوتا ہے اگر صبح صادق کا نظارہ دیکھنا ہے تو ایشیا کی طرف متوجہ ہو جاؤ۔

پیش از زمانہ کی وہی حرکت جس نے یورپ سے اونچا ہوتے وقت ایشیا کو جھکا دیا تھا اب یورپ کو جھکا رہی ہے اور ایشیا کو اٹھا دے، یورپ کا زوال، ایشیا کا عروج، مساوات کے یہ دو پہلو ہیں اور انہی کے ذریعہ اقوام عالم کی تقدیروں کا عقدہ حل ہوگا۔ دروازہ کے دو لوگوں کو اٹھ کھل رہے ہیں۔ یہ دروازہ تمھارے مستقبل کا باب آرزو ہے۔ ایک در تاریکی میں ہے دوسرا روشنی میں۔

"دختر ایشیا" (مادر ہند) تم اس لئے خودی کی عادت چھوڑ دو کہ کوئی قوم اور کوئی انسان تنہا اپنے لئے زندہ نہیں رہتا اور نہ کوئی انسان یا قوم زندہ رہ سکتی ہے جب تک کہ وہ اپنے سے اونچی بلندی کو نہ دیکھے۔ اقوام یورپ کی طاقت کا ایک سبب یہ تھا کہ زندہ یورپی جذبہ اُن سب پر حاوی اور اُن سب میں جاری تھا۔ اب ان کا خاتمہ اس لئے ہو رہا ہے کہ وہ اُس اجتماعی جذبہ اور اُس یورپی حب الوطنی میں قاصر رہیں۔

ایشیا کی قومیں زندہ رہیں گی وہ مضبوط اور آزاد ہو کر زندہ رہیں گی لیکن صرف اس وقت جب اُن سب میں یہی اجتماعی جذبہ اور ایشیا کی حب الوطنی، کی روح زندہ ہوگی۔

ایشیا والے یعنی ہندوستان، چین، جاپان، فارس، عرب کے شہری تو مجھے اس وقت سب جگہ نظر آتے ہیں لیکن ایشیا کے شہری ایشیا کے فرزند کہاں ہیں؟

ایشیا کہاں ہے؟

میں ایشیا والے تو ہر جگہ دیکھتا ہوں لیکن ایشیائی کہاں ہیں؟

وہ کہاں ہیں جن کی نگاہ ایشیا کی طرف لگی ہو اور جنھیں کثرت میں وحدت کا احساس ہو، وہ ایشیا جو تین نسلوں کا گہوارہ پانچ مذہبوں کی عبادت گاہ اور سات سلطنتوں کی سرزمین ہے یہ وہی سات سلطنتیں ہیں جو کل بھائیوں کی طرح ملکر "ایک" ہونے والی ہیں۔

وہ کہاں ہیں جن کی نگاہ ایشیا کی طرف لگی ہو، وہ ایشیا جو تمام افکار عالیہ اعلیٰ خیالات کا ایک گلدستہ ہے۔ مسیحی ایشیا شمال میں اسلامی ایشیا مغرب میں، بودھ کی ایشیا جنوب میں کنفیوشس کی ایشیا مشرق میں، ویدوں کی ایشیا اسی جگہ رہ جاتی ایشیا سب جگہ

وہ کہاں ہیں جن کی نگاہ ایشیا کی طرف لگی ہوئی ہو وہ ایشیا جہاں نصف بنی نوع انسان آباد ہیں وہ ایشیا جو اس وقت غلام ہے مگر آئندہ آزاد ہوگی وہ ایشیا جس کا تعلق اقوام مغرب سے طاقت کے زور سے ہے اور وہ اس لئے آزاد ہوگی کہ محبت سے اُن کے سامنے جھکے۔

وہ کہاں ہیں جن کی نگاہ ایشیا کی طرف لگی ہوئی ہے؟ وہ جو صرف روح میں اس وقت ایک ہے اور جس کو اس وجہ سے متحد ہونا چاہئے کہ اس روح کا ظہور ہو اور اس ظہور سے دنیا پُر نور ہو کیونکہ ایشیا کے اتحاد پر دنیا کے اتحاد کا انحصار ہے۔

وہ کہاں ہیں جن کی نگاہ ایشیا کی طرف لگی ہے؟ وہ ایشیا جسے قیامت نے "مادر عظیم" کا خطاب عطا کیا ہے۔

مادر ہند! تو ایشیا کا دل ہے چین اس کا دماغ اور جاپان تیرا مضبوط ہاتھ ہے، ان سب سے علیحدہ تم کس طرح زندہ رہوگے!؟

بالکل اسی طرح جس طرح یورپ کی کسی قوم کی تقدیر یورپ کی تقدیر سے علیحدہ نہیں ہو سکتی۔ تمھاری تقدیر بھی ایشیا کی تقدیر سے علیحدہ نہیں کی جا سکتی۔ تمھارا سوال صرف تمھارا سوال ہی نہیں ہے وہ ساری ایشیا کا سوال ہے۔

یورپ کے لئے ایشیا ایک تقسیم شدہ شکار ہے اس غرض سے کہ وہ یورپ کا شکار نہ بنے اسے چاہئے کہ وہ یورپ کے مقابلے میں ایک ہو جائے آزادی اور اتحاد ایشیا کا سہارا ہے ایشیا کی نئی تہذیب ہمارا پروگرام ہے اور اقوام ایشیا کی انجمنیں ہمارا طریق کار، مادر ہند اس معیار کی وسعت کے لحاظ سے اپنی روح کا سواز نہ کر۔

اور اب تم ماضی کے معنی سمجھو، صدیوں تک تم مردہ صورت

میں زندہ رہیں، غلامی کی تنگ قبر میں زندہ رہیں لیکن وہ قبر تمہارے لیے نئی زندگی کا گہوارہ تھی، جب کبھی بھی وقت آیا تمہارے پیغامبر نمودار ہوئے۔ انھوں نے تم سے کہا، قبر سے باہر آؤ، لیکن پہلے اُن رسیوں کو جن سے تمہارے اعضا جکڑے ہوئے ہیں پھینک دو، اور اپنے پیکر کو ان کی نجاست سے پاک کرلو۔"

اُنہوں نے تم سے کہا "پہلے اندرونی آزادی حاصل کرلو، بیرونی آزادی حاصل ہوجائیگی۔ لیکن انکی آواز یا تو صدا بہ صحرا رہی یا قیدخانوں کے دریعہ اس آواز کا گلہ گھونٹ دیا گیا۔ تاہم تمہاری روح اس آواز کو سُن سکتی تھی

دوسرے پیغامبر نمودار ہوتے ہیں، ان میں سے کچھ کہتے ہیں کہ اپنی زنجیروں کو بجائے توڑنے کے ڈھیلا کرلو، اور کچھ کہتے ہیں کہ "اپنا جوا سیدھا کرو، اور اگر نہ کرسکو تو اس کا خاتمہ کردو۔" اصلاح ہو نہیں تو خاتمہ" لیکن تمہاری روح اپنی خاموشی میں ایک اور آواز سُن رہی ہے اور یہ آواز کہتی ہے "جنہوں نے تمہیں پہلے جگایا وہ جھوٹے نہ تھے، کوئی مردہ جب تک کھڑا نہ ہو، قبر سے باہر نہیں نکل سکتا۔ اس دورِ جدید کے لئے جو تمہارے سامنے آرہا ہے۔ تیاریاں کرو۔"

جنھوں نے یہ کوشش کی کہ وہ زیادہ آزادی کی طرف تمہاری رہنمائی کریں وہ تمہاری زیادہ مصیبت اور بدنامی کا باعث ہے اور جنھوں نے تمھیں اس کا سبق پڑھایا انھوں نے بغیر جانے تمھیں بغاوت کی طرف پہنچایا لیکن وہ جو یہ خیال کرتے ہیں کہ بغاوت میں تمہاری رہنمائی کرینگے وہ بھی اپنی باری میں تمھیں ایسی جگہ لے جارہے ہیں وہاں وہ تمھیں لے جانا نہیں چاہتے۔ سب ہی تمھیں ایک دوسری منزل کی طرف لے جارہے ہیں جو منزل نہیں ہے تمہاری تقدیر کی حقیقی منزل ہے۔

وہ منزل تمہاری نئی زندگی کی منزل ہے نئی تعمیر کی منزل ہے، نئی زندگی میں نئی ساخت کی منزل ہے اور اس ساخت کے لئے اگر ضرورت ہوئی تو تمہیں پہلے گھاٹی میں پڑنا ہوگا۔ بھٹی تمھیں چلنا ہوگا۔ غرض تمہارے لیے انتشار کا زمانہ آئے گا ــــ وہ انتشار جس سے نئی، صاف اور آزاد دنیا پیدا ہوتی ہے

تم اپنے مستقبل میں خوشی سے داخل ہوجاؤ اگر یہ نہیں چاہتیں کہ زبردستی داخل کی جاؤ۔ تم اس میں داخل ہوجاؤ لیکن اس طرح نہیں کہ تمہاری حسرت بھری نگاہ ماضی کی طرف مڑ مڑ کر دیکھتی رہے۔

اس بات پر نازاں نہ ہونا کہ تم کیا تھیں کیونکہ ایک شاندار ماضی سے زیادہ بوجھ اور کوئی نہیں ہوتا۔ تم اس میں پابند نہ ہوجانا زمانۂ حال کی کوئی چیز بھی اتنا خراب نہیں کرتی جتنا کہ مردہ ماضی کی بچی ہوئی خاک خراب کرتی ہے۔

تم کہتی ہو میری تہذیب دنیا کی تہذیبوں میں سب سے زیادہ شاندار تھی" اس سے کیا حاصل؟ جب کہ وہ اب نہیں ہے اور جو آنے والی ہے وہ ابھی تک نہیں آئی۔ "جو تھا" اور "جو ہے" میں فرق ہے، صرف باقی رہ جانے کا نام زندہ ہونا نہیں ہوتا۔

تم کہتی ہو "میرے شاستر میرے راہ نما ہیں اور میرے وید میری بنیاد ہیں۔ دائمی وید ہر ایک زمانے میں کہے جاتے ہیں اور ان کے شاستروں کا خاتمہ کبھی نہیں ہوتا۔

اپنے رشیوں کو نئے سرے سے لکھنے کی اجازت دو۔
اپنے عارفوں کو نئے راگ گانے دو

تم "شیو" کی پرستش کرتی ہو۔ جو ہلاکت اور حیات تازہ کا دیوتا ہے جو ان تمام اشیا کو جن کی تجدید ناممکن ہو ضائع کردیتا ہے۔ کیا تمہاری یہ خواہش نہیں ہوگی کہ وہ تمہاری تجدید کرے؟ یورپ کا "حال" تو گذر رہا ہے اور تم چاہتی ہو کہ تمہارا "ماضی" باقی رہے وہی طاقت جو ایک کو نکال رہی ہے دوسرے کو بھی خارج کرتی ہے۔ اور یہ مضبوط سے مضبوط ہاتھوں سے نکلا جارہا ہے جسے کوئی بچا نہیں سکتا۔

مستقبل کا عطیہ اس کو نہیں مل سکتا جو بیشتر اپنی قربانی نہیں دیتا۔ جتنی عظیم الشان قربانی ہوگی اتنا ہی بیش بہا عطیہ ہوگا اگر تم حیات تازہ چاہتی ہو تو اپنے کل ماضی کی قربانی ادا کرو۔

ایشیا کے ایک گم شدہ جزیرہ کی چھوٹی سی قوم نے اپنے سی صد سالہ ماضی کی مکمل قربانی مستقبل کے لئے پیش کی اور وہ آزاد و مضبوط ہو کر تاریخ کی تازہ صدیوں میں داخل ہوئی، اے عظیم الشان قوم! تو بھی اپنے ہزار ہا سالہ ماضی سے نکل!

اپنے غیر مروجہ طریقوں اپنی قدیم روایات اپنی روح کو مقید کرنے والی رسموں، اپنے ضابطوں اپنے بند فیصلوں والی ہندی خاتون اپنی آہنی زنجیروں اور اپنی ذاتوں سے باہر آ ـــ!

زمانہ ماضی میں وہ سچی اور زندہ صورتیں تھیں، اور ان میں اتنی ہی لچک تھی جتنی کہ زندگی میں ہوتی ہے۔ لیکن آج وہ جھوٹی اور مردہ رسموں کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں، وہ ایسی اکڑ گئی ہیں جیسے نعش

اکثر جاتی ہے
تم کس طرح زندہ رہ سکتی ہو وہ تمہارے جسم کے بند نہیں ہیں بندشیں بن گئی ہیں، مختلف اعضا کی تمیز نہیں رہیں، اُن کی تقسیم جدائی اور علیحدگی بن گئی ہے۔

اس طرح تقسیم شدہ جسم ہو کر تم کس طرح زندہ رہ سکتی ہو؟ جسم کو آزاد کر، اس کے خون کو تمام رگوں میں آزادی اور خوشی سے دورہ کرنے دو، اپنی ذات پات کی بندشیں توڑ دو اور ایک دوسرے میں شامل ہو جاؤ، پھر تم یقیناً زندہ ہو گی جب موت سے وابستہ نہ ہو گی

ایک قوم کی حیثیت سے تم اس وقت زندہ رہو گی جب بنی نوع انسان کے خلاف گناہ کرنا ترک کر دو گی۔ کیوں ایک انسان کی تذلیل بنی نوع انسان کی تذلیل ہے۔ تم نے انسانوں کو "ہریجن" بنا لیا اس لئے دوسرے انسانوں نے تمہیں "ہریجن" بنا لیا۔ قومی "خودی" کا خیال کافی نہ تھا، صوبہ کے لحاظ سے "خودی" کا خیال بھی تمہارے لئے بے حد وسیع تھا۔ تم خودی کے انتہائی تنگ خیال "ذات کی خودی" میں ڈوب گئیں!

محبت میں زندگی بسر کرو پھر تم یقیناً زندہ رہو گی۔
اتفاق سارے ایشیا ہی کا نعرہ نہیں ہے سارے ہندوستان کا بھی نعرہ ہے۔ یہی مکتی یا نجات، یہی مکتی یا نجات ہندوستان اور ایشیا کے لئے ہے۔

اقوام اور نسلوں میں تو مساوات کا دعویٰ کرتی ہو اور وہی مساوات خود ذاتوں میں روا نہیں رکھتیں۔ تم اقوام کی ہمشیرہ اس وقت بنو گی جب تمہارے فرزند آپس میں بھائی بن جائیں گے۔ اور تمہاری بیٹیاں ان کی بہن اور برابر کی حقدار!

تمہاری بیٹیاں اندر غلامی میں رکھی جاتی ہیں۔ تو تمہارے بیٹے باہر غلام بنا کر کیوں نہ رکھے جائیں؛ جب دنیا میں تمہاری عورتیں سب سے زیادہ مغلوبیت کی حالت میں ہوں تو تمہاری قوم کی تقدیر بھی وہی کیوں نہ ہو؟

مستورات اور ان کی قوم کے مابین ایک پوشیدہ اور قریبی تقدیری رشتہ ہوتا ہے۔ قوم کی حیثیت ماں کی سی حیثیت ہے۔ اور وہ مستورات میں شمار کی جاتی ہے۔ جس قوم میں عورتوں کے ساتھ غلاموں کا سا سلوک ہوتا ہے وہ قوم خود غلام بن جاتی ہے۔

تاثرات

احمد ریاض

اب بھی اک پرویز کا دینگے ساتھ یہ ظالم دنیا والے — ہیں بے ثروت تم بے ہمت کون پرائی بپتا ٹالے

وقت کہاں لے آیا مجھ کو کیا سوچا کیا دیکھ رہا ہوں — خرمن کو بجلی کا سہارا گلچیں کلیوں کے رکھوالے

طوفاں کے بے مہر تھپیڑے ساحل تک کیوں پہنچائینگے — جب خود ناؤ ڈبونے نکلے کشتی والے ساحل والے

دونوں ہی احساسِ نازک نازک چلمن نوچ رہے ہیں — کٹیاؤں کے گھور اندھیرے محلوں کے زرکار اُجالے

آپ کا تاج و تخت سلامت آپ کو اوجِ بخت مبارک

راہوں میں دم توڑ رہے ہیں مائیں بہنیں بچّے بالے

اختر ہوشیارپوری

ساقی

وہ ابر اُٹھا وہ بُوندیں آئیں وہ دل ہوا نغمہ بار ساقی
ادھر بھی لا جام گھول کر ہم پئیں غمِ روزگار ساقی

یہ دورِ فصلِ بہار ساقی نہ آئیگا بار بار ساقی
جو ہو کے مایوس جا چکے ہیں انہیں خدارا پکار ساقی

کلی کلی مسکرا اٹھی ہے روش روش گدگدا اُٹھی ہے
گلوں کو جھولا جھلاتی آئی ہے نو عروسِ بہار ساقی

مجھے خبر ہے گلوں کے پردے میں پل رہے ہیں ہزار کانٹے
تری نگاہوں کو جانتا ہوں نہ دے فریبِ بہار ساقی

یہ مانتا ہوں کہ تیرے ساغر سے زندگی خود چھلک رہی ہے
ترے لبوں کے مگر مقابل کہاں مئے غم شکار ساقی

جہاں کی رفتار کہہ رہی ہے پرانے شیشے نہ ساتھ دیں گے
بجائے مے کے اُفق سے پھوٹیگا خون کا آبشار ساقی

نظامِ عالم بدل چکا ہے اُلٹ چکی ہے بساطِ ہستی
اگر یہی رنگِ انجمن ہے تو کیا ترا اعتبار ساقی

نہ کیوں ستاروں کی ہم رگوں سے کشید کرلیں شراب خود ہی
کہ صبح تو ہو چلی ہے کون اب ترا کرے انتظار ساقی

نہ وہ ستاروں میں نور باقی نہ وہ گلستاں میں مستیاں ہیں
تری نگاہوں میں ڈھونڈتا ہے جو کھو چکا ہے بہار ساقی

انہیں سے اختر بنیں گے اک دن انہیں سے غنچے کھلیں گے اک دن
دعا کے مارے جو تجھ کو پہنا رہے ہیں اشکوں کے ہار ساقی

کرشن چندر

کہانی کی کہانی

ایک روز میں نے کہانی کو بڑے خوب صورت کپڑے پہنائے، اسے پشمینے کا فرن پہنایا جس پر کشمیری کاریگروں نے رنگا رنگ نازک بیل بوٹے کاڑھے تھے۔ اُس کی گردن میں سرخ موتیوں کی سنگلڑی پہنائی۔ اُس کی آنکھوں میں کاجل لگایا۔ اُس کے بال سنوارے، اُس کے ماتھے پر افشاں چُن دی۔ اُس کے پاؤں میں خلخال باندھ دیئے اور اُس کے ہاتھ میں ایک دَف دے کے اُسے اپنی وادی میں بھیج دیا۔

کہانی بہت جلد واپس چلی آئی پژمردہ۔ پریشان۔ حیران دل برداشتہ، اُس کا چہرہ زرد تھا۔ بال اُلجھے ہوئے فرن جگہ جگہ سے پھٹا ہوا۔ آنکھوں کا کاجل کافور تھا۔ خلخال بے آواز تھے۔

میں نے گھبرا کے پوچھا۔ کیا ہوا۔ وہاں تو ایسا استقبال تمہارا کبھی نہ کیا گیا تھا۔ سبھی راہ میں آنکھیں بچھائے تمہارے منتظر رہتے تھے چرواہوں سے بادشاہوں تک سبھی تمہارے دلکش، رومانی، رنگین گیت سننے کے لئے بے قرار رہتے تھے، جلدی کہو۔ وہاں ایسا سلوک تمہارے ساتھ کس نے کیا۔

کہانی بولی۔ تمہاری وادی میں آج کوئی میرے میٹھے گیت سننے کے لئے تیار نہیں ہے۔ ڈل کے کنارے چھوٹے چھوٹے بچے فوجی قواعد کا کھیل کھیل رہے ہیں۔ عورتیں چوک میں کھڑی ہو کر سنتریوں کی طرح پہرہ دے رہی ہیں۔ کاریگر کرگھوں پر نئے کشمیر کا تانا بانا بُن رہے تھے۔ کسی کو فرصت نہیں ہے کہ میرے خوبصورت مکھڑے کو دیکھے۔ میرے ہونٹوں سے پھولوں کی طرح کھلتے ہوئے گیتوں کو سُنے۔ میرے پاؤں کے نازک خلخالوں کی نقرئی جھنکار کو سُنے۔ مجھے وہاں سے واپس آنا پڑا۔

میں نے کہا۔ تو تم محاذِ جنگ پر گئی ہوتیں۔

کہانی بولی۔ میں وہاں بھی گئی تھی۔ ایک پہاڑی درّے پر پرویز مورچہ لگائے دبکے بیٹھا تھا۔ اُسکے سامنے دوسرے درّے پر رحمت خاں مورچہ جمائے بیٹھا تھا۔ دونوں ایک ہی ملک کے رہنے والے تھے۔ ایک بارہ مولے کا خوجہ تھا۔ دوسرا پونچھ کا سدھن تھا۔ اور اب دونوں ایک دوسرے کی جان کے پیاسے ہو رہے تھے۔

پرویز بولا۔ مجھے تمہارے حسین گیت نہیں چاہئیں، میرے سامنے جلتا ہوا بارہ مولا ہے۔ میری چھوٹی بہن کی دریدہ عصمت ہے کھمبے پر لٹکی ہوئی مقبول شیروانی کی لاش ہے۔ میرے سامنے سے ہٹ جاؤ۔

دوسرے درّے سے رحمت خاں نے کہا۔ میں ریاست پونچھ کا سدھن ہوں، پلندری کا رہنے والا۔ پلندری جسے میرے دشمنوں نے بمباری کر کے تباہ و برباد کر دیا ہے، جانتی ہو ہم لوگ تہذیبی کلچری ثقافتی اعتبار سے پنجابی مسلمانوں کا ایک حصّہ ہیں۔ پرویز سے میری کوئی یگانگت نہیں ہے۔ میرے سامنے سے ہٹ جاؤ۔

آر پار۔ پرویز اور رحمت خاں کے مورچے تھے۔ بیچ میں نیلم کے نگینے کی طرح چمکتی ہوئی ایک وادی تھی۔ میں نیچے وادی میں اتر گئی لیکن وہاں کوئی نہ تھا۔ گھر اُجڑے اور ویران پڑے تھے۔ کھیتوں میں بیل ہل سے جُتے جُتے مر گئے تھے چشموں پر پانی کے گھڑے بھرے ہوئے تھے۔ لیکن وہ چرواہیاں کہاں تھیں۔ جو انھیں اپنے سروں پر اٹھائے اپنی بھیگی پلکیں جھکائے گھومتی ہوئی پگڈنڈی کے موڑ پر مرغابیوں کی ڈار کی طرح اُڑتی اُڑتی چلی جاتیں۔ میں اکیلی ہی کھڑی کھڑی وہاں ایک چشمے کے کنارے دَف بجانے لگی۔ اتنے میں دو آدمی رائفل لئے کہیں سے نکل آئے ایک نے میرا ہاتھ زور سے پکڑ لیا۔

میں نے کہا۔ مجھے چھوڑ دو۔ میں تمہیں بڑے خوب صورت گیت سناؤں گی۔ دَف پر ناچوں گی۔۔

وہ اک بڑی ظالمانہ ہنسی ہنس کے بولا۔ ہاں، ہاں گیت بھی

سنیں گے ۔ ابھی پہلے تیری چیخیں تو سن لیں ۔

پھر دوسرے آدمی نے بھی مجھے پکڑ لیا اور وہ مجھے اپنی طرف گھسیٹنے لگا ۔ اور میں ان دونوں کے ہاتھوں میں یکایک کاغذ کے پرزے کی طرح ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی اور چرمرا کر زمین پر گر پڑی اور وہ مجھے یوں اپنی ہیئت تبدیل کرتے دیکھ کر بڑے گھبرائے اور وہاں سے بھاگ گئے ۔

اسی کشمکش میں میرا قرن پھٹ گیا ۔ اور خلخال ٹوٹ گئے اور میرے ماتھے کی افشاں نوچ ڈالی گئی ۔ یہ دیکھو ۔ میں اب تمھاری وادی میں کبھی نہیں جاؤں گی ۔" وہ سر جھکا کے رونے لگی ۔

میں بہت دیر تک پریشان رہا ۔ وہ بہت دیر تک سسکیاں لیتی رہی ۔ آخر میں نے اسے دلاسا دیتے ہوئے کہا ۔ اچھا میں تمہیں وہاں نہیں بھیجتا ہوں ۔ آج ہمارے نیتا تاج محل ہوٹل میں آنے والے ہیں ۔ میں تمہیں ریلوے کا کلرک بنا کے وہاں بھیجتا ہوں ۔ ہاں مگر ہمارے نیتا کا ادب احترام ملحوظ رہے ۔ وہاں پر سبھی شرفا کے طبقے سے ہوتے ہیں ۔ وہ لوگ مجلسی آداب کا بہت خیال رکھتے ہیں ۔ کہیں کوئی ایسی ویسی بات نہ ہو جائے جس سے میرا فن بدنام ہو جائے ۔

میں نے کہانی کو چالیس برس کا ریلوے کلرک بنا دیا ۔ نام مل وانکر ، جو دادر کیبن نمبر ایک میں کام کرتا ہے ۔ جس کے دانت کتھئی رنگ کے ہیں ۔ اور جو چونا اور تمباکو ملا کے کھاتا ہے ۔ جس کے پانچ بچے ہیں ۔ ایک بیوی ہے ۔ ایک بوڑھی ماں ہے ۔ دو جوان بہنیں ہیں جن کی ابھی شادی نہیں ہوئی ۔ بیوی کا ایک بھائی ہے جو دونوں آنکھوں سے اندھا ہے جو اسے جہیز میں ملا تھا ۔ مل وانکر کا باپ بھی ریلوے میں کام کرتا تھا ۔ اسی لائن پر ۔ اور اب مل وانکر بھی کام کرتا ہے ۔ اسے یہاں کام کرتے ہوئے پچیس سال ہو گئے ہیں ۔ لیکن وہ آج تک کبھی تاج محل ہوٹل نہیں گیا ۔ تاج محل ہوٹل تو درکنار وہ کبھی بمبئی سنٹرل کے ریلوے ریسٹوران میں بیٹھ کے کھانا نہیں کھا سکا ۔ اسی لئے میں آج اسے تاج محل ہوٹل بھیج رہا تھا ، جہاں ہمارے نیتا آنے والے تھے ۔

پرانا سال جا رہا تھا ۔ نیا سال پیدا ہو رہا تھا ۔ یہ رات بڑی ہی سہانی تھی ۔ میں نے کوئی سات بجے کے قریب ہی مل وانکر کو تاج محل ہوٹل بھیج دیا ۔ اور خود سیر کرنے کے لئے سمندر کے کنارے چلا گیا ۔ وہاں بہت دیر تک ٹہلتا رہا اور سیپ اور گھونگھوں کو اکٹھا کر کے ان کا مکان بناتا رہا ۔ اور پھر اس کے بعد ریت پر کرایہ داروں سے پگڑی وصول کرتا رہا اور

پھر سمندر کی اک بہت بڑی لہر آئی اور میرا گھروندا بہا کے لے گئی اور میرے کپڑے بھی گیلے کر گئی ۔ اور میں اسی طرح مفلس و نادار ہو کر واپس اپنے گھر لوٹا ۔ رستے میں ساحل کے کنارے ماجھی اپنی کشتیوں میں لالٹینیں باندھے بادبان ٹھیک کر رہے تھے ، رات کو سمندر میں مچھلیاں پکڑنے جائیں گے ، ایک بڈھا اپنے کتے سے باتیں کئے جا رہا تھا ۔ ایک جوڑا ریت پر محو اختلاط تھا پولیس کا سپاہی سر پر کھڑا سگریٹ پی رہا تھا دور ناریل بیچنے والا پٹھیہ موٹر کرانچی صدا لگاتے ہوئے جا رہا تھا ۔ یکایک آسمان پر سارے ستارے کھل کھلا کر ہنس پڑے ۔ شریر بچوں کی طرح جیسے وہ میری ٹوٹی ہوئی چپل میرے پھٹے ہوئے پاجامے اور ریت میں سنی ہوئی پرانی قمیص کا مذاق اڑا رہے ہوں ۔ اور میں جلدی جلدی سے قدم اٹھاتا ہوا گھر چلا آیا ۔ اور میں نے دل میں سوچا کہ اب میں کبھی اتنا برا لباس پہن کر ساحل کے کنارے نہیں جاؤں گا ۔ آج نئے سال کا جنم دن ہے ۔ اور آج سب لوگ میرا لباس دیکھتے ہیں ۔ میرا دل نہیں دیکھتے ۔

میں نے دروازہ کھولا ۔ اور کپڑے تبدیل کئے اور کھانا کھا کے اور ایک عمدہ سی کتاب ہاتھ میں لے کر بستر پہ دراز ہو گیا ۔ دیر تک اسے پڑھتا رہا ۔ گیارہ بج گئے ۔ بارہ بج گئے ۔ لیکن مل وانکر واپس نہ آیا ۔ میں نے مسکرا کر دل ہی دل میں کہا ۔ آج پہلی بار تاج محل ہوٹل گیا ہے ۔ اتنی جلدی تھوڑی لوٹے گا ۔ اتنا سوچ کے میں نے کتاب کو بند کر دیا ۔ بتی بجھا دی ، اور بڑے مزے سے نرم نرم گدگدے بستر پہ پاؤں پھیلا کے سو لیا ۔ پتہ نہیں کتنی دیر سوتا رہا ۔ یکایک ٹیلی فون کی گھنٹی بجی ۔ میں نے بتی لگا کے دیکھا گھڑی میں تین بج رہے تھے ۔ یہ اس وقت کون ٹیلی فون کر رہا تھا ۔ میں نے غصے میں چونگا اٹھایا اور درشت لہجے میں کہا کون ہے ؟

[illegible] مل وانکر

[illegible] ابھی تک تاج محل سے بول رہے ہو میں نے پوچھا ۔

"نہیں : میں کولابہ کے تھانے سے بول رہا ہوں ۔" مل وانکر نے بڑی گھبراہٹ میں جواب دیا ۔ پولیس نے مجھے گرفتار کر لیا ہے اور بلا ضمانت مجھے رہا نہیں کرتے ۔ آپ فوراً آ جایئے ۔

خیر صاحب میں رات کے تین بجے اٹھا اور بھاگا بھاگا تھانے گیا اور اسے ضمانت پر چھڑا لیا ۔ اس کی نیکر پھٹی ہوئی تھی اور اس کا منہ سوجا ہوا تھا اور اس کے چہرے پر خراشوں کے نشان تھے ۔

میں نے پوچھا ۔ تمھیں پولیس نے مارا ہے ۔

نہیں۔

پھر کیا بلیوں سے نچواتے رہے ہو۔

وہ بولا۔ ہاں بڑی شریف بلیاں تھیں۔ بڑی خوب صورت ساڑھیاں پہنے تھیں۔ اور شراب میں دُھت تھیں۔

میں نے کہا۔ تم تھانے میں کیسے پہنچ گئے۔ میں نے تو تمہیں تاج محل ہوٹل بھیجا تھا۔

مل وانکر بولا: جبھی تو۔۔۔ آپ نے مجھے پہلے بتا دیا ہوتا۔ تو میں اپنے دو چار ایسے ساتھیوں کو لے جاتا۔ واں میں اکیلا تھا۔ پہلے تو وہ لوگ مجھے اندر گھسنے نہیں دیتے تھے۔ کیونکہ میرا لباس بہت شاندار تھا۔ یہ نیکر۔ یہ قمیص۔ یہ جوتا۔ وہاں کے تو بیرا لوگ بھی بہت اچھا لباس پہنتے ہیں، یہ آپ نے کیا کیا۔ اگر آپ کو مجھے وہاں بھیجنا ہی تھا تو کوئی سُوٹ ہی دیا ہوتا یا کوئی عمدہ سا ہندوستانی لباس۔ یا کھدر کا کرتا۔ اور۔ یا دھوتی۔ اور جواہر جیکٹ اور سر پر اک شفاف سی گاندھی ٹوپی۔ آج کل یہ ڈریس بھی خوب چلتا ہے وہاں۔ سُنا ہے کسی زمانے میں اس ڈریس کو واں گھسنے نہیں دیتے تھے۔ مگر آج رات کو تو واں اس لباس کی بہت عزت تھی۔

میں نے کہا۔ تم اپنی بات سناؤ۔

مل وانکر بولا۔ پہلے تو اُن لوگوں نے میری وضع قطع، شکل شباہت پر اعتراض کیا۔ مگر چونکہ میری سیٹ بُک تھی۔ اور جب میں پہنچا عین اُسی وقت نیتا جی سیڑھیاں چڑھتے آ رہے تھے اس لئے بٹلر نے مجھے اپنی پریشانی میں زیادہ دیر تک روکا نہیں۔ اُس کی نگاہ نیتا جی پر گئی اور میں ہال کے اندر ہو لیا اور اپنی سیٹ پر جا بیٹھا۔ میرے میز پر دو جوڑے پہلے سے بیٹھے تھے۔ ایک پارسی جوڑا تھا۔ ایک گجراتی۔ دونوں شراب پی رہے تھے۔

ویٹر نے آ کے مجھ سے پوچھا۔ آپ کیا پئیں گے۔

میں نے کہا۔ ٹھنڈا پانی۔

ویٹر ناک سکوڑ کے گردن ادھر کر کے اپنی کالی ٹو سنوارتا ہوا چلا گیا۔ وہ دونوں جوڑے میری طرف دیکھ کے بڑی حقارت سے مسکرائے۔ پھر انھوں نے گردن موڑ کے میک مین اینڈ بوائز کے بینڈ کی طرف دیکھا۔ جہاں سے اک نیا نغمہ بلند ہوا تھا اور جہاں سپید و سرخ لڑکیاں ہیولا ہیولا ہوائی رقص فرما رہی تھیں۔ یہ لڑکیاں دو اک جگہوں کے سوا بالکل ننگی تھیں۔ اور بار بار کولھے گھماتی پھرتی تھیں۔ ابھی ڈانس شروع ہی ہوا تھا کہ نیتا جی اندر داخل ہوئے اور یکا یک ڈانس بند ہو گیا اور فضا میں بندے ماترم کا نغمہ گونج اٹھا۔

پھر نیتا جی کو ہار پہنائے گئے۔

تالیاں بجائی گئیں

ایڈریس پیش کیا گیا

تالیاں بجائی گئیں

ٹھہرو۔ ٹھہرو۔ میں نے مل وانکر کو ٹوک کے کہا۔ یہ تو تم نے بتایا ہی نہیں کہ ایڈریس میں کیا تھا۔ جواب کیا دیا گیا۔

مل وانکر نے بڑی حقارت سے کہا۔ ایڈریس میں وہی تھا جو ایسے ایڈریسوں میں ہوتا ہے۔ یعنی آپ بہت بڑے تیس مار خاں ہیں۔ اگر آپ نہ ہوں تو ملک ڈوب جائے۔ قیامت آ جائے۔ یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ ملک کی باگ ڈور آپ ایسے وغیرہ وغیرہ قسم کے دانش وروں کے ہاتھ میں ہے اور علیٰ ھذا القیاس۔ اور جواب بھی اسی قسم کا تھا۔ یعنی آپ لوگوں نے میری بڑی عزت افزائی کی ہے۔ میں در اصل بڑا آدمی نہیں ہوں۔ بڑے بڑے مسئلوں کا سایہ مجھ پر پڑ رہا ہے۔ ورنہ ابھی تو ملک کے سامنے بہت سے بڑے کام ہیں۔ ایسے بڑے کام ہیں جن کے متعلق بڑے سوچ بچار کی ضرورت ہے۔ اس وقت ملک کے سامنے بڑا [illegible] سے اور اب میں نہیں جانتا کہ کیا ہوگا۔ آگے کیا ہونے والا ہے۔ کون اتنی بڑی ذمہ داری لے۔ اتنا کہہ سکتا ہوں۔ کہ آپ لوگوں کو میرے اوپر وشواش رکھنا چاہئے اور ملک میں بڑے امن سے رہنا چاہئے۔ اس کے لئے یہ بہت ضروری ہے کہ آپ لوگ شراب نہ پئیں۔ سینما ہال میں سیگرٹ نہ پئیں اور بارہ بجے کے بعد کمبل اوڑھ کر سو جائیں۔ ورنہ ملک تباہ ہو جائے گا اور برلن کی طرح یہاں بھی کمیونزم پھیل جائے گا۔ اس لئے سرمایہ داروں کو چاہئے کہ وہ گورنمنٹ کا ساتھ دیں۔ اور میں مزدوروں کو متنبہ کرتا ہوں۔ کہ وہ ہڑتالیں نہ کریں۔ پیداوار کو بڑھائیں۔ اس موقع پر مجھ سے نہیں رہا گیا۔ میں نے اپنی سیٹ سے اچھل کر کہا "میں آپ سے ایک سوال کرنا چاہتا ہوں"۔ سب لوگ میری طرف گھور گھور کر دیکھنے لگے۔ بیٹھ جاؤ۔ بیٹھ جاؤ۔ کی آوازیں آنے لگیں۔

میں نے کہا نیتا جی۔ میری تنخواہ چالیس روپیہ ہے۔

ایک آدمی بولا۔ چالیس روپے والے آدمی کا تاج میں کیا کام۔

" اسے باہر نکال دو۔ اسے باہر نکال دو۔ بہت سے رؤسا اک دم چیخے۔

میں نے کہا۔ نیتا جی۔ آپ مزدوروں کے بڑے حامی بنتے تھے آج آپ کو تاج محل میں آنے کی فرصت ہے۔ یونیورسٹیوں سے لایعنی ڈگریاں حاصل کرنے کی فراغت ہے۔ بے کار قسم کی کانفرنسوں میں شرکت

کرنے کے لئے وقت ہے۔ آپ کو ریلوے کے ایک غریب کلرک کی زندگی دیکھنے کی فرصت نہیں ہے۔ ذرا دو منٹ کے لئے میری کہانی سن لیجئے نا۔!؟

دیکھئے۔ میں ابھی آپ کو بتلائے دیتا ہوں۔ میرا نام مل وانکر ہے۔ میں ڈاون کیبن نمبر ایک پر............

"بیٹھ جاؤ۔ بیٹھ جاؤ۔ چپکے بیٹھے رہو"۔ دو چار آدمیوں نے مجھے پکڑ لیا۔

میں نے چیخ کر کہا۔ نہیں میں نہیں بیٹھوں گا۔ میں اپنی کہانی سنا کے رہوں گا۔ میرے کپڑے پھٹے ہوئے ہیں۔ میرے گھر میں بچے بھوکے ہیں۔ میری دو بہنیں ہیں۔ جن کی مجھے شادی کرنی ہے اور میری تنخواہ چالیس روپے ہے۔ میں تو نیتا جی کو اپنی کہانی ضرور سناؤں گا وہ تو خود کہتے ہیں کہ وہ

اس پر بڑا غل ہوا۔ اور میری میز پر جو دو عورتیں بیٹھی تھیں۔ انہوں نے غصے میں آ کے میرا منہ نوچ لیا۔ اور دو ایک خوش پوش آدمیوں نے مجھے مارا بھی۔ پولیس آگئی۔ اور اُس نے مجھے گرفتار کر لیا۔ اور کوالا پکے تھانے میں لے گئی

میں سر ہلا کے ہنسنے لگا "تو تمھاری کہانی وہاں کسی نے نہیں سُنی "

مل وانکر نے غصے میں آ کے مجھ سے کہا۔ آپ نے مجھے وہاں بھیجا ہی کیوں تھا۔ وہاں کسے فرصت ہے ان باتوں کی۔ آپ نے خواہ مخواہ مجھے ان کے عیش و آرام میں خلل ڈالنے کے لئے بھیج دیا۔ مگر اس سے کچھ ہوا تھوڑی ہی۔ تھوڑی دیر کے لئے بدمزگی پیدا ہوئی۔ پھر سب لوگ ہنسنے لگے۔ جب میں ہال سے باہر نکالا جا رہا تھا۔ سب لوگ مجھ پر ہنس رہے تھے۔ اور میک مین کے بینڈ نے اک نیا ہوائین رقص شروع کیا تھا۔

مل وانکر نے سر ہلا کے کہا۔ اب میں وہاں کبھی نہ جاؤں گا اور وہ میری طرف پیٹھ موڑ کے الگ بیٹھ گیا۔ روٹھے ہوئے بچے کی طرح۔

میں بہت دیر تک سر کھجاتا رہا۔ کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ اب کیا کروں اسے کہاں بھیجوں۔ آخر سوچ سوچ کے میں نے مسخروں والا لباس تیار کیا۔ اور اُسے کہانی کو پہنایا۔ میں نے کہانی کی ستواں ناک کو موٹا کر دیا اس کے سرخ ہونٹوں کو سفید کر دیا۔ اُس کی بے داغ تیوری پر ایک بہت بڑا مسا لگایا۔ اور اُس کے سر پر ایک لمبے پھندنے والی تکونی ٹوپی پہنا کر اُس سے کہا۔ جاؤ۔ جہاں پر ننھے ننھے بچے کھیلتے ہیں اور بے فکر اور معصوم روحیں مسکراتی ہیں۔ یہ تتلاتی ہوئی ننھی دنیا تمھاری پیاری پیاری کہانیاں سنیں گی۔ اور زندگی میں پھر سے پرستانوں کی بہار آجائے گی۔ جاؤ۔ مسخرے جاؤ۔ تم ریچھ کی طرح ناچو، مداری کی طرح ڈگڈگی بجاؤ۔ اور بندر کی طرح ناچ ناچ کے بچوں کی دنیا میں ہنسی کے فوارے اچھال دو۔

مسخرہ اپنا گدھے کی جھول سنبھالتا ہوا مجھ سے رخصت ہوا اور کوئی پانچ چھ دن تک واپس نہیں آیا۔ میں نے سوچا خلاف معمول اب کے کہانی لمبی ہو گئی۔ میں تو اتنی لمبی کہانیاں نہیں لکھتا ہوں۔ اب کے کہانی کو کیا ہوا جو اس قدر لمبی ہو گئی۔ ابھی تک آئی نہیں۔ ہفتہ ہونے کو آیا۔ اتوار کے روز جب میں ترقی پسند مصنفین کے جلسے میں شرکت کے لئے جا رہا تھا کسی نے دروازے کی کنڈی کھٹکھٹائی۔ میں نے دیکھا مسخرہ ہے۔ لیکن تکونی ٹوپی غائب ہے۔ ناک موٹی نہیں ہے ٹھوڑی سے مسا غائب ہے گدھے کی جھول نہیں پہن رکھی ہے بلکہ سپاہیوں والا لباس پہنے دروازے پر کھڑا لفٹ رائٹ کر رہا ہے

میں نے ڈرتے ڈرتے دروازہ کھولا۔

کیا مجھے گرفتار کرنے آئے ہو۔ میں نے کہانی سے پوچھا۔

مسخرہ میرے سامنے نشست پر بیٹھ گیا۔ رائفل کو تھام کے بولا۔ ہاں کچھ ایسی ہی بات ہے۔

کیوں کیا ہوا۔

مسخرہ چپ رہا۔ بہت دیر کے بعد بولا۔

اب کے میں بہت خوش تھا سوچا تھا خوب خوب لوگوں کو ہنساؤں گا۔ سٹیشن کے قریب ہی مجھے سات آٹھ سال کا بچہ مل گیا وہ میری طرف بڑی دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔ میں نے اُس کے پاس جا کے کہا کہانی سنو گے۔ بڑی اچھی کہانی ہے میرے پاس۔

وہ بولا۔ میرے پاس کہانی سننے کا وقت نہیں ہے۔ کیوں کہ میرے ماں باپ مر چکے ہیں۔ اور اب میں ریل میں سنترے کی گولیاں بیچتا ہوں۔ میری ایک چھوٹی سی بہن بھی ہے۔ اُسے دیکھو گے۔

وہ مجھے سٹیشن سے باہر لے گیا۔ ایک کونے میں ایک بچی پڑی تھی اور چپ چاپ ہاتھ پھیلائے بھیک مانگ رہی تھی۔

وہ بولا۔ جب ہم لوگ کراچی میں رہتے تھے تو رات کو بڑی اچھی اچھی کہانیاں سنتے تھے۔ اب ہمارے پاس کہانی سننے کے لئے وقت نہیں ہے۔ سنترے کی گولیاں لو گے۔ ایک آنے میں چھ۔ ایک آنے

میں چھ - ایک آنے میں چھ - پھر وہ کڑک کے بولا - اگر تم اپنا لباس مجھے دیدو - تو میرا خیال ہے کہ بہت سے لوگ مجھ سے سنترے کی گولیاں خرید لینگے -

میں وہاں سے بھاگ نکلا

وہاں سے نکل کر میں ایک گلی میں گھس گیا - چند لونڈے پتنگ بنا رہے تھے - میں نے کہا میں تمہیں رنگا رنگ پتنگوں کو اونچا سب سے اونچا اڑانے کا طریقہ بتاتا ہوں - یہ طریقہ میں نے زعفران دیس کی پری سے سیکھا تھا - زعفران دیس کی پری -

میں یہاں تک کہنے پایا تھا کہ ان میں سے ایک لڑکا بول اٹھا - بڑے میاں کیوں ہمارا وقت خراب کرتے ہو - ہم لوگ پتنگ بناتے ہیں، پتنگ اڑاتے نہیں ہیں - وہ دوسرے بچے ہوتے ہوں گے - ہم لوگ اگر شام تک پچاس پتنگ نہیں بنائیں گے تو بھوکے مر جائیں گے - تم یہاں سے نو دو گیارہ ہو جاؤ -

میں وہاں سے نو دو گیارہ ہو گیا - اور ایک گھر کے اندر گھس گیا - باہر دروازے پر تالا تھا - لیکن میرے لئے کیا رکاوٹ تھی - میں گھر کے اندر گھس گیا - کیوں کہ گھر کے اندر سے برابر چلانے کی آواز آ رہی تھی - اندر جا کے میں نے دیکھا کہ ایک ننھا بچہ ہے بمشکل سے چار سال کا ہوگا اور وہ ایک ننھی بچی کو پیٹ رہا ہے -

میاں نے اس سے کہا - بچے بچوں سے پیار کرتے ہیں - پیٹتے نہیں ہیں -

یہ روتی ہے - بچے نے جواب دیا -

یہ کیوں روتی ہے - میں نے پوچھا -

یہ بھوکی ہے -

اس کی ماں کہاں ہے

ماں کارخانے گئی ہے

باپ کہاں ہے -

باپ بھی کارخانے گیا ہے -

ماں اس کو کارخانے کیوں نہیں لے گئی -

ماں کام کرتی ہے - ماں کارخانے گئی ہے - یہ بھوکی ہے - میں بھی بھوکا ہوں - یہ روتی ہے - میں اس کو مار رہا ہوں -

میں نے کہا - اسے مارو نہیں - دیکھو پھر ہم تمہیں بڑی اچھی کہانی سناتے ہیں - ایک تھا بادشاہ!

بادشاہ لوگ بہت برے ہوتے ہیں - لڑکے نے کہا

تم سے کس نے کہا - میں نے پوچھا -

باپو کہتے ہیں - بادشاہ اچھے نہیں ہوتے - وہ بھوکا رکھتے ہیں -

اچھا تو ہم تمہیں پریوں کی کہانی سناتے ہیں - وہاں بھوک نہیں ہوتی - پریوں کا دیس بڑا سندر ہے - وہاں بڑے سندر مکان ہوتے ہیں - وہاں پر شہد اور دودھ کی نہریں ہوتی ہیں -

آہا ہا - دودھ - ہمیں دودھ ہی تو چاہئے - لڑکا اچھل پڑا - تم کہانی تو سنو -

نہیں - ہمیں دودھ دو - ہماری بہن دودھ مانگتی ہے یہ روتی ہے - ہم اسے مارتے ہیں -

اور اس پریوں کے دیس میں ایک دن پریم کا راجہ .....

ہمیں پریم کا راجہ نہیں - دودھ چاہئے - پریم کا راجہ نہیں سنتے ہم - دودھ - دودھ - دودھ -

لڑکا زور زور سے رونے لگا - اور اپنی ننھی بہن کو پیٹنے لگا

میں جلدی سے وہاں سے نکل آیا - پھر وہاں نکل کر میں بہت سی جگہوں پر گیا - بہت سی گلیوں میں - بازاروں میں - گلی کوچوں میں - کھیتوں میں، جنگلوں میں - شہروں میں - دیہاتوں میں - کسی بچے نے میری کہانی نہیں سنی، وہ سب پریشان ہو چکے ہیں - لٹتے ہوتے جا رہے ہیں اور ان کی ہنسی کمھلائے پھول کی طرح مرجھا کر فرش خاک پر گر چکی ہے -

تو اب تم یہ سپاہی کا لباس پہن کے کیوں آئے ہو؟

وہ بولا - اس لئے کہ اب میں لڑنا چاہتا ہوں - اس ہنسی کے لئے لڑنا چاہتا ہوں - میں نے سنا ہے کہ چین میں ایک کسان "بیٹے لی" اس کا نام ہے - وہ اس ہنسی کے لئے لڑ رہا ہے - اور میں نے یہ سنا ہے کہ انڈونیشیا میں ایک نورالدین کان کن ہے - اور وہ اس کے لئے لڑ رہا ہے اور میں نے سنا ہے کہ یونان میں ایک لوہار ہے مارکاس وہ اس کے لئے لڑ رہا ہے - اور میں نے سنا ہے کہ برما اور ملایا اور ہند چینی کے گھنے جنگلوں میں چھوٹے چھوٹے بچے بھی اس کے لئے لڑ رہے ہیں - میں بھی اس ہنسی کے لئے لڑوں گا - اب میں ایک خوبصورت رقاصہ نہیں بننا چاہتا - ہنسانے والا مسخرہ بھی نہیں بننا چاہتا - کمزور احتجاج کرنے والا - کلرک بھی نہیں بننا چاہتا - میں چاہتا ہوں کہ مجھے ایک موٹی سی کارتوس کی گولی بنا دو - اور مجھے وہاں بھیج دو - جہاں انسان، انسان پر ظلم کے خلاف لڑ رہا ہے -

عابد حشری

سویرے سویرے

کبھی تو میری زندگی کے اُفق سے چھٹینگے یہ پُرہول، خونیں اندھیرے
شبِ تار کے ملگجے آنچلوں سے کہاں تک نہ برسیں گے نوری سویرے

غریبوں کی کٹیا ہو یا قصرِ شاہی یہاں بھی دُھندلکے وہاں بھی اندھیرے
یہ دُنیا ہے یاں چین لینے نہ دینگے سماجی درندے رواجی لٹیرے

گذرنے بھی دے یہ غبارِ منظّم نکلنے بھی دیں یہ مسلسل اندھیرے
بڑی دیر سے منتظر ہیں ہمارے گلابی اُجالے شہابی سویرے

چل اپنے لئے اب نئی راہ ڈھونڈیں کریں کیوں لحاظِ رواجِ زمانہ
یہ دُنیا کی رسمیں نہ تجھ سے نہ مجھ سے یہ دُنیا کے بندھن نہ تیرے نہ میرے

مجھے اپنے دامن کی پہنائیوں میں جگہ دے بھی دو اب روپہلی اُجالو
میری جستجو میں ہے ظلمت جہاں کی مجھے ڈھونڈتے پھر رہے ہیں اندھیرے

وہ یوں روح میں ڈوبتے جارہے ہیں وہ یوں میرے احساس پہ چھا رہے ہیں
فضا میں دبے پاؤں سورج کی کرنیں بکھر جائیں جیسے سویرے سویرے

زمانے نے لی کیسی کروٹ یہ حشری یہ کیا ہو گیا مسکراتے دلوں کو
جو انساں کبھی تھے امینِ محبت وہ انسان اب بن گئے ہیں لٹیرے

مضطر اکبرآبادی

غمِ زمانہ

خیالِ امروز، فکرِ فردا، غمِ محبت، غمِ زمانہ
یہی مری مختصر حقیقت یہی مرا مختصر فسانہ

عجب تماشا سا بن گئی ہے چمن میں تعمیرِ آشیانہ
کبھی فسانہ تھا حقیقت کبھی حقیقت تھا فسانہ

گزر گیا دورِ بندشوں کا سمٹ گئی گردشِ زمانہ
جو آشیانہ کبھی قفس تھا وہی قفس اب ہے آشیانہ

جمالِ ساحل نظر سے اوجھل ادھر بھی طوفاں ادھر بھی طوفاں
ہوا مخالف بھنور میں کشتی یہیں بنا ہے سب، ڈوب جانا

حقیقتِ مرگ و زیست پر کیوں اُلجھ رہے ہو اُلجھنے والو
حقیقتِ مرگ بھی فسانہ حقیقتِ زیست بھی فسانہ

نہ اب ہے وہ دورِ بیقراری نہ اشکباری نہ آہ و زاری
کسی کا نام آگیا زباں پر کہ تھم گئی گردشِ زمانہ

اگرچہ میں خوش دلی سے سہتا رہا زمانہ کے نازِ بیجا
مگر مجھے ہر قدم پہ مضطر فریب دیتا رہا زمانہ

خواجہ غلام السیدین

مشیر تعلیم حکومت بمبئی

مغرب کا اثر اخلاق و عادات پر!

ہندوستان پر مغرب کے اثر کا اندازہ کرنے کے لئے یہ ایک مناسب موقع ہے کیونکہ ابھی ہم حال ہی میں مغرب کی سیاسی غلامی سے آزاد ہوئے ہیں۔ اس عرصے میں باوجود اس سیاسی کش مکش کے جو ہندوستان اور برطانیہ میں ہوتی رہی، مغرب نے ہماری تہذیب اور تمدن، ہمارے رہنے، ہماری زبان اور ادب، ہماری ذاتی اور قومی سیرت پر بہت گہرا اثر ڈالا ہے۔ تقریروں کے اس سلسلے میں اس اثر کے مخالف پہلو آپ کے سامنے پیش کئے جائیں گے۔ میرا کام آج یہ ہے کہ مغرب نے ہمارے اخلاق و عادات پر جو اثر ڈالا ہے اس کا تجزیہ کروں۔ زندگی کو بنانے اور عمدگی کے ساتھ چلانے کا ایک سنہرا اصول یہ ہے کہ ہم اچھی چیزوں کو اختیار کریں اور بری چیزوں کی طرف سے منہ موڑ لیں۔ اب جب کہ آزادی نے ہمارے سامنے ترقی کے راستے کھول دیئے ہیں اور ہم ایک نئے تمدن اور نئے سماج کو بنانے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔ ہمیں چاہیئے کہ بے لاگ طریقہ سے مغرب کی میراث کی جانچ کریں اور اس میں جو اچھی چیزیں ہیں انہیں کھلے دل سے اپنالیں۔ ہماری ہندوستانی تہذیب کو اس بات پر ناز ہے کہ اس کا دامن مختلف اثروں کو قبول کرنے کے لئے کھلا رہا ہے۔ اور اس نے ہمیشہ ان کو ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس نے مختلف مذہبوں، تہذیبوں اور قوموں سے اچھی چیزیں لیں اور ان کو سمو کر وہ حسین ہم آہنگی پیدا کی جو کہیں تاج محل کی شکل میں نظر آتی ہے۔ کہیں تان سین کی موسیقی میں جھلکتی ہے کہیں کبیر اور نانک کی بھگتی میں جلوہ دکھلاتی ہے۔ کہیں اکبر کی گنگا جمنی تہذیب کا روپ اختیار کرتی ہے۔ کہیں ٹیگور اور اقبال کی شاعری میں دل کے تار ہلاتی ہے۔ کہیں بیگم نائیڈو کی انگریزی نظموں اور جواہر لال کی بین الاقوامی سیاست میں ظاہر ہوتی ہے اور کہیں مہاتما گاندھی کی انسان دوستی میں زمان اور مکان کی حدوں کو توڑ کر ایک عالمگیر قوت بن جاتی ہے۔ یہ سچ ہے کہ آج بہت سے لوگ اس طرح کی باتیں کرتے ہیں۔ گویا ہندوستان کی تہذیب کسی خاص قوم، کسی خاص نسل، جماعت یا مذہبی گروہ کی خاص ملکیت ہے۔ جس میں بعض نام کی چیزیں زبردستی شامل ہو گئی ہیں۔ لیکن یہ خیال غلط ہے۔ تہذیب کے ٹکڑے نہیں کئے جا سکتے۔ اگر آپ انسانی خون کو اس کے اجزا میں تقسیم کر سکیں نغمے میں سے اس کے زیر و بم کو جدا کر سکیں۔ خوب صورت ریشم کے ٹکڑے کا تانا بانا الگ کر کے دکھا سکیں، ادب کی شیرینی، اثر اور قوت میں سے مختلف جماعتوں کا حصہ الگ الگ نکال کر رکھ دیں، اگر آپ یہ سب کچھ کر سکیں اور خون، خون رہے، نغمہ، نغمہ رہے۔ ریشم، ریشم رہے۔ ادب، ادب رہے، اس وقت آپ ہندوستانی تہذیب کے بھی حصے بخرے کر سکتے ہیں۔ اور اس کو خاص اور پوتر بنانے کے خواب دیکھ سکتے ہیں۔

خیر، کہنا یہ تھا کہ جس تہذیب کی genius (جینس) اور تاریخ اس قسم کی ہو، اس کے لئے یہ کیسے ممکن ہو سکتا تھا کہ وہ مغرب کا اثر قبول نہ کرتی خصوصاً جب مغرب کی تہذیب ایک حاکم قوم کی تہذیب بن کر آئی تھی۔ عربی کا ایک مشہور قول ہے کہ لوگ اپنے حاکموں کے راستے پر چلتے ہیں۔ ہندوستانیوں نے بھی ایسا ہی کیا۔

لیکن یہ ایک دم نہیں ہو گیا بلکہ اس کی ایک دلچسپ تاریخ ہے جس کی تفصیل کا موقعہ نہیں۔ ابتدا میں انگریز تاجروں اور مشنریوں کی حیثیت سے آئے تھے۔ ہندوستانی اس وقت اپنی تہذیب کو بہت بلند سمجھتے تھے۔ اور مغرب سے آئے ہوئے یہ لوگ، جن کی

چھری کی گوری تھی، اور جن کا لباس، کھانا پینا، رہنا سہنا، بول چال سب ہم سے الگ تھی۔ انھیں کچھ عجیب اور مضحک سے معلوم ہوتے تھے۔ اگر آپ اٹھارہویں اور انیسویں صدی کی لکھی ہوئی چیزیں پڑھیں تو آپ دیکھیں گے کہ ہمارے لکھنے والے اور شاعران کا مذاق اڑاتے تھے، لیکن رفتہ رفتہ ان کے ہاتھ میں سیاسی قوت آنے لگی، اور ملک کے حالات سے فائدہ اٹھا کر انھوں نے یہاں اپنی حکومت قائم کر لی۔ اس تبدیلی سے ساری صورت حال ہی بدل گئی۔ ان کا لباس جو بے ڈھنگا سمجھا جاتا تھا، اب تہذیب اور شان کی علامت بن گئی، ان کی زبان، حکومت کی زبان بنی، اور اس کی نقل کرنا کمال سمجھا جانے لگا۔ چھری کانٹے سے کھانا، جسے ہمارے بزرگ برا سمجھتے تھے، اب فیشن میں داخل ہو گیا۔ چال ڈھال، نشست و برخاست، رہنے سہنے کے ڈھنگ نئے سانچے میں ڈھلنے شروع ہوئے۔ اور شعبۂ زندگی میں انگریزی تعلیم یافتہ لوگوں نے انگریزی تہذیب کی نقل شروع کر دی۔ وہ اس کی ظاہری چمک دمک سے اس قدر مرعوب ہو چکا تھا کہ انھیں اس کے مقابلے میں اپنی چیزیں گھٹیا اور نقلی معلوم ہونے لگیں۔ ان میں سے بعض کی سب سے بڑی آرزو یہ تھی کہ زبان کو مروڑ کر انگریزی اس طرح بولیں کہ ناواقف آدمی انھیں تازہ ولایت اور آکسفورڈ کی پیداوار سمجھے، ان کے پتلون کی کریز اور اپنے بزرگوں کی تلوار سے زیادہ تیز ہو، کپڑے لندن کے سلے ہوئے اور پیرس کے دھلے ہوئے معلوم ہوں۔ اپنے میل جول کے طریقوں اور آداب نشست و برخاست میں بھی انھوں نے اپنی تہذیب کی روایات کو چھوڑ کر، مغربی طریقے جو ایک دوسرے ماحول کی پیداوار تھے، بغیر سوچے سمجھے، بغیر تنقید کے اختیار کر لئے جس وقت انیسویں صدی اپنے آخری سال گزار رہی تھی۔ ہندوستان کی تعلیم یافتہ نوکری پیشہ جماعت مغربی تہذیب کے سامنے ہتھیار ڈال چکی تھی۔

لیکن اس دور کی بڑی خرابی یہ نہ تھی کہ انھوں نے اپنا لباس اور وضع قطع بدل لی بلکہ وہ اپنی قومی خصوصیتوں کو، اپنی قومی خودداری کو، اپنی عزت نفس کو بھلا بیٹھے، اپنی ہر چیز کو حقیر اور مغرب کی ہر چیز کو برتر سمجھنے لگے۔ در اصل غلامی کا اثر کسی قوم کی سیرت اور اخلاق و عادات پر ہمیشہ بہت خطرناک ہوتا ہے۔ ایک آزاد خود مختار ملک میں وہ لوگ عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں جو ملک کی خدمت اور سماج کی سیوا کرتے ہیں۔ سائنس، ادب، فلسفہ، آرٹ وغیرہ میں نام پیدا کرتے ہیں۔ انھیں کو بڑے اعزاز اور عہدے ملتے ہیں۔ لیکن ایک غلام ملک میں ان چیزوں کی کوئی خاص پوچھ نہیں ہوتی۔ وہاں بڑائی ناموری اور سرداری ان لوگوں کے لئے ہے جو حاکم قوم کا آلۂ کار بنتے ہیں۔ ان کے مفاد اور اغراض کی خدمت کرتے ہیں، محکوم قوم کو دبا کر رکھتے ہیں اس کی مدد کرتے ہیں اور خوشامد، جھوٹ اور ناحق کا ساتھ دے کر اپنا مطلب نکال لیتے ہیں۔ حکومت ایسے لوگوں کی دل سے عزت نہیں کرتی۔ لیکن اپنی غرض سے انھیں آگے بڑھاتی ہے یہی وجہ ہے کہ جس حکومت نے مدتوں گاندھی جواہر لال، موتی لال اور لاجپت رائے، سی۔ آر داس، ابوالکلام اجمل خاں، ڈاکٹر انصاری اور محمد علی کو جیل میں بند رکھا اور ان کے ساتھ سیاسی اچھوتوں کا سا سلوک کیا اس نے بہت سے ایسے لوگوں کو عہدے اور اعزاز دئے جو لیاقت، دیانت داری اور فرض شناسی قوم پرستی اور سیاسی سوجھ بوجھ میں ان کے پاسنگ بھی نہ تھے نتیجہ یہ ہوا کہ وہ لوگ جن میں نہایت سخت اصول پرستی، دلش بھگتی اور ایثار کی صلاحیت نہ تھی۔ ذلت کے آسان اور آرام دہ راستے کی طرف پھسل پڑے اور اس زمانے میں ہمارے تعلیم یافتہ انگریزی خواں طبقے میں محب وطن اور با اصول لوگ کم اور ابن الوقت زیادہ پیدا ہوئے۔ ان میں قومی خودداری کے بجائے خوشامد، سچائی کے بجائے مصلحت پرستی، بہادری کے بجائے خوف، قومی ضرورت کی لگن کے بجائے خود غرضی کی جڑیں پکڑ گئیں۔ ان کو عوام کے ساتھ یک جہتی کا احساس نہیں رہا اور خود کو ایک الگ ذات سمجھنے لگے اور بجائے جنتا کا دکھ درد بٹانے اور ان کا بوجھ ہلکا کرنے کے خود اپنے حلوے مانڈے کی فکر میں پڑ گئے۔ یہ مغرب کے اثر کا تاریک ترین پہلو ہے۔

لیکن شروع سے ہی اس تحریک کی مخالفت بھی ملک میں موجود تھی۔ جو مختلف شکلوں اور مختلف وجوہ سے ظاہر ہوتی رہی۔ انیسویں صدی میں بھی بعض گروہ ایسے تھے جو کسی دام وہ اپنی تہذیب اور اپنی روایتوں کو ہاتھ سے دینے کے لئے تیار نہیں۔ ان میں خاص طور پر قابل ذکر مسلمانوں کی ایک مذہبی جماعت تھی جو مغربی تہذیب اور عیسائی مذہب کے پرچار کو ایک دوسرے سے وابستہ سمجھ کر چاہتے تھے کہ

مسلمان انگریزی تعلیم، انگریزی زبان اور انگریزی نوکریوں سے بالکل الگ ہیں۔ اکبر الٰہ آبادی نے اپنی شاعری میں ان لوگوں کا پُر تکلف خاکہ، اڑایا ہے۔ جو مغرب کی اندھی تقلید میں گرفتار تھے۔ اور نذیر احمد نے اپنے ناول ابن الوقت میں اس تحریک پر سنجیدگی کے ساتھ بحث کی ہے۔ لیکن اس کے خلاف جو زیادہ گہرا اور با اثر ردِ عمل شروع ہوا وہ ہماری سیاسی بیداری کا ایک پہلو تھا، اور اس نئی تحریک کی قیادت، جس کا مقصد ہندوستانیوں میں سچی خودداری پیدا کرنا تھا، گاندھی، ٹیگور اور اقبال نے کی۔

ان تینوں رہنماؤں میں کوئی بھی مغرب کا مخالف اور اس کی ہر چیز سے بیزار نہ تھا۔ انھوں نے خود بہت کچھ مغرب سے حاصل کیا تھا، اور وہ اس کی اچھی اور بنیادی چیزوں کی قدر کرتے تھے لیکن انھیں اس کا احساس تھا کہ کوئی قوم ذہنی اور تہذیبی غلامی کی حالت میں ترقی نہیں کر سکتی۔ اپنی خودی کا، اپنی صلاحیتوں کا اظہار نہیں کر سکتی۔ اس لئے اس کو جرأت اور روشن خیالی کے ساتھ مغرب کی تنقید کرنی چاہیئے۔ اس میں جو ناقص عناصر ہیں ان کو نکالنا چاہیئے جو اچھی چیزیں ہیں ان کو اپنی تہذیب میں شامل کر لینا چاہیے۔ ٹیگور نے ہندوستان کو، اس کی تہذیب اور آرٹ کے خزانوں کی طرف متوجہ کیا۔ اس کے اخلاقی اور روحانی اصولوں کی یاد دلائی اور مغرب کو انسانیت اور محبت کا اپدیش سنا کر ہندوستانیوں میں از سرِ نو عزتِ نفس کا احساس پیدا کیا۔ گاندھی جی نے ان تمام اثروں کے خلاف جہاد کیا جنھوں نے ہندوستانی سیرت کو کمزور اور ان کی قوتِ عمل کو شل کر دیا تھا انھوں نے لوگوں کو عیش پرستی کے بجائے سادگی، لالچ کے بجائے سماج سیوا کا سبق دیا۔ ان کی تحریک کا مقصد تھا کہ لوگوں میں ایسی سیرت پیدا ہو جائے کہ وہ آزادی حاصل کر سکیں اس کی فضا میں سانس لے سکیں، اور اس کی حفاظت کر سکیں۔

اقبال کا عقیدہ یہ تھا کہ جب تک کوئی فرد یا جماعت، اپنی خودی کی گہرائیوں میں ڈوب کر موتی کی سی آب اور سختی نہیں پیدا کر لیتی وہ کمزور اور بے اثر رہتی ہے۔ غلامی، تقلید اور سوال کی عادت نے ہندوستانیوں کو بے بس بنا دیا تھا اقبال نے انھیں خود اعتمادی و سربلندی کی تعلیم دی۔ انھیں اس بات کا گلہ ہے کہ ہندوستان نے اپنی تہذیب اور اپنی آزادی کا موتی کھو کر گردن میں غلامی کی زنجیر ڈال لی ہے اور ان کو شکایت مغرب سے نہیں بلکہ خود ہندوستان سے تھی۔

معلوم کسے ہند کی تقدیر کہ اب تک
بے چارہ کسی تاج کا تابندہ نگیں ہے
جان بھی گروِ غیر، بدن بھی گروِ غیر
افسوس کہ باقی نہ مکاں ہے نہ مکیں ہے
یورپ کی غلامی پہ رضامند ہوا تو!
مجھ کو تو گلہ تجھ سے ہے، یورپ سے نہیں ہے

اس لئے ہم اب اس منزل پر پہنچ گئے ہیں کہ جب اپنی خوشی اور عقل کے مطابق مغرب سے استفادہ کر سکتے ہیں۔ ہم نے ان سے بہت کچھ حاصل کیا ہے، انگریزی ادب اور انگریزی فکر کی دولت سیاسی اور سماجی زندگی کے نئے ڈھنگ، سائنس اور ڈاکٹری کے جدید آلات اور دریافتیں، مکان، لباس، خوراک، سیر و تفریح میں نئے راستے، سفر کے نئے طریقے، اور صنعت و حرفت کی نئی مشینیں، ان سب نے ہمارے خیالات اور عادات پر بہت گہرا اثر ڈالا ہے مغربی تہذیب کے ان جدید لوازم میں ایک طرف ریلیں، موٹریں، ہوائی جہاز، ڈاک تار اور کارخانے چلانے والی مشینیں شامل ہیں۔ دوسری طرف علاج کے نئے نئے ڈھنگ اور سرجری کے نئے نئے آلات، تیسری طرف ملک کی پیداوار بڑھانے کے سائنٹفک طریقے اور چوتھی طرف اخبار، چھپی ہوئی کتابیں، گراموفون، ریڈیو اور سنیما، جن کے ذریعہ لوگوں کی تعلیم اور تفریح کا انتظام کیا جاتا ہے یہ سب ہماری زندگی میں شامل ہو گئے ہیں اور اس کا صرف اتنا ہی مطلب نہیں کہ وہ ہماری مادی معاشرت کا جزو بن گئے ہیں۔ بلکہ ان میں سے ہر ایک نے ہمارے خیالوں اور عادتوں پر اثر ڈالا ہے، اور ان کو نئے سانچے میں ڈھالا ہے۔ جو آدمی بیل گاڑی کو چھوڑ کر موٹر میں سفر کرتا ہے، وہ صرف فاصلے کو ہی تیزی سے طے نہیں کرتا بلکہ دوسرے ملکوں اور قوموں کے متعلق اس کا نقطۂ نظر بھی بدل جاتا ہے، اخبار سے دنیا کے حالات بھی باخبر رکھتے ہیں وہ اکثر اس کی ذہنی آزادی بھی چھین لیتے ہیں۔ ریڈیو اور سنیما، اس کا دل بھی بہلاتے ہیں لیکن اکثر اس کی تخلیقی قوتوں کو کم کر کے اس کی تفریح کو مشینی بنا دیتے ہیں۔ یہ سب اثر ہم پر بھی ہوتے ہیں، اچھے اور برے، لیکن، بدقسمتی سے اب تک ان چیزوں کے ساتھ غلامی کے رہنے کا زہر بھی ملا ہوا تھا۔

اب ہم اس اثر سے آزاد ہو کر ان کو اپنی تہذیب کی قوت اور دولت میں شامل کر سکتے ہیں اور مجھے امید ہے کہ ہم اس معاملے میں تنگ نظری سے کام نہیں لیں گے، ہندوستان کی تہذیب ہمیشہ بڑھتی اور پھیلتی رہی ہے۔ اور اب اس زمانے میں جب بین الاقوامی میل جول بڑھ گیا ہے ہم اپنی پرانی روایات کو ترک نہیں کر سکتے ہمیں ان میں اور زیادہ جان ڈالنی ہوگی۔

(بہ اجازت آل انڈیا ریڈیو بمبئی)

اختر الایمان

ایک پرتو

قمر کی فرحت نواز کرنیں لئے ہیں آغوش میں وہ دنیا
جہاں ابھی محوِ خواب ہوں گی وہ سُرمگیں غم فروز آنکھیں
ہر اک شجر سو گیا ، زمیں پر لطیف کرنوں کے جال پھیلے
ہر ایک شاخِ خزاں رسیدہ کی پھیل کر رہ گئی ہیں باہیں!
خدا کی مخلوق سو گئی ہے فریبِ صبحِ بہار کھا کر
سکوں کے دامن میں فکرِ امروز گر پڑی ہے نڈھال ہو کر
مرے تخیّل سے ایک پرتو اُبھر رہا ہے سوال ہو کر
یہ غم کی لہریں جو ہر تمنّا سے کھیلتی ہیں مآل ہو کر
یہ شب کی حسرت بہ دوشِ ہستی جو چھوڑ دیتی ہے آزما کر؟
دیارِ محبوب کی خموشی کہیں تجھے سنگ ہی نہ کردے
حسیں امیدوں کا یہ تلاطم ترے نفس میں نہ زہر بھر دے

سلام مچھلی شہری

غزل

آجکل جس سے کچھ شکایت ہے — یاسمیں رُخ ہے، سرو قامت ہے
شادمانیٔ زندگی معلوم — پھر غمِ زندگی کی حسرت ہے
مجھ کو دیکھو، سجو، پھلو پھولو — آئینے کی بھی کیا ضرورت ہے
انہیں اُجڑی ہوئی نگاہوں سے — گلستانوں کی زیب و زینت ہے
یہ غزل کچھ نہیں سلام! مگر — ہم نئے شاعروں کی جرأت ہے

ممتاز حسین

کچھ فسانہ کچھ حقیقت!

افسانے کی تکنیک پر انگریزی زبان میں بہت سی کتابیں ہیں۔ اور ان تمام کتابوں نے افسانے کی ہیئت پر کافی زور دیا ہے۔ لیکن دشواری تو یہ ہے کہ افسانے کی تکنیک نئے مواد سے ہم آہنگ ہو کر ہمیشہ بدلتی رہی ہے۔ چنانچہ اگر آپ کلاسکی انداز میں افسانے کی تعریف اور اس کے قواعد و ضوابط متعین بھی کر دیں تو کچھ زیادہ فائدہ نہیں پہنچے گا۔ کیونکہ وہ تمام اصناف سخن جن کے قواعد اور ضوابط یونانیوں نے بنائے تھے آج کچھ اس طرح بدلے نظر آ رہے ہیں کہ اگر آپ اس کلاسکی معیار پر جانچنے کی کوشش کریں گے تو آپ کو بڑی مایوسی ہو گی۔ ڈرامے کو لیجئے، اس کی صورت یونان میں کچھ رہی تو کلیسا نے کچھ کر دیا۔ جب یورپ میں احیاء علوم کا زمانہ آیا تو نو کلاسکی تحریک کی ذہن میں یونانی ڈرامے کے بہت سے قواعد کو برتنے کی کوشش کی گئی لیکن رومانوی ادیبوں نے اس کی سخت مخالفت کی پھر تو ڈرامہ زمان و مکان اور عمل کی وحدت سے بھی آزاد ہو گیا۔ جب رومانیت سے حقیقت نگاری کا دور آیا تو ڈرامہ مسائلی مباحث کا ترجمان بن گیا۔ اکسن اور برناڈ شا پیدا ہوئے۔ بیسویں صدی میں یہ مختصر ہو کر مختلف تنوعات کا حامل بنا رہا لیکن ان تمام تجربات میں کوئی نہ کوئی چیز ثابت اور پائندہ ضرور رہی ہے۔ آپ ڈرامے کو افسانہ نہیں کہتے ہیں خواہ وہ صرف پڑھنے ہی کے لئے کیوں نہ لکھا جائے۔ آپ پانچ ایکٹ کے طویل ڈراموں کو ناول بھی نہیں کہتے ہیں۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ ڈرامے کی کوئی نہ کوئی خارجی ہیئت ایسی ضرور ہے جو باوجود تبدیلیوں کے ابھی تک اپنی جگہ پر قائم ہے اور آپ اسی ہیئت کی بنیاد پر اسے دوسری صنفوں سے ممتاز کر لیتے ہیں۔ انھیں معنوں میں افسانے یا کہانی کی بھی ایک خارجی ہیئت ہے، اور اس خارجی ہیئت کو قائم رکھنا افسانے میں بہت ضروری ہے۔ وہ خارجی ہیئت کیا ہے؟ کہانی کی ابتدا اور انتہا؟ اگر بات اتنی ہی ہوتی تو بہت سے مضمون بھی افسانے ہوتے؟ لیکن افسانہ مضمون سے مختلف ہے۔ مضمون میں منطقی استدلال سے کام لیا جاتا ہے، جذباتی ارتقا کی جگہ فکری ارتقا ہوتا ہے۔ ترغیبی ہتھیار انشا پرداز بھی اختیار کرتا ہے لیکن اس کا افسون مختلف ہے، وہ منطق اور علم کی کرامات دکھاتا ہے۔ کچھ انشا پرداز ایسے بھی ہیں جو شاعرانہ اظہار خیال سے جذباتی ترغیب کا بھی سہارا لیتے ہیں۔ لیکن اگر دیانتداری کو رہبر بنایا جائے تو یہ ماننا پڑے گا کہ یہ بددیانتی ہے چونکہ مضمون کا کام وقتی طور پر متاثر کرنا نہیں ہے۔ اس لئے پُرجوش مضمون ایک قسم کی خطابت ہے جس کا تعلق تقریر اور شاعری سے ہے۔ مضمون وہی مضمون ہے جس کی عمارت کی تمام اینٹیں خبر اور معلومات سے تیار کی گئی ہیں اور جس کے گارے مٹی میں صرف منطق کا ہاتھ ہو۔ پھر بھی یہ چیزیں کسی مضمون کو اچھا نہیں بنا سکتی ہیں۔ تاوقتیکہ اچھا لکھنے والا صاحب اسلوب نہ ہو اور اس میں زبان کی اتنی قدرت نہ ہو کہ وہ اپنے خیالات کو وضاحتی تصویروں میں ڈھال سکے۔ دراصل یہ کام فن کار کا ہے اس لیے اچھا مضمون نگار وہ نہیں ہو سکتا۔ جو فن کار نہ ہو۔ پھر بھی آپ مضمون کو افسانے سے پہچان لیتے ہیں۔ خواہ آپ میں جاننے کا یہ سلیقہ ہو یا نہ ہو کہ آیا مضمون نگار نے جذبات سے کھیلنے کی کوشش کی ہے یا واقعی اپنے ذہن کو دوسرے کے ذہن سے ٹکرایا ہے ان الفاظ کے علاوہ اگر آپ مضمون کی تعریف کرنا چاہیں تو صرف اتنا ہی کہہ سکتے ہیں کہ مضمون کا ایک بنیادی خیال ہوتا ہے جس کی وضاحت اور تشکیل میں اور بہت سے خیالات کی مدد لی جاتی ہے اور جب اس خیال کی تشکیل ہو جاتی ہے تو وہ مضمون ختم ہو جاتا ہے۔ برے مضمون کی پہچان صرف مجہول طرز تحریر ہی نہیں ہے۔ بری منطق، پُر تضاد بیانات، منطقی تسلسل کی کمی، مرکزی خیال سے ہٹ کر دوسرے

خیالوں کو اہمیت دینا یہ تمام چیزیں ایک مضمون کو نا قابل قبول اور نہ پڑھے جانے کے لائق بنا دیتی ہیں، حالانکہ مضمون سب سے زیادہ آزاد صنعت ہے، آپ ایٹم پر مضمون لکھ سکتے ہیں۔ نظریۂ اضافیت کو سمجھا سکتے ہیں، شعر و شاعری سے بحث کر سکتے ہیں اور صفحات کے اسٹیج پر کھڑے ہو کر تقریر بھی کر سکتے ہیں۔ اگر ہم اچھے برے مضمون کو پہچان سکتے ہیں۔ تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم کہانی کو پہچان نہ سکیں۔

پہلا بیان۔

کہانی کسی مرکزی خیال کی ترجمان نہیں ہوا کرتی ہے بلکہ مرکزی موضوع (THEME) کے ارتقا کا نام ہے۔ اس بیان کے ماتحت کہانی کے لئے کسی بنے بنائے ہوئے پلاٹ کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ خیال بالکل صحیح معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ پہلے سے مرتب کئے ہوئے پلاٹ میں ایک مصنوعیت پائی جاتی ہے۔ موضوع کا منطقی ارتقا اپنا پلاٹ خود بنا لیا کرتا ہے لیکن یہ ماننا پڑے گا کہ ذہنی تخلیق کے موقع پر کہانی کے آدھے تہائی حصے کا پلاٹ ضرور متعین ہو جاتا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ کاغذ پر آنے کے بعد اس پلاٹ کی ہیئت بدل جائے۔ اس سلسلے میں چند اور باتیں قابل غور ہیں۔ کہانی میں زندگی کا ایک ٹکڑا پیش کیا جاتا ہے اور زندگی کبھی بھی مرتب نہیں ہوتی ہے اور نہ اس کا اختتام ہمیشہ ڈرامائی انداز ہی میں ہوا کرتا ہے پھر کہانی کے اختتام پر کسی ڈرامائی کیفیت کو تلاش کرنے کے کیا معنی ہیں۔ اگر یہ ڈرامائی کیفیت خارجی ہے تو یقیناً یہ ایک عیب ہے لیکن اگر داخلی ہے تو اس سے کہانی کا لطف دوبالا ہو جاتا ہے۔ کیونکہ ادب بالعموم زندگی کی دو متضاد طاقتوں کو پیش کرتا ہے۔ یا پھر بہت سے متضاد عناصر میں کسی ایک عنصر یا جذبے کی سمت تلاش کرتا ہے۔ متضاد عناصر کے ٹکراؤ سے زندگی کا احساس تیز ہو جاتا ہے۔ یہ ٹکراؤ خواہ آخر میں ہو یا کسی اور جگہ کہانی کو ڈرامے سے قریب لاتی ہے لیکن اس چیز کو کہانی کی بنیادی خشت نہیں بتائی جا سکتی ہے کیونکہ کہانیاں ہلکے ہلکے تاثرات کے ذخیرے سے بھی تخلیق کی جاتی ہیں اور بعض اوقات یہ تاثرات ایک ہی سمت کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

دوسرا بیان

کہانی کے لئے کسی کردار نگاری کی ضرورت نہیں ہے۔

اس بیان میں بھی حقیقت ہے کہ کہانی صرف فن کار کے ذاتی مشاہدے سے بھی بن سکتی ہے۔ وہ صرف کسی واقعے کی تصویر کھینچ سکتا ہے، یا کسی ہنگامے یا ہجوم کی غیر شخصی داستان بھی بیان کر سکتا ہے۔ مثال کے طور پر کرشن چندر کی "پشاور ایکسپریس" کو لیجئے۔ یہاں ریل گاڑی ہی سب کچھ بیان کرتی ہے۔ جس کے بیان میں کوئی خاص آدمی اور کوئی شخصیت نہیں ابھرتی ہے۔ صرف بربریت کا مظاہرہ جس کے پیچھے طنزیہ انداز میں فن کار کا داخلی ردعمل موجود ہے۔ آپ اسے کہانی ماننے پر مجبور ہیں لیکن اس قسم کی کہانیوں کی مثال ہماری بحث کے لئے مفید نہ ہوگی۔ اس موضوع پر بحث کرنے کے لئے کہانی کی مختلف قسموں کو پیش نظر رکھنا ہوگا۔ کچھ کہانیاں کسی واقعے سے متعلق لکھی جاتی ہیں چنانچہ ان کہانیوں میں کردار کی اہمیت بالکل ضمنی ہوتی ہے۔ کچھ کہانیوں میں صرف کردار نگاری ہوتی ہے لیکن ایسے موقع پر بھی کیریکٹر کے کسی ایک پہلو کو نمایاں کیا جاتا ہے۔ کیونکہ پورا کیریکٹر ایک کہانی کے کینوس پر نہیں آ سکتا ہے۔ پرانی کہانیاں اپنے اس موضوع کو کچھ اس طرح نباہتی ہیں۔ عمر نیکی کی طرف کیوں کر مائل ہوا، زید اپنے کیفر کردار کو کیوں کر پہنچا۔ نئی کہانیاں اسی موضوع کو دوسری طرح نباہتی ہیں، وہ برے کردار میں خوبیوں کے لمحے ڈھونڈھتی ہیں، برے کردار کے سماجی اسباب کو پیش کرتی ہیں۔ منٹو اور بیدی اسی ذیل میں آتے ہیں، عصمت نفسیاتی الجھنوں پر مبنی اسباب کو پیش کرتی ہیں۔ لیکن کرشن کے یہاں کردار کی اہمیت بالکل ضمنی رہتی ہے۔ کرشن کچھ اس طرح سوچتا ہے۔ شخصیت کی تکمیل مادی آسائش اور محبت کی گوناگوں کیفیات ہی کے بعد ممکن ہے۔ ایک وہ شخص جس نے نہ تو پیٹ بھر کر کھانا کھایا ہے اور نہ دل کھول کر محبت کی ہے اس کے کردار ہی کیا، کرشن اس طرح سے شخصیت کی تکمیل پر زور دیتا ہے۔ وہ موجودہ شخصیتوں سے کم بحث کرتا ہے بلکہ ان کے تخلیقی امکانات، اور شخصیت کی بھرپور تکمیل کا ایک خواب پیش کرتا ہے۔ وہ کالو بھنگی پر کہانی نہیں لکھ پاتا ہے کیونکہ کالو بھنگی نے نہ تو عشق ہی کیا ہے اور نہ پیٹ بھر کر کھانا کھایا ہے۔ یہ کرشن چندر کا بالکل اچھوتا انداز ہے جہاں وہ پرانی حقیقت نگاری سے اپنے کو الگ کر لیتا ہے۔ کرشن کو اپنے کردار کی منفرد خصوصیات نہیں ستاتی ہیں وہ اپنے کردار کے ان احساسات اور تخیلات کو پیش کرنے لگتا ہے۔ جو اظہار کی برکت سے محروم رہے ہیں کرشن اس شعری وجدان کو اچھی طرح نباہ لیتا ہے کیوں کہ اس کے ..... اسلوب میں شعریت اور گداز ہے لیکن کہیں کہیں یہ اختلاف کا موقع بھی دیتا ہے "یہ پھول سرخ ہیں" اس کہانی کو لیجئے۔ اندھے

کو کھول سے اتنی محبت ہو جاتی ہے کہ اس کا ذائقہ شاعری سے جا ملتا ہے۔ پڑھنے والا پوچھ سکتا ہے کہ کیا ایسا ہو بھی سکتا ہے؟ شاعر جواب دے سکتا ہے لیکن فسانہ نگار کے لئے ذرا دقت پیدا ہو جاتی ہے۔ پھر یہ کہ کردار کے سماجی اور سیاسی شعور کی مصوری میں اس کا خیال رکھنا بہت ضروری ہے کہ ہم اس کی ذہنی سطح سے اوپر پرواز نہ کریں۔ ذہنی سطح پر رہ کر بھی ہم اپنی تاویلِ حقیقت پیش کر سکتے ہیں۔

تیسرا بیان

کہانی کے لئے کچھ بھی ضروری نہیں ہے یہ صرف ایک لاشعوری تصویر ہے جو غیر منطقی ہے، اس کے چوکھٹوں کا درست ہونا بھی ضروری نہیں ہے۔ اس دعوے کو اس بیان سے تقویت مل سکتی ہے کہ کردار، پلاٹ اور اسی قسم کی تمام چیزیں صرف موضوع کے ارتقا میں حصہ لیتی ہیں اس لئے ان کی حیثیت ضمنی ہے۔ لیکن چند چیزیں لاشعوری رو کے پیش کرنے میں آڑے آتی ہیں۔ ہر ادیب اپنے ہی لاشعوری رو کی نقل کرتا ہے وہ تخلیق بھی کرتا ہے تو اپنے ہی تخیل سے کام لیتا ہے ایسی کہانیوں میں مقصد کا ابھرنا بہت ضروری ہے۔ کیونکہ بے ترتیبی میں بھی ایک مقصد پنہاں ہوتا ہے لاشعوری رو کے لکھنے والے یہ بتاتے ہیں کہ لاشعور کی دنیا ایک پُر اسرار بستی ہے جس کا نہ کوئی کنارا ہے اور نہ ساحل۔ یہ انتشار محض ہے اور جب انتشار کو ایک خارجی جسم دے دیا جاتا ہے تو وہ حیرت میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ انتشار کو قائم رکھنے کی اس سے بڑی اور کیا کوشش ہو سکتی ہے۔ صنعت ہی کو شاعری سمجھا جاتا تھا اُن مثنویوں کو بھی شاعری کا کارنامہ سمجھنے لگے۔ اس میں شبہ نہیں کہ ان مثنویوں میں شاعری کا کارنامہ موجود ہے لیکن بلاغت کے وہی مواقع بتائے جاتے ہیں جہاں قصے کے مختلف پہلوؤں کو فطری انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ نہ صرف کلام کو موزوں کرنے کی صلاحیت ان قصوں کی خوبی کی حامل ہے بلکہ مطالعۂ نفسیات اس سے زیادہ اہم ہے اور یہ مطالعۂ نفس قصے والی مثنویوں میں سب سے زیادہ اہم ہے۔ میر کی مثنوی کے مقابلے میں میر حسن کی مثنوی کیوں اچھی ہے، اس کا جواب ہی مطالعۂ نفس اور فطری انداز ہے۔ میر حسن نے واقعات اور نفسیات کی خارجیت پر زور دیا ہے۔ شہزادی اور کنیز کے کرداروں کو منفرد حیثیت سے پیش کیا ہے۔ میر نے اپنی داخلیت کو مثنویوں میں اس قدر اہم کر کے پیش کیا ہے کہ وہ قصے کی خارجیت کو دھندلا دیتی ہے۔ کوئی بھی ڈرامہ، کوئی بھی ناول یا کہانی اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتی ہے جب تک کہ مصنف نے خود کو شعوری اور قصے سے الگ نہ کر لیا ہو۔ وہ کردار اور موضوع کی تخلیق ہی اس لئے کرتا ہے کہ اپنا مخصوص نقطۂ نظر اور اپنی مخصوص تاویلِ حقیقت کو دوسروں کے سامنے پیش کرے پھر اسے جا بجا کرداروں کے درمیان مداخلت کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ جب ایک شاعر کسی قصے کی تخلیق کرتا ہے تو اس کی پہلی توجہ موضوع کے ارتقا پر ہوتی ہے اس نے قصے کو منظوم عبارت میں کیوں پیش کیا؟ اس کا جواب یہ نہیں ہے کہ وہ شاعری کرنا چاہتا ہے بلکہ یہ کہ وہ اپنے اندر اتنی صلاحیت محسوس کرتا ہے کہ نظم میں نثر کا مزا پیدا کر دے یا پھر وہ منظوم حیثیت سے پیش کرنے کو اپنے لئے زیادہ آسان سمجھتا ہے۔ کوئی منظوم ڈرامہ کوئی بھی منظوم قصہ، شیخ اور اسی قسم کی دوسری تخلیقی کوششیں صرف موضوع ہی کے مقتضیات پر جانچی جا سکتی ہیں۔ فصاحتِ بیان اور زبان تو بعد میں دیکھی جائے گی۔ اگر اس تخلیق میں دو چار ٹکڑے شاعری کے اچھے ہیں اور شاعر موضوع کو نہیں نباہ سکا ہے تو ہم اس کی پوری کوشش کو ناکامیاب سمجھیں گے۔ لیے مجبور ہیں چنانچہ یہ انتشار ہیئت میں بھی قائم رہتا ہے۔ میں ایسی کہانیوں کو کہانی نہیں مانتا ہوں تا وقتیکہ انتشار میں کوئی (PATERN) نہ دکھایا جائے اس کی کوئی مخصوص سمت نہ دریافت کی جائے۔ اور اگر (PATERN) اور سمت پیدا کیا جا سکتا ہے تو یہ ماننا پڑے گا کہ یہ ایک شعوری کوشش ہے۔ جس میں صرف تاویلِ حقیقت کی کوشش کی جاتی ہے اور جب یہ شعوری کوشش ٹھہری تو پھر کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ ہم ان کہانیوں میں کہانی پن کیوں نہ دریافت کریں کیوں کہ ہر شعوری کوشش کا ایک منضبط ڈھانچہ بھی ہوتا ہے۔ اگر انتشار کو حقیقت سمجھ کر اس کی نقل اتارنے کی کوشش کی جاتی ہے تو پھر تو حقیقت بھی موضوعِ بحث میں آ جاتی ہے۔ یہ انتشار کس کا ہے۔ مصنف کا یا کسی خاص طبقہ کا اگر صرف مصنف کا ہے تو وہ اپنے انتشار سے دوسروں کو کیوں متاثر کرنا چاہتا ہے۔ یہاں یہ چیز بھی نہ بھولنا چاہیئے کہ وہ صرف اپنے انتشار کی تصویر ہی نہیں کھینچ رہا ہے۔ بلکہ وہ اپنے اس نقطۂ نظر سے متاثر بھی کرنا چاہتا ہے جو اس انتشار کی تخلیق میں حصہ لے رہا ہے۔ ایسے ادیب موضوع اور فن دونوں ہی کو بگاڑنے کی کوشش کرتے ہیں۔

آخری بیان

کہانی کی ایک خارجی ہیئت ہے جس کے بغیر کوئی بھی کہانی کہانی نہیں کہی جا سکتی۔

یہ خارجی ہیئت کہانی کا (MEDİVM) نہیں
ہے کیوں کہ کہانی نثر میں بھی لکھی جا سکتی ہے اور نظم میں بھی۔
شیکسپیئر کے بہت سے ڈرامے منظوم ہیں پھر بھی ہم انھیں ڈرامہ ہی
کہتے ہیں۔ اردو اور فارسی کی بہت سی مثنویاں، داستان یا قصے کے ضمن
میں آتی ہیں۔ .... اور یہی
بات ان قصوں اور کہانیوں کے لئے صحیح ہے۔ جنھیں نثر میں پیش کیا گیا
ہے۔ پہلے موضوع کو جانچئے کہ آیا کہانی لکھنے والے نے اپنے موضوع
کے ارتقا میں تمام جزئیات سے کام لیا ہے کہ نہیں۔ وہ اپنی شخصیت
کو کردار کے پیچھے رکھتا ہے کہ نہیں، واقعات کے بیان کرنے میں خارجیت
کو قائم رکھتا ہے کہ نہیں؟ اگر وہ اس کو پورا کر چکا ہے تو پھر انداز
بیان کو جانچئے۔

آج کل بہت سی ایسی کہانیاں لکھی جا رہی ہیں جہاں کہانی کی
خارجی ہیئت انداز بیان کی رنگینی میں کھو جاتی ہے آپ کبھی نثر کی تعریف
کرتے ہیں تو کبھی شاعری کی۔ لیکن اس سے زیادہ اہم اس کہانی کا
موضوع ہے جو صحیح معنوں میں فن کار کی تخلیق ہے۔ اگر ہم نے فن کی
اس (OJECTIVITY) پر زور نہ دیا
تو پھر ہر مبہم یا رنگین چیز بیک وقت افسانہ، مضمون، ڈرامہ
نثر منظوم اور منظوم نثر سب کچھ ہو جائے گی۔ اگر ہم لکھو کھا انسانوں
سے ملنے کے بعد ہر ایک شخص کو ایک مخصوص شخصیت کا نام دے
سکتے ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ ادب کی مختلف صنفوں کو ہم ان کی
مخصوص خصوصیتوں کی بنا پر نہ پرکھ سکیں۔

ملک راج آنند کا زیر طبع ناول

دو پتّی اور ایک کلی

یہ ڈاکٹر ملک راج آنند کا وہ مشہور ناول ہے جو دنیا کی کئی زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ چھ سات برس
تک انگلستان میں اِس کی اشاعت ممنوع قرار دی گئی تھی جس کی وجہ یہ تھی کہ آسام کے چائے کے
کھیتوں کے انگریز حاکموں نے انگلستان کی نام نہاد جمہوری حکومت پر اس لئے دباؤ ڈالا تھا
کہ "کالے لوگوں" پر ان سفید چمڑی والوں کے مظالم کی اَن گنت داستانیں مہذب دنیا کے کانوں
تک نہ پہنچ سکیں۔ اور ان کے شراب میں ڈوبے ہوئے قہقہوں اور اِن کے پُر ہوس شیطنت آمیز
افعال اور اِن کے چمڑے کے ہنٹروں کے فرّاٹے چائے کے کھیتوں میں کام کرنے والی مزدور
دوشیزاؤں کی چیخ میں دب کر رہ جائے

اس ناول کو **وشوامتر عادل** نے اردو کا جامہ پہنایا ہے

قنوطی شاعر

بلراج کومل

سسکتی شب کی گھنی سیاہی میں کون آنسو بہا رہا ہے ؟
یہ کس کی دھڑکن ہے جس میں ارمان ہولے ہولے بلک رہے ہیں ؟
یہ گیت کیسا ہے جس میں آنسو ہیں' سرد آہیں ہیں ۔ موت کی سی فسردگی ہے ؟
یہ کیا ہوا ہے کہ اس کی پلکیں زمیں پہ ذرّوں کو گن رہی ہیں ؟
ہوائیں شاخوں میں سرسراتی ہیں دور تک تیرگی ہے تارے بجھے ہوئے ہیں
فضا کے سینے میں کپکپی سی تھرک رہی ہے ۔
سسک سسک کر پکارتی ہے :
میں اک اشارہ ہوں اپنے خالق کی زندگی کی سیاہیوں کا
میں آج تک ایک مردہ دل کے لبوں پہ نوحہ کناں رہی ہوں
ہوائیں اک دوسری سے پیہم یہ پوچھتی ہیں !
یہ کون ہے جو ...... ؟ ...... یہ کون ہے جو ..... ؟ ؟

کبھی وہ لمحے بھی تھے جب یہ انسان
چلا تھا راہِ حیات پر مسکراتا' ہنستا سجیلے گیتوں کے پھول لے کر
اور اپنی پلکوں پہ آرزوؤں کے تارے تھامے یہ سوچتا تھا
گگن سے اُترے گی وہ پری جو حسین آنکھوں سے جگمگا دے گی اس کی ہستی
اسے مسرّت کی مسکراتی حسین کلیوں کے ہار پہنائے گی محبّت کے گیت گا کر
جواں امنگوں کو گدگدا دے گی مسکرا کر

مگر وہ ہنسنا بکھر چکا ہے
کہ جیسے غم کی سیاہیوں نے جمیل تارے نگل لئے ہیں
اور اب یہ مغموم' نیم مردہ سلگتا انسان تڑپ رہا ہے
حیات کی سب سیاہیوں کو سمیٹ کر اپنے گھر کو تاریکیوں کا مسکن بنا رہا ہے

کوئی اسے کاش یہ بتا دے
کہ زندگی کی بپھرتی موجوں میں ننھے مُنّے کروڑوں تنکے بھٹک رہے ہیں ۔
کروڑوں تنکے حسین سینوں کا خون پیتے ہیں' اپنی آہوں کے گیت سنتے ہیں' زندگانی گزارتے ہیں
کروڑوں تنکے زمیں کے سینے پہ بار بن کر تڑپ رہے ہیں
کوئی اسے کاش یہ بتا دے
دیا جلا لو' غموں کے مسکن کو پھونک ڈالو'
اُٹھاؤ پلکیں کہ زندگی میں تجلیاں بھی ہیں' روشنی بھی ہے نکہتیں بھی'
افق کے ماتھے پہ جھلملاتی ہوئی شعاعیں بھی ناچتی ہیں

مگر وہ جھلّا کے ہر گھڑی یہ پکارتا ہے'
مجھے نہ چھیڑو' مجھے نہ چھیڑو'
تمہیں مبارک ہوں زندگی کی مسرتیں' مسکراہٹیں اور چاند تارے
میں اپنی امید کا دیا تک بجھا چکا ہوں
اور اب تو شاید میں زندگی کا دیا بھی اک دن بجھا کے رکھ دوں !!

ماہنامہ ایشیا فروری ۱۹۴۹ء

فلم لائن اور منشی پریم چند

(منشی پریم چند کے خطوط ہندی کے مشہور ناول نگار جینیدر کمار کے نام)

پیارے جینیدر!

تمھارا خط عین اشطار کی حالت میں ملا۔ تم سے صلاح کرنے کی ضرورت آپڑی ہے .... ابھی نہ بتاؤں گا۔ جب آؤ گے تب ہی اس کے متعلق باتیں ہوں گی .... مگر تمھیں کیوں DEPENDENCE کی حالت میں رکھوں؟

بمبئی کی ایک فلم کمپنی مجھے بلا رہی ہے۔ تنخواہ کی بات نہیں کنٹریکٹ (CONTRACT) کی بات ہے۔ ۸ ہزار روپیہ سال۔ میں اس اوستھا (حالت) کو پہنچ گیا ہوں جب میرے لئے اس کے سوائے کوئی چارہ نہیں رہ گیا ہے کہ یا تو وہاں چلا جاؤں یا اپنے ناول کو بازار میں بیچوں۔ میں اس معاملے میں تمھاری رائے ضروری سمجھتا ہوں۔ کمپنی والے حاضری کی کوئی قید نہیں رکھتے۔ میں جو چاہوں لکھوں جہاں چاہے لکھوں، ان کے لئے چار پانچ سو سینیوریو تیار کردوں۔ میں سوچتا ہوں کہ ایک سال کے لئے چلا جاؤں۔ وہاں سال بھر رہنے کے بعد کچھ ایسا کنٹریکٹ کروں گا کہ میں یہیں بیٹھے بیٹھے تین چار کہانیاں لکھ دیا کروں اور چار پانچ ہزار روپیہ مل جایا کریں۔ اس سے جاگرن اور ہنس دونوں مزے میں چلیں گے اور ہسپتال کا سنگٹ کٹ جائے گا۔ پھر ہماری دونوں کی چیزیں دھڑلے سے نکلیں گی۔ لیکن تم یہاں آجاؤ گے تب کوئی رائے ہوگی۔ ابھی تو من دوڑا رہا ہوں ...... !

اس کے کچھ دن بعد ایک دوسرے خط میں پریم چند جی نے جینیدر کمار کو لکھا:۔

بھلے آدمی مکان چھوڑا تھا تو ڈاکیئے سے اتنا تو کہہ دیا ہوتا کہ میری چٹھیاں فلاں پتہ پر بھیج دینا۔ بس بوریہ بکنا سنبھالا اور چل کھڑے ہوئے۔ میں نے تمھارے جواب میں ایک بڑا سا (DETAILED) مفصل خط لکھا تھا وہ شاید مردہ چٹھیوں کے دفتر میں پڑا ہوگا۔ (میں نے شاید تمھیں لکھا ہے کہ) مجھے بمبئی کی کمپنی بلا رہی ہے۔ کیا صلاح ہے؟ مجھے تو کوئی ہرج نہیں معلوم ہوتا اگر وہ تین (تنخواہ) ۸۰۰ سو لے سال دو سال کرکے چلا آؤں گا مگر ابھی میں نے جواب نہیں دیا ہے۔ ان کے دو تار آچکے ہیں۔ پرساد جی[1] کی صلاح ہے "آپ بمبئی نہ جائیں" تمھاری بھی اگر یہی رائے ہے تو میں نہ جاؤں گا۔ جو برتی جی[2] کہتے ہیں "ضرور جائیے" اور طویل مفلسی بھی کہتی ہے کہ ضرور چلو۔ زندگی کا یہ بھی ایک تجربہ ہے

آخر وہ فلم لائن میں گئے ہیں وہاں سے انھوں نے لکھا:۔

میں جن ارادوں سے آیا تھا ان میں سے ایک بھی پورا ہوتا نظر نہیں آتا۔ یہ پروڈیوسر جس ڈھنگ کی کہانیاں بناتے آئے ہیں اس راہ سے جو بھر نہیں ہٹ سکتے ابتدال کو یہ تفریحی قدروں سے تعبیر کرتے ہیں۔ سسنی ہی میں ان کا وشواس ہے راجہ رانی ان کی منتریوں کی سازش، نقلی لڑائی، بوسہ بازی، یہی ان کے خاص ڈھنگ ہیں۔ میں نے سماجک کہانیاں لکھیں جنھیں تعلیم یافتہ سماج بھی دیکھنا چاہے لیکن ان کو فلمانے ان لوگوں کو شبہ ہوتا ہے کہ چلے یا نہ چلے۔ یہ سال تو پورا کرنا ہے ہی یہی قرض دار ہوگیا تھا، قرض پٹا دوں گا۔ مگر اور کوئی فائدہ نہیں۔ گئودان ناول کے آخری صفحے باقی ہیں۔ ادھر من ہی نہیں جاتا (جی چاہتا ہے) یہاں سے چھٹی پاکر اپنے پرانے اڈے پر جا بیٹھوں۔ وہاں دھن نہیں مگر سکون ضرور ہے۔ یہاں

[1] جے شنکر پرشاد۔ ہندی کے مشہور شاعر [2] ہندی کے مشہور مصنف

تو جان پڑتا ہے۔ زندگی برباد کر رہا ہوں۔

ان کا ایک فلم نکلا تھا "مزدور" اس کا ذکر کرتے ہوئے ایک خط میں لکھا:۔

مزدور تمھیں پسند نہ آیا۔ یہ میں جانتا تھا۔ میں اسے اپنا کہہ سکتا ہوں۔ نہیں بھی کہہ سکتا۔ اس کے بعد ہی ایک رومانس جا رہا ہے وہ بھی میرا نہیں ہے۔ میں اس میں بہت تھوڑا سا ہوں۔ تمز بعد میں بھی میں اتنا ذرا سا آیا ہوں کہ نہیں کے برابر، فلم میں ڈائرکٹر سب کچھ ہے۔ لیکھک قلم کا بادشاہ ہی کیوں نہ ہو۔ یہاں ڈائرکٹر کی عملداری ہے اور اس کے راج میں اس کی حکومت نہیں چل سکتی حکومت مانے تبھی وہ رہ سکتا ہے وہ لیکھک یہ کہنے کی جرأت نہیں رکھتا کہ "میں عوام کے رجحان کو جانتا ہوں۔ آپ نہیں جانتے اس کے خلاف ڈائرکٹروں زور دے کر لیکھک سے کہتا ہے میں جانتا ہوں۔

جنتا کیا چاہتی ہے۔ اور ہم یہاں جنتا کی اصلاح کرنے نہیں آئے ہیں، ہم نے کاروبار کھولا ہے۔ دھن کمانا ہماری غرض ہے۔ جو کچھ جنتا مانگے گی وہ ہم دیں گے اس کا جواب یہی ہے۔ اچھا صاحب ہمارا سلام لیجیئے۔ ہم گھر جاتے ہیں۔

وہی میں کر رہا ہوں۔ مئی کے آخر میں کاشی میں بندہ نادل لکھ رہا ہوگا اور مجھ میں کچھ نئی کلا سیکھنے کی بھی صفت ہے۔ فلم میں میرے من کو سکون نہیں ملا۔ سکون ڈائرکٹروں کو بھی نہیں ملتا۔ لیکن وہ اور کچھ نہیں کر سکتے۔ جھک مار کر پڑے ہوئے ہیں میں اور کچھ کر سکتا ہوں چاہے وہ بیگار ہی کیوں نہ ہو اس لئے چلا آ رہا ہوں۔ میں جو پلاٹ سوچتا ہوں اس میں آدرش واد (آئیڈیل ازم تصور پسندی) گھس آتا ہے اور کہا جاتا ہے اس میں تفریحی صفت نہیں ہوتی۔ میں تسلیم کرتا ہوں۔ مجھے آدمی بھی ایسے ملے ہیں جو نہ ہندی جانیں نہ اردو۔ انگریزی میں ترجمہ کر کے انھیں کہانی کا خلاصہ سمجھانا پڑتا ہے اور کام کچھ نہیں بنتا۔ میرے لئے اپنی وہی پرانی لائن مزے کی ہے۔ جو چاہا لکھا۔

میرا جیون یہاں بھی ویسا ہی ہے جیسا کاشی میں تھا نہ کسی سے دوستی نہ کسی سے ملاقات۔ ملاکی دوڑ مسجد تک اسٹیڈیو گئے گھر آئے ہندی کے دو چار پریمی کبھی کبھی آ جاتے ہیں۔ بس ـــ آخر میں فلمی دنیا کو استعفیٰ دے کر پریم چند جی کو لوٹ آنا پڑا اور اس کے بعد کچھ زیادہ دن وہ اس دنیا میں نہیں رہ سکے

(ہنس سے ماخوذ)

باقر رضوی

جستِ غبار

نوعِ انساں کو تباہی سے بچا سکتے ہیں / ہم زمانے کو رہِ راست پہ لا سکتے ہیں

رہِ ہستی میں جو بے فیض ہیں مانندِ غبار / ابرِ رحمت کی طرح چرخ پہ چھا سکتے ہیں

گلشنِ دہر میں ہیں رنگِ پریدہ لیکن / رُخِ کونین پہ سونا سا چڑھا سکتے ہیں

دور کرنے کے لئے پست و بلندِ ہستی / ہم تہِ تیغ و سرِ دار بھی جا سکتے ہیں

آج جو مصلحتاً مُنہ کو سیئے بیٹھے ہیں / کل وہ آفاق میں اک دھوم مچا سکتے ہیں

جن کی نظروں میں ہے مستقبلِ روشن کا سرور / نقدِ جاں تک وہ مسرت سے لُٹا سکتے ہیں

بغض و نفرت سے یہ دنیا ہے جہنم بہ کنار / مہر و اُلفت اسے فردوس بنا سکتے ہیں

وشوامتر عادل

پوسٹ ماسٹر

الیگزینڈر پشکن (۱۷۹۹ء سے ۱۸۳۷ء تک)

روسی افسانہ نگاری کے ارتقائی دور میں پشکن کا نام ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ پشکن بنیادی طور پر ایک شاعر تھا اور اس کا شمار یورپ کے ممتاز ترین شعرا میں ہوتا ہے لیکن وہ ڈرامہ نویسی اور افسانہ نگاری میں بھی کسی سے کم نہ تھا۔ سب سے پہلے پشکن نے اپنے ملک کی افسانہ نگاری میں ایک قسم کی پاکیزہ سادگی رائج کی جو بعد میں روسی حقیقت نگاری کی بنیاد بنی، وہ اپنے افسانوں میں عام آدمی سے بڑے پیار اور ہمدردی کے ساتھ پیش آیا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ پشکن انقلابی تھا لیکن وہ پہلا روسی افسانہ نگار تھا جس نے افسانہ نگاری میں نظریاتی عنصر کا ساتھ دیا اور اس لحاظ سے وہ یقیناً ترقی پسند تھا۔ پشکن کے یہاں یہ نظریاتی عنصر دھندلا سا ہے جو رومانیت کے خوبصورت شفاف لباس میں جھلکتا ہے اور پڑھنے والوں کے دل میں عام آدمی کے لئے ہمدردی مزید پیدا کر دیتا ہے۔

"پوسٹ ماسٹر" پشکن کا ایک بڑا مشہور افسانہ ہے۔ اس افسانے میں ایک گمراہ جوان لڑکی کو دکھایا گیا ہے جو اپنے عیش و عشرت کی خاطر اپنے عاشق کے ساتھ بھاگ جاتی ہے اسے کچھ پروا نہیں کہ اس کے اس فعل سے اس کے بوڑھے بیمار باپ۔۔ ایک عام آدمی۔ کی آنکھوں میں آنسو بھر آتے ہیں۔

عادل

پشکن کی اس کہانی سے روسی کہانیوں کے ترجمہ کا ایک سلسلہ شروع کیا جاتا ہے جو ترگنیف، ٹالسٹائی، داستووسکی، گارشن چیخوف اور گورکی کی کہانیوں پر ختم ہوگا۔ پشکن کے علاوہ اور روسی افسانہ نگاروں کی کہانیوں کا ترجمہ بھی وشوامتر عادل ہی نے کیا ہے۔ جہاں تک ترجمہ کی خوبصورتی اور دلکشی کا تعلق ہے۔ روسی سے انگریزی اور انگریزی سے اردو کے قالب میں آتے آتے کہانی کی حقیقی دلکشی میں قدرتی طور پر کمی آجانی چاہیئے لیکن اس مجبوری کے باوجود عادل نے ان کہانیوں کی روح کو نبھانے کی کوشش میں کامیابی حاصل کی ہے۔ اردو ادب کے تخلیقی جذبہ کو صحت و استحکام کے سانچے میں ڈھالنے کے لئے نہایت ضروری ہے کہ ہم دوسری زبانوں کے ادب خاص کر روسی ادب کو زیادہ سے زیادہ اردو زبان میں منتقل کریں تاکہ ہمارے نو تخلیق ادب میں صحت مند عناصر پیدا ہو سکیں۔

"ادارہ"

کون ہے بھلا جس نے ہماری ڈاک کی سڑکوں کے پوسٹ ماسٹروں کو کبھی نہ کوسا ہو، اور ان کے ساتھ تو تو میں میں نہ کی ہو؟ جس نے غصے کے یک لمحے میں وہ منحوس کتاب نہ مانگی ہو تاکہ اس کے نا واجب برتاؤ، گستاخی اور لاپرواہی کی بابت اپنی بے اثر شکایات درج کرے؟ کون ہے جو انھیں نسلِ انسان کے اچھوت یا اتنا ذلیل نہ سمجھتا ہو۔ جتنے کہ آج کل کی مردہ حکومت کے منشی یا کم از کم جنگلات میورم کے لٹیرے؟ لیکن آؤ ذرا انصاف سے کام لیں۔ آؤ ذرا ہم خود اُن کی جگہ لے کر دیکھیں شاید تب ہم ان کے بارے میں زیادہ احتیاط سے رائے قائم کر سکیں گے۔ پوسٹ ماسٹر کیا ہے؟ چودھویں درجے کے سرکاری ملازمین میں ایک شہید محض جسے صرف اس کا رتبہ مکوں سے بچائے رکھتا ہے۔ اور وہ بھی ہمیشہ نہیں، میں اپنے ناظرین سے خیر سے یہ پوچھتا ہوں کہ آخر اس "ڈکٹیٹر" کے جس نام سے کہ شہزادہ دیازسکی اُسے زندہ دلی سے بلاتا ہے، فرائض کیا ہیں؟ کیا یہ فرائض کسی قید خانہ میں سزائے قید کی ایک میعاد کے مترادف نہیں ہیں؟ نہ دن کو چین نہ رات کو۔ مسافر ایک تھکا دینے والے سفر کے دوران میں اپنی ساری جمع شدہ جھنجھلاہٹ اور کوفت کا نشانہ پوسٹ ماسٹر کو بنا دیتا ہے۔ کیا موسم ناقابل برداشت ہے۔ سڑکیں خوفناک ہیں۔ کوچوان گدھے کی مانند ڈھیٹ ہیں؟۔۔ ہر چیز کے لئے پوسٹ ماسٹر کو قصور وار ٹھیرایا جاتا ہے۔ جونہی سفر کرنے والا مسافر پوسٹ ماسٹر کی ننگی رہائش گاہ میں قدم رکھتا ہے وہ پوسٹ ماسٹر

کو اپنا دشمن سمجھنے لگتا ہے۔ اگر پوسٹ ماسٹر اپنے بن بلائے مہمان کو جلدی بھیجنے میں کامیاب ہو جائے تو وہ بڑا خوش قسمت ہے۔ لیکن اگر سوئے اتفاق سے گھوڑے نہ ہوں؟ ــــ شانِ خدا! کیسی کیسی لعنتیں، کیسی کیسی دھمکیاں اس بیچارے پر برسائی جاتی ہیں۔! بارش اور کیچڑ میں سے صحن میں بھاگ دوڑ کرنے پر مجبور کیا جاتا ہے۔ چیختے ہوئے طوفان اور کاٹتے ہوئے پالے میں وہ باہر ڈیوڑھی (ENTRANCE) میں چلا جاتا ہے۔ تاکہ ایک لمحے کے لئے اپنے برہم مزاج ملاقاتی کی چیخ پکار اور گھس پٹھ سے بچ جائے۔ گاڑی میں بیٹھا ہوا ایک جرنیل آ پہنچا ہے۔ کانپتا ہوا پوسٹ ماسٹر گھوڑوں کی آخری دو جوڑیاں اس کے حوالے کر دیتا ہے۔ جن میں جوڑ یا بھی شامل ہے جو سرکاری ہرکارے کے لئے مخصوص تھیں۔ جرنیل شکریہ کا ایک لفظ کہے بغیر گاڑی میں بیٹھ کر چل دیتا ہے۔ پانچ منٹ بعد ننھی ننھی گھنٹیوں کی جھنکار سنائی دیتی ہے اور ہرکارہ تازہ گھوڑوں کے لئے اپنا حکم نامہ میز پر پھینک دیتا ہے ــــ اگر ہم ان تمام باتوں پر غور کریں تو ہمارے دل غصے سے نہیں بلکہ سچی ہمدردی سے بھر جائیں گے۔ چند ایک لفظ اور ــ میں نے بیس سال سے زائد عرصہ تک روس میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک سفر کیا ہے۔ میں قریب قریب سبھی ڈاک کی سڑکوں سے واقف ہوں۔ میں کوچوانوں کی کئی نسلوں سے اچھی طرح واقف ہوں۔ کوئی پوسٹ ماسٹر ایسا نہیں جنھیں میں پہچانتا نہیں۔ کوئی ایسا نہیں جس سے میرا واسطہ نہ پڑا ہو۔ مجھے امید ہے کہ میں عنقریب اپنے سفرناموں کے عجیب و غریب مجموعے کو چھپوا دوں گا۔ اس وقت میں صرف یہی کہوں گا کہ مجموعی طور پر پوسٹ ماسٹر عوام کی نظروں میں اس قدر تلخ لہجے میں نہایت جھوٹے رنگوں میں پیش کئے گئے ہیں۔ یہ سرکاری ملازمین جن کی برائی کی جاتی ہے۔ عام طور پر صلح پسند لوگ ہیں۔ جو فطرتاً بامروت، ملنسار اور اپنی کارگزاریوں کا صلہ مانگنے میں معقول ہیں اور اپنے مفاد کی خاطر حد سے زیادہ لالچی ہیں۔ ان کی گفتگو سے، جنھیں سفر کرنے والے شرفا نظر انداز کرنے میں غلطی کرتے ہیں۔ بہت سی دلچسپ اور افادی باتیں معلوم ہو سکتی ہیں۔ جہاں تک میرا تعلق ہے۔ مجھے ماننا پڑتا ہے کہ جو کچھ یہ کہتے ہیں میں آسے سرکاری کام پر جانے والے چھٹے درجے کے سرکاری ملازم کی بکواس پر ترجیح دیتا ہوں۔

اس کا اندازہ تو آسانی سے ہو سکتا ہے کہ پوسٹ ماسٹروں کی معزز جماعت میں میرا شمار دوستوں میں ہوتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ان میں سے ایک کی یاد مجھے بڑی عزیز ہے۔ ایک دفعہ حالات نے ہم دونوں کو اکٹھا کر دیا۔ اور یہ اسی کی کہانی ہے۔ جو میں اپنے قابلِ الفت ناظرین کو اس وقت سنانا چاہتا ہوں۔

۱۸۱۶ء مئی کے مہینے میں مجھے ـــ کی حکومت کے دنوں میں ایک ڈاک کی سڑک پر سفر کرنے کا اتفاق ہوا جو اب ناقابلِ سفر ہو چکی ہے میرا رتبہ بہت چھوٹا تھا۔ میں ڈاک گاڑی سے سفر کر رہا تھا۔ اور دو گھوڑوں کا کرایہ ادا کر رہا تھا۔ اسی لئے پوسٹ ماسٹر میرے ساتھ تکلف سے پیش نہیں آتے تھے اور لبا اوقات جس چیز پر میں اپنا حق سمجھتا تھا وہ مجھے جھگڑا کر کے حاصل کرنا پڑتی تھی۔ جب کبھی پوسٹ ماسٹر میرے گھوڑوں کو کسی بلند مرتبہ شریف زادے کی گاڑی میں جوت دیتا تو میں نوجوان اور بدمزاج ہونے کی وجہ سے اس کی کمینگی اور دوں ہمتی پر غضبناک ہو جاتا اسی طرح گورنر کے دسترخوان پر جب تیز فہم خدمت گزار مجھے نظر انداز کر دیتا تو اس کے رویئے سے مانوس ہونے کے لئے بھی مجھے کافی دیر لگتی اب مجھے یہ بات زمانہ خطرات کے مطابق ہوتی ہوئی معلوم ہوتی ہے اور سچ تو یہ ہے کہ اگر مثال کے طور پر رتبے کی قدر ہونی چاہیئے کے مروجہ قاعدے کی بجائے کوئی دوسرا قاعدہ مثلاً عقل کی قدر ہونی چاہیے رائج کر دیا جائے تو ہمارا کیا حشر ہو؟ کیسے کیسے جھگڑے آن کھڑے ہوں نوکروں کو کیسے معلوم ہو کر پہلے کسی کی خدمت کرنی چاہیئے؟ لیکن پہلے میں اپنی کہانی تو سنا لوں ــــ

اس دن گرمی تھی۔ ـــ کی چوکی سے تین ورسٹ کے فاصلے پر بارش کی بوندیں پڑنے لگیں اور ایک منٹ بعد بارش کی بوچھار نے میری جلد تک بھگو دی۔ جب میں چوکی پر پہنچا تو میں نے پہلی احتیاط یہ کی کہ جلد از جلد اپنے کپڑے بدل لیے۔ اور دوسری یہ کہ چائے لانے کا حکم دیا۔ پوسٹ ماسٹر چلایا " دُونیا! سماوار اوپر رکھ دے اور کچھ کریم لے آ" یہ الفاظ سن کر ایک چودہ برس کی لڑکی اوٹ (PARIITION) کے پیچھے سے نمودار ہوئی اور بھاگ کر ڈیوڑھی میں داخل ہوئی۔ میں اُس کے حسن کی تاب نہ لا سکا۔

"کیا یہ تمہاری بیٹی ہے؟" میں نے پوسٹ ماسٹر سے پوچھا۔

"میری ہی بیٹی ہے جناب"۔ اس نے پُرغرور انداز سے جواب دیا" اور کتنی چالاک لڑکی ہے یہ۔ کتنی تیز طرار چھوٹی سی چیز! ہو بہو اپنی غریب ماں جیسی" پھر وہ میرا پروانہ راہ داری نقل کرنے بیٹھ گیا اور میں اُن تصویروں کو غور سے دیکھنے لگا۔ جو اس کی حقیر لیکن بے داغ آرامش گاہ کی دیواروں کو آراستہ کر رہی تھیں۔ تصویریں ایک فضول خرچ بیٹے کی کہانی سنا رہی تھیں۔ پہلی تصویر میں ایک معزز بوڑھا آدمی، ایک شب خوابی کی ٹوپی اور ڈریسنگ گاؤن پہنے اپنے بے قرار

لخت جگر کو الوداع کہہ رہا تھا۔ جسے صرف یہی فکر تھی کہ جتنی جلدی ہو سکے۔ وہ اپنے باپ کی دعائیں اور اپنے پیسے کی تھیلی حاصل کرلے۔

دوسری تصویر شوخ رنگوں میں اس نوجوان آدمی کی بدچلن زندگی کی ترجمانی کر رہی تھی کہ وہ۔ ایک میز کے پاس جھوٹے دوستوں اور بے شرم عورتوں سے گھرا ہوا بیٹھا ہے۔ اگلی تصویر اس نوجوان کو جو اب تباہ ہو چکا تھا۔ ٹاٹ کے کپڑے اور سر پر ایک پٹی نُما ٹوپی پہنے اور سوؤروں کو خوراک دیتے۔ اور ان کی خوراک پر حصہ بٹاتے ہوئے دکھاتی تھی۔ اسی کے چہرے سے غم اور ندامت کا اظہار ہوتا ہے۔ آخری تصویر اس کے واپس گھر آنے کی نمائندگی کرتی تھی۔ بوڑھا آدمی پہلے کی طرح وہی ڈریسنگ گاؤن اور وہی شب خوابی کی ٹوپی پہنے ہوئے اس سے ملنے کے لئے بھاگا چلا آرہا ہے۔

فضول خرچ بیٹا گھٹنوں کے بل بیٹھا ہے۔ پس منظر میں باورچی ایک موٹا بچھڑا ذبح کر رہا ہے۔ ہر تصویر کے نیچے میں نے جرمن زبان میں اشعار پڑھے جو موضوع کے شایاں تھے۔ یہ سب کچھ آج بھی میرے ذہن میں اسی طرح باقی ہے جیسے کہ گل مہندی کے گملے اور رنگ برنگی جھالروں والا بستر اور دوسری چیزیں، جن سے میں اس وقت گھرا ہوا تھا میں اپنی چشم تصور سے اب بھی اس پوسٹ ماسٹر، اس پچاس برس سے اوپر، تازہ جلد والے اور طاقت ور آدمی کو ایک لمبا سبز رنگ کا کوٹ پہنے ہوئے دیکھ سکتا ہوں۔ جس کے اوپر تین دھندلائے ہوئے فیتوں کے ساتھ تین تمغے ٹکے ہوئے تھے۔

میں نے ابھی اپنے پہلے کوچوان کا حساب چکایا ہی تھا کہ ڈونیا سماوار اٹھائے ہوئے لوٹ آئی۔ وہ ننھی عشوہ گر مجھ پر دوسری بار ایک سرسری نظر ڈالتے ہی بھانپ گئی کہ اس نے مجھ پر کیا اثر ڈالا ہے اس نے اپنی بڑی بڑی نیلی آنکھیں جھکا لیں۔ میں لڑکی سے باتیں کرنے لگا۔ اس کے جوابات جس میں کسی قسم کا حجاب نہیں تھا، ایک ایسی کمسن شخصیت کو بے نقاب کر رہے تھے۔ جسے زندگی کا تھوڑا سا تجربہ تھا۔ میں نے اس کے باپ کو شراب کا ایک گلاس پیش کیا۔ ڈونیا کو میں نے چائے کا ایک پیالہ دیا۔ اور ہم تینوں تھوڑی ہی دیر میں اس طرح گپ شپ کرنے لگے۔ گویا ہم ایک دوسرے کو برسوں سے جانتے تھے گھوڑے کافی دیر ہوئی جوتے جا چکے تھے۔ لیکن پھر بھی ۔۔۔ میرا دل نہیں چاہتا تھا کہ میں پوسٹ ماسٹر اور اس کی بیٹی سے رخصت ہو جاؤں۔ آخر کار میں نے خیر باد کہی۔ اس آدمی نے مجھے اچھے سفر کی دعا دی اور اس کی بیٹی مجھے گاڑی تک چھوڑنے آئی۔ میں ڈیوڑھی میں

رک گیا۔ اور اس سے بوسے کی فرمائش کی۔ ڈونیا مان گئی۔ میں بہت سے بوسے گن سکتا ہوں۔

"اس دن سے جب کہ میں پہلی بار اس شرارت میں طاق ہوا تھا لیکن ان میں سے ایک بھی اتنی دیر پا اور اتنی خوش گوار یاد میرے دل میں نہیں چھوڑ گیا۔

کتنی برس گزر گئے۔ اور حالات ایک بار پھر مجھے ڈاک کی سڑک پر انھیں مقامات پر لے گئے۔ مجھے پوسٹ ماسٹر کی بیٹی کی یاد آئی اور اس سے دوبارہ ملاقات کرنے کے خیال سے مجھے خوشی محسوس ہوئی۔ میں نے سوچا، لیکن شاید پوسٹ ماسٹر بدل گیا ہو اور ڈونیا غالباً اب ایک شادی شدہ عورت ہوگی۔" یہ خیال بھی میرے ذہن میں پیدا ہوا کہ شاید ان میں سے ایک مر چکا ہو اور میں دل میں محکم اندیشے لئے ہوئے ــــ چوکی کے قریب ہوتا گیا۔ گھوڑے ڈاک گھر کے پاس آکر رک گئے۔

میں نے کمرے میں داخل ہوتے ہی فوراً فضول خرچ بیٹے کی کہانی کی ترجمانی کرنے والی تصویروں کو پہچان لیا۔ میز اور بستر اپنی پرانی جگہوں پر پڑے تھے۔ لیکن اب کھڑکیوں میں پھول نہیں تھے۔ اور آس پاس کی ہر چیز تنزل اور لاپروائی کی داستان سنا رہی تھی۔ پوسٹ ماسٹر ایک بھیڑ کی کھال کا کوٹ اوڑھے سو رہا تھا۔

جب میں اندر داخل ہوا تو وہ جاگ پڑا اور اپنے بنچ سے اٹھ بیٹھا۔۔۔۔۔۔۔۔۔

وہ سیمین رائیرن ہی تھا۔ لیکن وہ کتنا بوڑھا ہو گیا تھا جب وہ میرا پروانۂ راہداری نقل کرنے میں مشغول تھا۔ تو میں نے اس کے سفید بالوں، اس کے ایک عرصے سے بے حجامت چہرے کی جھریوں، اس کی جھکی ہوئی پشت ــــ کو دیکھا ــــ اور اس بات پر حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکا کہ کس طرح تین چار برس "ایک طاقت ور انسان کو ایسا عمر رسیدہ شکستہ ڈھانچ بنانے کے لئے کافی ہیں۔

کیا تم مجھے پہچانتے ہو؟ میں نے پوچھا۔ ہم پرانے شناسا ہیں۔ بوڑھے آدمی نے روکھے پن سے جواب دیا۔ بے شک۔ یہ ایک چلتی ہوئی سڑک ہے۔ یہاں سے بے شمار مسافر گزرتے ہیں۔"

"تمھاری بیٹی تو اچھی ہے؟" میں نے سلسلہ جاری رکھا۔

بوڑھے آدمی نے تیوری چڑھائی۔ خدا جانے" اس نے جواب دیا!

"شادی ہو گئی ہے میرے خیال میں؟" بوڑھے آدمی نے ایسا ظاہر کیا گویا اس نے میرا سوال سنا ہی نہیں۔ اور منہ ہی منہ میں میرا

پروانہ راہداری پڑھتا گیا۔

میں نے اپنے سوالات بند کر دیئے اور کچھ چائے منگوائی۔ شوق تحقیق میرے دل میں چٹکیاں لینے لگا تھا۔ مجھے اُمید تھی کہ شراب کا ایک قطرہ میرے دوست کی زبان کھول دے گا۔

میں غلطی پر نہیں تھا۔ جو گلاس میں نے اُسے پیش کیا بوڑھے آدمی نے اُسے لینے سے انکار نہ کیا۔ اور میں نے دیکھا کہ رم نے اُس کے روکھے پن کو دور کر دیا۔ دوسرے گلاس کے بعد وہ کھل کر باتیں کرنے لگا۔ اس نے مجھے پہچان لیا یا یہ کہا کہ اس نے پہچان لیا ہے۔ اور میں نے اس سے ایک کہانی سنی۔ جو مجھے دلچسپ معلوم ہوئی۔ اور جس نے مجھ پر گہرا اثر ڈالا۔

"اچھا تو آپ میری دونیا کو جانتے ہیں؟ وہ کہنے لگا۔ آہ! دونیا۔ دونیا! ایسی لڑکی تھی وہ! جس کسی کو ادھر سے گذرنے کا اتفاق ہوتا وہ اُس کی تعریف کئے بغیر نہ رہ سکتا۔ اور کوئی بھی اس کے خلاف ایک سخت لفظ منہ سے نہیں نکالتا تھا۔ خواتین اسے تحفے دیا کرتی تھیں۔ کوئی اُسے لال رومال دیتی۔ کوئی کانوں کی بالیاں ادھر سے گذرنے والے (GENTLEMEN) شریف زادے اس بہانے سے کہ انھیں ڈنر یا سپر چاہیئے، جان بوجھ کر ٹھہر جاتے لیکن در اصل صرف اس لئے کہ اُسے تھوڑی دیر اور دیکھ لیں مسافر کتنا ہی ناراض ہوتا۔ اُسے دیکھتے ہی ٹھنڈا پڑ جاتا اور مجھ سے نرمی سے بات کرتا۔ ذرا سوچیئے تو جناب؟ نامہ بردار پیغام لے جانے والے سوار تک اس سے آدھ آدھ گھنٹہ بات کرتے سارے گھر کا بوجھ اس کے کاندھوں پر تھا۔

کیا صاف کرنا ہے؟ کیا تیار کرنا ہے؟ اُسے ہر چیز کا خیال رہتا۔ اور میں بوڑھا پاگل جو تھا، اس کی کافی قدر نہ کر سکا۔ اُس سے کافی مسرت حاصل نہ کر سکا۔ کیا میں اپنی دونیا سے پیار نہیں کرتا تھا۔ کیا میں اپنی بیٹی کو دل سے نہیں چاہتا تھا؟ کیا وہ میرے ساتھ خوش نہیں تھی؟ خیر۔ انسان اپنی قسمت سے نہیں بھاگ سکتا جو قسمت میں لکھا ہوتا ہے، ہو کر رہتا ہے؛

یہاں پہنچ کر وہ مجھے اپنی بدقسمتی کی تفصیل سنانے لگا۔ تین برس پہلے سرما کی ایک شام کو جب پوسٹ ماسٹر ایک نئے روزنامے پر لکیریں کھینچ رہا تھا۔ اور اُس کی بیٹی اوٹ کے پیچھے اپنے لئے ایک نیا فراک سی رہی تھی، ایک گاڑی آکر رکی اور ایک سرکاسین ٹوپی والا مسافر ایک بڑا فوجی کوٹ پہنے اور گلے کے ارد گرد ایک گلوبند لپیٹے کمرے میں داخل ہوا اور اُس نے گھوڑوں کا مطالبہ کیا۔ تمام گھوڑے باہر سڑک پر جا چکے تھے۔ یہ سُن کر مسافر اپنی آواز اور اپنا کوڑا بلند کرنے ہی والا تھا کہ دونیا جو ایسے واقعات کی عادی تھی۔ اوٹ کے پیچھے سے بھاگ باہر نکل آئی اور اس نے بڑے تحمل سے پوچھا کہ کیا مسافر کچھ کھانا پسند نہیں کریگا دونیا کی آمد کا حسب معمول اثر ہوا۔ مسافر کا غصہ اتر گیا وہ گھوڑوں کا انتظار کرنے پر راضی ہو گیا اور اس نے کچھ سپر منگوایا۔ جب اُس نے اپنی گیلی بالدار ٹوپی اتار دی اور گلوبند کھول دیا اور اپنا بڑا کوٹ جھٹکا دے کر جسم سے الگ کر لیا تو وہ ایک چھریرے جسم اور چھوٹی چھوٹی مونچھوں والا کسی فوجی رسالے کا نوجوان ثابت ہوا وہ آرام سے ایک چھوٹی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اور پوسٹ ماسٹر۔۔۔۔

اور اُس کی بیٹی سے ہنسی خوشی باتیں کرنے لگا۔ سپر چن دیا گیا اس اثنا میں گھوڑے بھی آ گئے تھے۔ اور پوسٹ ماسٹر نے حکم دیا کہ انھیں کچھ کھلائے بغیر فوراً مسافر کی گاڑی میں جوت دیا جائے لیکن جب وہ صحن سے واپس لوٹا تو اس نے نوجوان آدمی کو بیہوشی کی حالت میں بنچ پر لیٹے ہوا پایا۔ وہ بیمار پڑ گیا تھا۔ اس کا سر پھٹا جا رہا تھا۔ اس کے لئے سفر جاری رکھنا ممکن نہیں تھا۔۔۔۔۔ کیا کیا جا سکتا تھا! پوسٹ ماسٹر نے اپنا بستر اُسے دے دیا اور یہ طے پایا کہ اگر بیمار آدمی کی حالت اگلی صبح تک بہتر نہ ہوئی تو ڈاکٹر کو لانے کے لئے کسی کو شہر بھیجا جائے گا۔

اگلے دن سوار کی حالت بدتر ہو گئی۔ اس کا نوکر گھوڑے پر سوار ہو کر ڈاکٹر کو لانے شہر گیا۔ دونیا نے سرکے میں بھگوئی ہوئی پٹی اس کے سر پر باندھی۔ اور اس کے بستر کے پاس بیٹھ کر سلائی کرنے لگی۔ جب تک پوسٹ ماسٹر وہاں رہا۔ بیمار آدمی کراہتا رہا اور اُس نے منہ سے ایک لفظ تک نہ نکالا۔ تاہم اُس نے قہوہ کے دو پیالے پی لئے۔ اور کراہتے کراہتے کچھ لنچ لانے کا حکم دیا۔ دونیا اُس کے پاس سے نہ اٹھی۔ وہ بار بار کچھ پینے کو مانگتا اور دونیا اپنے ہاتھوں سے تیار کئے ہوئے لیموں کے رس کی ایک صراحی اس کے پاس لے جاتی۔ بیمار آدمی اپنے ہونٹوں کو تر کرتا اور جب بھی وہ صراحی واپس دیتا۔ وہ اظہار تشکر کے لئے دونیا کا ہاتھ اپنی کمزور انگلیوں سے دبا دیتا۔ لنچ کے وقت ڈاکٹر آ گیا۔ اس نے مریض کی نبض دیکھی۔ جرمنی زبان میں اس سے باتیں کیں۔ اور روسی زبان میں اعلان کیا کہ مریض آدمی کو صرف آرام اور سکون کی ضرورت ہے۔ اور وہ چند ایک

دنوں میں اس قابل ہو جائے گا کہ اپنا سفر جاری رکھ سکے۔ فوجی نے اُسے
اُس کی زحمت کے صلے میں بیس روپے کی موٹی رقم ادا کی۔ اور اسے لنچ کی
دعوت دی۔ ڈاکٹر نے دعوت قبول کر لی۔ دونوں نے خوب پیٹ بھر کر
کھایا، شراب کی ایک بوتل کھولی۔ اور ایک دوسرے سے بہت خوش
ہو کر جدا ہوئے۔

ایک دن اور گزر گیا اور فوجی بالکل تندرست ہو گیا۔ وہ
غیر معمولی طور پر خوش تھا۔ وہ بار بار پوسٹ ماسٹر اور اُس کی بیٹی سے
مذاق کرتا، سیٹی بجا کر دُھنیں نکالتا۔ مسافروں سے گپیں ہانکتا
اُن کے پاس نقل کرتا۔ معزز پوسٹ ماسٹر اُس سے اس قدر مانوس
ہو گیا کہ اُسے تیسری صبح اپنے دلآویز مہمان سے جدا ہوتے وقت کافی
افسوس ہوا۔ وہ اتوار کا دن تھا اور دونیا گرجا گھر جانے کی تیاری
کر رہی تھی۔ فوجی کی گاڑی اُدھر لائی گئی۔ اس نے پوسٹ ماسٹر کو
الوداع کہی اور اپنے قیام کے عوض دل کھول کر انعام دیتے ہوئے
دونیا سے رخصت چاہی۔ اور اُسے گاڑی میں بٹھا کر گرجا گھر تک چھوڑنے
کے لئے جو گاؤں کے سرے پر واقع تھا۔ اپنی خدمات پیش کیں،
دونیا ہچکچائی .... "تجھے ڈر کس بات کا ہے؟" اس کے باپ نے
پوچھا۔ "یہ شریف زادہ بھیڑیا تو نہیں، یہ تجھے کھا تو نہیں جائے گا
گاڑی میں بیٹھ کر گرجا گھر تک چلی جا!" دونیا فوجی کے ساتھ گاڑی
میں بیٹھ گئی۔ نوکر اچھل کر گاڑی کے بکس میں بیٹھ گیا۔ کوچوان
نے سیٹی بجائی۔ اور گھوڑے سرپٹ روانہ ہوئے۔

بیچارہ پوسٹ ماسٹر سمجھ ہی نہ سکا کہ اُس نے دونیا کو فوجی
کے ساتھ بیٹھنے کی اجازت کیسے دے دی، وہ اس قدر اندھا
کیسے ہو سکتا تھا۔ اس کے ہوش و حواس کہاں ٹھیک تھے
ابھی آدھ گھنٹہ بھی نہیں گزرا تھا کہ وہ فکرمند ہونے لگا اور
آخرکار اُس پر بے چینی اس درجہ غالب آ گئی کہ وہ اپنے آپ کو
گرجا گھر کی طرف جانے سے نہ روک سکا۔ جب وہ گرجا گھر کے قریب
پہنچا تو اس نے دیکھا کہ مجمع اس وقت منتشر ہو رہا تھا لیکن دونیا گرجا
گھر کے باہر بھی نہ (PARCH) چھجے کے نیچے۔ وہ جلدی سے
اندر گیا۔ پادری ممبر سے اُتر رہا تھا۔ نگہبان بتیاں بجھا رہا تھا۔ دو
بوڑھی عورتیں ابھی تک ایک کونے میں دعا مانگ رہی تھیں۔ لیکن دونیا
کا کوئی نشان نہیں تھا۔ پوسٹ ماسٹر نے اپنی ہچکچاہٹ پر قابو
پا کر نگہبان سے پوچھا کہ کیا اس کی بیٹی پرستش کے وقت موجود تھی
نگہبان نے جواب دیا کہ وہ موجود نہیں تھی۔ پوسٹ ماسٹر آپے سے
باہر ہو کر گھر لوٹا۔ ایک اُمید باقی رہ گئی تھی کہ شاید دونیا نے
کم سنی سے کام لے کر جو اس کے سن کا خاصہ ہے۔ گاڑی میں بیٹھ
کر اگلی چوکی تک جانے کا ارادہ کر لیا ہو۔ جہاں اُس کی دادی
رہتی تھی۔ فکر میں جکڑا ہوا وہ اُس گاڑی کی واپسی کا انتظار کرنے
لگا۔ جس سے اُس نے دونیا کو جانے دیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ
کوچوان کبھی نہیں آئے گا۔ آخرکار وہ شام کے قریب اکیلا اور
شراب کے نشے میں چور، یہ تباہ کن خبر لے کر نمودار ہوا کہ دونیا
اگلی چوکی سے فوجی کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ کر چلی گئی ہے۔

بوڑھا آدمی اپنی بدقسمتی برداشت کرنے کے قابل نہیں تھا
وہ جھٹ اُس بستر پر پڑ گیا۔ جس پر دو دن پہلے وہ نوجوان دھوکے باز
لیٹا ہوا تھا۔ تمام حالات کا جائزہ لے کر اُس نے اندازہ لگایا کہ
فوجی کی بیماری بناوٹی تھی۔ وہ بدنصیب شدید بخار سے بیمار
پڑ گیا۔ اُسے شہر ــــ بھیج دیا گیا۔ اور اُس کی جگہ عارضی طور پر کسی
دوسرے نے لے لی۔ وہی ڈاکٹر جس نے فوجی کی تیمارداری کی تھی
اس کی حالت دیکھنے کے لئے بلایا گیا۔ اس نے پوسٹ ماسٹر کو یقین
دلایا کہ وہ نوجوان آدمی بالکل تندرست تھا۔ اور اُسے اُس کے
برے ارادے کا شک اُسی وقت ہوا تھا لیکن وہ فوجی کے چابک کے
ڈر کے مارے چپ ہو رہا تھا۔ جرمن سچ بول رہا تھا یا وہ محض اپنی
ذہانت کا اظہار کرنا چاہتا تھا۔ جو کچھ اس نے کہا اُس سے غریب
آدمی کو کسی طرح تسکین نہ پہنچی۔ ابھی وہ بیماری سے بمشکل رو بصحت
ہوا تھا کہ اُس نے شہر ــــ کے پوسٹ ماسٹر سے دو مہینے غیر حاضر
رہنے کی چھٹی لے لی۔ اور کسی کو اپنے ارادے کی خبر کئے بغیر اپنی بیٹی کی
تلاش میں پیدل چل نکلا۔ فوجی کے پروانہ راہداری کے اندراج
سے اُسے معلوم تھا کہ کپتان منسکی (MINSKY) سمولنسک سے سینٹ
پیٹرسبرگ کی جانب سفر کر رہا تھا۔ جس شخص نے اُس کی گاڑی چلائی تھی اس
نے بتایا کہ دونیا سارا راستہ روتی رہی تھی حالانکہ ظاہر یہ ہوتا تھا کہ وہ
اپنی مرضی سے چلی گئی تھی۔ پوسٹ ماسٹر نے سوچا شاید میں اپنی کھوئی ہوئی
بچی کو گھر واپس لے آؤں، یہ سوچتا ہوا وہ سینٹ پیٹرسبرگ پہنچا۔ وہ
ازمیلوسکی کے بارکوں میں ایک غیر کمیشن یافتہ افسر کے یہاں ٹھہر گیا جس کے
ساتھ اُس نے فوج میں نوکری کی تھی اور اس نے تلاش شروع کر دی
اُسے جلد ہی معلوم ہو گیا کہ کپتان منسکی، سینٹ پیٹرسبرگ میں ہے اور ہوٹل میں
ٹھہرا ہوا ہے۔ پوسٹ ماسٹر نے تہیہ کر لیا کہ وہ اس سے وہیں ملے گا
صبح سویرے وہ کپتان کے بیٹھکی کمرے میں داخل ہوا اور اس نے

درخواست کی کہ جناب والا کو اطلاع دی جائے کہ ایک بوڑھا فوجی اُن سے ملنے کی خواہش رکھتا ہے، سائیس نے، جو درخت پر ایک جوتا رکھ کر اُسے پالش کر رہا تھا۔ جواب دیا کہ اس کا مالک سو رہا ہے اور گیارہ بجے سے پہلے کسی سے نہیں ملتا۔ پوسٹ ماسٹر چلا گیا اور مقررہ وقت پر واپس آ گیا۔ مینسکی شب خوابی کا لبادہ اور سر پر ایک سُرخ رنگ کی ٹوپی پہنے خود اُس سے ملنے کے لئے باہر آیا۔ "کیوں بھئی کیا چاہیے؟" بوڑھے آدمی کا دل کھول اٹھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور وہ کانپتی ہوئی آواز میں صرف اتنا کہہ سکا۔

"جناب والا۔ خدا کے لئے — مہربانی کر کے —"

مینسکی نے اس پر ایک سرسری نظر ڈالی۔ مینسکی کا چہرہ سُرخ ہو گیا۔ پوسٹ ماسٹر کا ہاتھ پکڑا۔ اُسے اپنی مطالعہ گاہ میں لے گیا اور پیچھے سے دروازہ بند کر دیا۔ "جناب والا،" بوڑھے نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا "جو چھکڑے سے گر گیا وہ کھو گیا وہ گم ہو گیا۔ کم از کم میری غریب دونیا کو تو مجھے واپس دے دیجئے، آپ اس لڑکی سے لطف اندوز ہو چکے ہیں۔ اُسے بلاوجہ تباہ تو نہ کیجئے"! "اب پچھتائے کیا ہوت، جب چڑیاں چگ گئیں کھیت"! نوجوان آدمی نے سراسیمہ ہو کر کہا، میں نے تمہارے حق میں بُرا کیا ہے۔ اور مجھے تم سے معافی ضرور مانگنی چاہیئے۔ لیکن یہ خیال ایک منٹ کے لئے بھی دل میں نہ لاؤ کہ میں دونیا کو چھوڑ دوں گا۔

میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ وہ خوش رہے گی، وہ تمہارے پاس واپس کیوں جائے؟ وہ مجھ سے محبت کرتی ہے۔ وہ اپنے گذشتہ حالات کو بھلا چکی ہے۔ جو کچھ ہو گیا ہے، اُسے وہ یا تم کبھی نہیں بھلا سکو گے! پھر اُس نے بوڑھے آدمی کی آستین میں پیچھے سے کچھ ڈال کر دروازہ کھولا پوسٹ ماسٹر نہ جانے کس طرح پھر اپنے آپ کو گلی میں پایا۔

بڑی دیر تک وہ بے حس و حرکت کھڑا رہا۔ پھر اس کی نظر اپنی آستین میں ایک لپٹے ہوئے کاغذ پر پڑی۔ اس نے اُسے باہر کھینچا اور پچاس پچاس روبل کے چند .... مروڑے ہوئے۔ نوٹ کھولے۔ ایک بار پھر آنسو — غم و غصہ کے آنسو — اُس کی آنکھوں میں بھر آئے۔ اس نے نوٹوں کو توڑ مروڑ کر ایک گیند بنایا۔ انہیں زمین پر دے مارا۔ انھیں قدموں تلے روندا۔ اور اپنا راستہ لیا۔ .... ذرا تھوڑی دور جانے کے بعد وہ رُکا۔ اس نے ایک لمحے کے لئے سوچا — اور

اُلٹے قدم واپس آیا۔ ...... لیکن اب نوٹ وہاں نہیں تھے، ایک خوش پوش جوان آدمی اُسے قریب آتے دیکھ کر ایک گاڑی کی طرف لپکا اچھل کر اندر چلا گیا۔ اور چلایا "لے چلو" پوسٹ ماسٹر نے اُسے پکڑنے کی کوشش نہ کی، اس نے پکا ارادہ کر لیا کہ وہ واپس جا کر دوبارہ نوکری کرے گا۔ لیکن اُس کے جی میں آئی کہ ایسا کرنے سے پہلے اُسے اپنی غریب دونیا سے آخری مرتبہ ضرور مل لینا چاہیئے، اس اُمید کو دل میں لے کر وہ دو دن کے بعد مینسکی کی جائے رہائش پر پہنچا۔ لیکن سائیس نے ٹھنک کر اس سے کہا کہ اس کا مالک کسی سے ملنا نہیں چاہتا۔ اُسے نکال باہر کیا۔ اور اس کے پیچھے کھٹ سے دروازہ بند کر دیا۔ پوسٹ ماسٹر تھوڑی دیر وہاں کھڑا رہا۔ اور پھر اس نے اپنا راستہ لیا۔

اُسی دن شام کو وہ چرچ اوف آل آفلکٹڈ (CHURCH OF ALL AFFLICTED) کے گرجا گھر میں پرستش میں شریک ہونے کے بعد لٹینیا سٹریٹ پر چل رہا تھا کہ ایک خوبصورت گاڑی اُس کے قریب سے تیزی سے گزری۔ اور اُس نے اُس گاڑی میں مینسکی کو پہچان لیا۔ گاڑی ایک سہ منزلہ مکان کے دروازے پر رُکی۔ اور فوجی دوڑ کر سیڑھیوں پر چڑھا۔ پوسٹ ماسٹر کے ذہن میں ایک مسرت خیز خیال دوڑ گیا۔ وہ واپس مڑا۔ اور کوچوان کے پاس جا کر اس نے پوچھا۔ بھائی یہ گھوڑا کس کا ہے؟ کیا یہ کیپٹن مینسکی کا تو نہیں؟ تو ٹھیک کہتا ہے۔ کوچوان نے جواب دیا۔ "لیکن تجھے اس سے کیا؟ بات یہ ہے کہ تمہارے آقا نے مجھے ایک رقعہ اس کی دونیا تک پہنچانے کا حکم دیا ہے اور میں وہاں گیا بھی لیکن یہ بھول گیا کہ وہ رہتی کہاں ہے"

"ارے ٹھیک یہیں۔ دوسری منزل پر"۔ لیکن بھائی تو رقعہ لے کر دیر سے پہنچا ہے، وہ اُسی کے پاس خود پہنچ گیا ہے"

"کچھ پروا نہیں، پوسٹ ماسٹر نے جواب دیا۔ مہربانی، جو تم نے یہ بتا دیا لیکن مجھ سے جو کہا گیا ہے۔ مجھے ضرور کرنا چاہیئے۔ اور یہ کہہ کر وہ مکان کے اندر داخل ہوا۔ اور سیڑھیوں پر چڑھ گیا۔

دروازہ بند تھا۔ اُس نے گھنٹی بجائی۔ چند سکینڈ تکلیف دہ انتظار میں گذرے۔ قفل میں ایک کنجی نے رگڑ کھائی اور دروازہ کھل گیا۔ اُس نے پوچھا "کیا اودوتیا سیمیونوونا، یہاں رہتی ہے؟" "ہاں یہیں رہتی ہے،" نوخیز نوکرانی نے جواب دیا۔ "تمہیں اس سے کیا کام ہے؟" پوسٹ ماسٹر جواب دیئے بغیر اندر چل دیا۔ "ٹھیرو، ٹھیرو،" لڑکی اس کے پیچھے سے چلائی اودوتیا سیمیونوونا کے پاس ملاقاتی ہیں۔

لیکن اس کی بات پر کوئی توجہ دیئے بغیر پوسٹ ماسٹر آگے بڑھتا گیا۔ پہلے تو

کمروں میں اندھیرا تھا۔ لیکن تیسرے کمرے میں روشنی تھی۔ وہ کھلے ہوئے دروازے تک پہنچا اور رُک گیا۔ خوبصورتی سے سجائے ہوئے کمرے میں رینسکی سوچ میں کھویا ہوا بیٹھا تھا۔ دُونیا جدید ترین فیشن کے کپڑوں میں ملبوس، اُس کی کرسی کے بازو پر اس طرح بیٹھی تھی گویا ایک رُخی کاٹھی پر کوئی خاتون۔ وہ اپنی چمکتی ہوئی اُنگلیوں کے گرد اپنے بالوں کے کالے گھونگروں کو لپیٹتی ہوئی رینسکی کو میٹھی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ اُسے اپنی بیٹی اس قدر حسین کبھی نہیں دکھائی دی تھی۔ وہ اُسے حیرت سے دیکھے بنا نہ رہ سکا۔

یہ کون ہے؟ اُس نے سر اوپر اٹھائے بغیر پوچھا۔ پوسٹ ماسٹر نے کچھ نہ کہا۔ کوئی جواب نہ پاکر اُس نے اوپر نظر اٹھا کر دیکھا ــــ اور ایک چیخ مار کر قالین پر دھڑام سے گر پڑی۔ رینسکی گھبرا کر اُسے اٹھانے کے لئے لپکا۔ پھر بوڑھے آدمی کو دروازے میں دیکھ کر اُس نے دونیا کو چھوڑ دیا اور غصے سے کانپتے ہوئے اُس کی جانب بڑھا۔

" تجھے کیا چاہیئے؟" اُس نے دانت پیس کر کہا، تو ایک ڈاکو کی طرح میرے پیچھے پیچھے کیوں رینگتا پھرتا ہے؟ کیا تو میرا گلا کاٹنا چاہتا ہے؟ نکل جا، یہاں سے ــــ" اور اُس نے بوڑھے آدمی کے کوٹ کا کالر اپنی طاقتور مٹھی میں پکڑ کر اُسے دھکا دے کر سیڑھیوں پر پھینک دیا۔

بوڑھا آدمی اپنی جائے رہائش کو لوٹ آیا۔ اُس کے دوست نے اُسے رپٹ لکھوانے کا مشورہ دیا۔ لیکن پوسٹ ماسٹر نے تھوڑی دیر سوچا، مایوس ہو کر اپنا ہاتھ ہوا میں ہلایا۔ اور کشمکش کو ختم کرنے کا فیصلہ کر لیا دو دن بعد وہ پیٹرسبرگ سے چلا آیا اور واپس اپنی چوکی کو لوٹ آیا۔ جہاں اُس نے اپنے فرائض دوبارہ سنبھال لئے۔

اُس نے بات ختم کرتے ہوئے کہا یہ تیسرا سال ہے جو میں دونیا کے بغیر گزار رہا ہوں۔ اور اُس کی طرف سے یا اس کی بابت ایک لفظ نہیں سنا وہ زندہ ہے یا مر گئی ہے، صرف خدا ہی جانتا ہے ہر قسم کی باتیں واقع ہوتی ہیں وہ سب سے پہلی لڑکی نہیں اور نہ ہی وہ سب سے آخری لڑکی ہوگی، جسے ایک حرامزادے مسافر نے اغوا کیا۔ تھوڑا عرصہ اپنے ساتھ رکھا اور پھر اُسے رَدّ کر دیا سینٹ پیٹرسبرگ میں اس قسم کی بے شمار نوجوان بیوقوف لڑکیاں ہیں۔ آج ریشم و کمخواب میں ملبوس اور کل تم اُنہیں سرائے کی (TAVERNSLUMS) گندی عورتوں کے ساتھ گلیوں کا کوڑا کرکٹ صاف کرتے ہوئے پاؤ گے اگر تم تھوڑی دیر رک کر سوچنے لگو کہ شاید دونیا کا انجام بھی ویسا ہی ہوگا۔ تو تم گناہ کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اور تمہیں یہ خواہش بھی ہوگی کہ کاش وہ مر گئی ہوتی۔

یہ کہانی تھی جو میں نے اپنے دوست بوڑھے ماسٹر کی زبانی سنی ایک ایسی کہانی جس کا سلسلہ کئی بار آنسوؤں نے توڑ دیا جنہیں اُس نے میتریف کی دلآویز چار بیت کے وفادار کردار تیسر بیتیچ کی طرح اپنے کوٹ کے ہیم سرے سے دلکش انداز سے پونچھ دیا۔ یہ آنسو کسی حد تک شراب کی وجہ سے بھی نکل آئے تھے۔ جس کے پانچ گلاس اُس نے کہانی سنانے کے دوران میں حلق سے نیچے اتار لئے تھے، لیکن کچھ بھی ہو مجھ پر اُن کا گہرا اثر پڑا۔ اُس سے رخصت ہونے کے بعد دیر تک میں بوڑھے پوسٹ ماسٹر کو بھول نہ سکا۔ بڑی دیر تک میں بیچاری دونیا کی بابت سوچتا رہا

بہت عرصہ نہیں گزرا تھا کہ جب میں ــــ کے قصبے سے گزر رہا تھا کہ مجھے اپنا دوست یاد آ گیا۔ مجھے معلوم ہوا کہ وہ چوکی جو اُس کی نگرانی میں تھی، اب ہٹا دی گئی ہے لیکن جب میں نے یہ پوچھا کہ کیا پوسٹ ماسٹر ابھی تک زندہ ہے یا نہیں تو کسی نے کوئی تسلی بخش جواب نہ دیا۔ نتیجتاً اُسی جانی پہچانی جگہ جانے کا ارادہ کر لیا۔ چند گھوڑے کرائے پہ لئے اور ان کے گاؤں کی طرف چل دیا۔

خزاں کا موسم تھا۔ چھوٹے چھوٹے سیپ سیپ۔ بادل آسمان پر چھائے ہوئے تھے۔ ٹھنڈی دار کھیتوں کی جانب سے خنک ہوا چل رہی تھی، درختوں سے ٹکراتی ہوئی اُن سے سُرخ اور پیلے پتے چھینتی ہوئی ــــ میں گاؤں میں اُس وقت پہنچا جب سورج ڈوب رہا تھا اور میں ڈاک کی چوکی کے سامنے رُک گیا۔ اُسی دروازے سے.... جہاں ایک بار دونیا نے مجھے چوما تھا۔ ایک موٹی دیہاتی عورت نکلی جس نے میرے سوالوں کا جواب ان الفاظ میں دیا کہ بوڑھے پوسٹ ماسٹر کو مرے ہوئے ایک سال ہو گیا ہے، اور اُس کے گھر میں ایک شراب کشید کرنے والا آ گیا ہے اور وہ خود اُس شراب کشید کرنے والے کی بیوی ہے۔ مجھے اپنے مصرفِ سفر اور اُن سات روبلوں پر جو میں نے بے کار خرچ کر دیئے تھے، افسوس ہونے لگا۔

" وہ کس چیز سے مرا؟" میں نے شراب کشید کرنے والے کی بیوی سے پوچھا۔

" شراب، جناب " اُس نے جواب دیا

" اور وہ دفنایا کہاں گیا ہے ــــ؟"

" گاؤں کے باہر، اپنی بیوی کے پاس"

" کیا مجھے کوئی اُس کی قبر تک لے جا سکتا ہے؟"

" ہاں۔ کیوں نہیں اوونیکا! بلی کو کافی تنگ کر چکا ہے تو اب ان صاحب کو قبرستان لے جا اور انہیں پوسٹ ماسٹر کی قبر دکھا دے"

یہ الفاظ سن کر پھٹے پرانے کپڑوں میں ملبوس ایک کانا اور سُرخ بالوں والا لڑکا بھاگ کر گھر سے نکلا۔ اور مجھے گاؤں سے باہر لے گیا۔

"کیا تم پوسٹ ماسٹر کو جانتے تھے؟" میں نے چلتے چلتے پوچھا

"بے شک! میں جانتا تھا۔ خدا اُس کا بھلا کرے! اُس نے مجھے سرکنڈوں کو کاٹنا سکھایا۔ وہ سرائے سے باہر نکلتا اور ہم پیچھے سے اُسے پکارتے "دادا جان! دادا جان! ہمیں کچھ اخروٹ دو" اور وہ ہمیں اخروٹ بھی دیتا۔ وہ سارا وقت ہم سے کھیلتا رہتا تھا"

"کیا مسافر ابھی تک اس کی بابت باتیں کرتے ہیں؟"

"نہیں، ان دنوں زیادہ مسافر نہیں آتے۔ ثالث کبھی کبھی ادھر سے گزرتا ہے۔ لیکن اُس کے پاس مُردہ لوگوں کے لئے وقت نہیں ہوتا۔ پھر بھی اس بار گرمیوں کے موسم میں ایک خاتون اس طرف آئی تھی۔ اور اُس نے بیچ بیچ بوڑھے پوسٹ ماسٹر کے بارے میں پوچھا۔ اور وہ اس کی قبر پر بھی گئی"

"وہ کس قسم کی خاتون تھی؟" میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

"وہ ایک خوبصورت خاتون تھی۔ لڑکے نے جواب دیا

"وہ تین ننھے بچوں اور ایک آیا اور ایک کالے رنگ کے کتے کو ساتھ لئے چھ گھوڑوں والی گاڑی میں آئی۔ اور جب اُسے بتایا گیا کہ بوڑھا پوسٹ ماسٹر مر چکا ہے تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اور بچوں سے کہنے لگی "تم آرام سے بیٹھو۔ میں قبرستان جاتی ہوں" میں اُسے لے جانے کے لئے اپنے آپ کو پیش کرنے لگا تھا، کہ وہ خاتون کہنے لگی "میں خود راستہ جانتی ہوں" اور اُس نے مجھے چاندی کے پانچ ہوپک دیئے ——— ایسی مہربان خاتون تھی وہ"

ہم قبرستان پہنچ گئے۔ محض زمین کا ایک ٹکڑا تھا باڑھوں سے خالی۔ جس پر لکڑی کی صلیبوں نے نکتے ڈال رکھے تھے۔ اور جس پر اور کسی درخت کا سایہ نہیں تھا۔ میں نے اپنی زندگی میں ایسا اجاڑ قبرستان کبھی نہیں دیکھا تھا۔

یہ رہی بوڑھے پوسٹ ماسٹر کی قبر، لڑکے نے ریت کے ایک ڈھیر پر کودتے ہوئے کہا۔ جس کے اوپر ایک پیتل کے نیتے والی کالے رنگ کی صلیب اُبھری ہوئی تھی۔

"کیا وہ خاتون یہیں آئی تھی؟" میں نے پوچھا۔

"یہیں جناب" وینکلے جواب دیا "میں سے دور سے دیکھ رہا تھا۔ وہ یہاں لیٹ گئی اور بڑی دیر تک لیٹی رہی۔ پھر وہ واپس گاؤں چلی گئی، اس نے پادری کو بلوایا اور اُسے کچھ نقدی دی۔ اور گاڑی میں بیٹھ کر چل دی۔ لیکن مجھے اُس نے چاندی کے پانچ ہوپک دیئے ——— وہ ایک خوبصورت خاتون تھی۔

میں نے بھی اُس لڑکے کو پانچ ہوپک دیئے۔ اور مجھے اپنے سفر یا ان سات روبلوں پر جو میں نے خرچ کر دیئے ذرا بھی افسوس باقی نہ رہا۔

(کتب پبلشرز لمیٹڈ بمبئی کے شکریے کے ساتھ زیرِ طبع کتاب "روسی ادب" کی ایک کہانی)

مولانا ابوالکلام آزاد

متوارث روایات

"انسان کی دماغی ترقی کی راہ میں سب سے بڑی روک اُس کے تقلیدی عقائد ہیں۔ اُسے کوئی طاقت اس طرح جکڑ بند نہیں کر سکتی ہے جس طرح تقلیدی عقائد کی زنجیریں کر دیا کرتی ہیں۔ وہ اُن زنجیروں کو توڑ نہیں سکتا اس لئے کہ توڑنا چاہتا ہی نہیں وہ انھیں زیور کی طرح محبوب رکھتا ہے۔ ہر عقیدہ، ہر عمل، ہر نقطۂ نگاہ جو اُسے خاندانی روایات اور ابتدائی تعلیم و صحبت کے ہاتھوں مل گیا ہے اس کے لئے ایک مقدس ورثہ ہے۔ وہ اس ورثہ کی حفاظت کرے گا۔ مگر اُسے چھونے کی جرأت نہیں کرے گا۔ بسا اوقات موروثی عقائد کی پکڑ اتنی سخت ہوتی ہے کہ تعلیم اور گرد و پیش کا اثر بھی اُسے ڈھیلا نہیں کر سکتا۔ تعلیم دماغ پر ایک نیا رنگ چڑھا دے گی لیکن اس کی بناوٹ کے اندر نہیں اُترے گی۔ بناوٹ کے اندر ہمیشہ نسل، خاندان، اور صدیوں کی متوارث روایات ہی کا ہاتھ کام کرتا رہیگا"

——— ماہنامہ ایشیا فروری ۱۹۴۹ء

زاویے!

قمر ہاشمی

بھٹک رہے ہیں ابھی کارواں غریبی کے — لرز رہی ہے جبیں آسمان و انجم کی
ترس رہے ہیں خوشی کیلئے ہزاروں دل — ابھی لبوں......کو اجازت نہیں تبسّم کی

ابھی تو ظلمتیں چھائی ہوئی ہیں گلشن پر — ابھی تو خار بھی پھولوں پہ مسکراتے ہیں
ابھی چمن ہیں خرابِ جہانِ رنگ و بو — ابھی تو مہر کا ذرّے بھی منہ چڑاتے ہیں

ابھی نظام قتیلِ تبسّمِ زر ہے — ابھی ہوس کی نگاہوں میں ہے تنومندی
ابھی حکومتیں اخلاص پر نہیں قائم — نصیبِ طبقۂ عمّال ہے برومندی

ابھی ہمارے شب و روز ہیں الم بر دوش — ابھی غریب کی کٹیا میں ہے اندھیرا ہی
ابھی تو راج دلارے زمیں کے بےکل ہیں — ابھی عزیز ہے اُن کو یہ دکھ بسیرا ہی

ابھی ہمارے ارادے ہیں برپا شکست — نہ آسکے گی ہمیں راس ظلمتوں کی بہار
ابھی تو بھوک کی بستی میں اک ہلچل ہے — ابھی عوام کی دُنیا ہے درخورِ آزار

ابھی بہار اسیرِ خزاں رہے شاید
حیات اور جراحت نشاں رہے شاید

خلیل الرب۔ ایم۔ اے

فانیؔ کے نظریۂ حیات کا اثر ان کی شاعری پر

فانیؔ اردو کے ایک باکمال مگر بدنصیب شاعر تھے انھیں فنِ شعر کا پختہ شعور تھا۔ ان کی شاعری میں وہ چمک دمک اور وہ خود گزاری و خود سپاری تو نہیں ملتی جو ان کے بعض ہم عصروں کے یہاں نظر آتی ہے لیکن اس میں فنی خوبیوں کی کمی نہیں ہے ان کی طرزِ ادا میں پُرکاری اور اسالیب بیان میں تنوع ہے۔ ان کے یہاں گہرائی بھی ملتی ہے اور کسی قدر گیرائی بھی۔ گہرائی اس لئے کہ انھوں نے فکر اور جذبہ کا امتزاج پیدا کرنے کی کوشش کی اور گیرائی اس لئے کہ وہ خالص شاعری کے قائل تھے اور اس خارجی آب و رنگ یا شعریت کو ضروری خیال کرتے تھے، جو شعر میں چستی، برجستگی اور رنگینی پیدا کرے، جس میں ایک تعمیری حسن ہو جو شعر سننے والے کو متاثر کر سکے۔ ان شاعرانہ محاسن کے باوجود فانی کی وہ قدر و منزلت نہ ہوئی اور انھیں وہ قبولیتِ عام میسر نہ آئی جس کا وہ اپنے کو مستحق سمجھتے رہے ہوں گے۔ فانیؔ نے زندگی کو محض ایک دیوانہ کا خواب[1] سمجھا اور اس سے گریز کیا۔ زندگی نے ان سے انتقام لیا۔ مگر شاعری نے بھی ان سے دفا نہ کی، جس کا کہ فانی نے زندگی میں سہارا لیا تھا۔ فانی کی اس ناکامی کا راز کیا ہے؟ آپ اس سوال کو کسی عنوان سے اٹھائیے۔ جواب صرف ایک ہے۔

فانیؔ کی اس ناکامیابی کا راز ان کے نظریۂ حیات میں مضمر ہے فن کار کا زاویۂ نگاہ، اور نظریۂ حیات اس کے فن کی اساس ہوتا ہے اس نظریہ میں جتنی ہمہ گیری، جتنی وسعت اور بلندی ہو گی اسی قدر اس کی عظمت زیادہ ہو گی۔ اور اس میں عالمگیر قبولیت اور اثر آفرینی کے امکانات زیادہ ہوں گے۔ آرٹ کی دنیا میں وہی فنکار ایک بڑے فن کار کا درجہ پائے گا۔ جس نے زندگی کو پورے طور پر اور ہر ممکن رُخ سے دیکھنے کی کوشش کی ہو اور جس کی فنی تخلیق میں زندگی کی زیادہ سے زیادہ حقیقتوں کو زیادہ سے زیادہ لوگوں کے لئے بے نقاب کرنے کی کوشش کی گئی ہو۔ جس میں زندگی کا ہر سایہ، ہر حرکت اور ہر رنگ نظر آئے اور جس میں ایک دیکھنے والی اور محسوس کرنے والی مخلوق کے دل کی دھڑکن[1] ہمیشہ سنائی دے۔

آرٹ کے اس بنیادی اصول کو سامنے رکھ کر فانیؔ کے کلام کا تجزیہ کرنے سے معلوم ہو گا کہ انھوں نے اپنے نظریۂ حیات کے اثر سے جن موضوعات کو اپنی شاعری کا محور بنایا وہ نہایت محدود تھے اور وہ زندگی کا کوئی زندہ اور وسیع تخیل ہمارے سامنے پیش نہیں کرتے

فانی کے موضوعات شاعری کے سلسلے میں ہمارا ذہن سب سے پہلے ان کے محبوب ترین موضوع "غم" کی طرف منتقل ہوتا ہے۔ شاعری میں رنج و غم کا بیان ہمیشہ مقبول رہا ہے۔ انسان ان نغموں[2] میں حلاوت محسوس کرتا ہے جن میں گداز ہو، درد کی کسک ہو مگر غمگین نغمے کُل زندگی نہیں ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ "دنیا میں انسان ہنستا کم اور روتا زیادہ ہے اگر کوئی قہقہوں اور آنسوؤں کو ایک ترازو میں تولے تو آنسوؤں کا پلڑا بھاری رہے گا" یہ بیان زندگی کا نہ صرف یک رُخا نظریہ پیش کرتا ہے بلکہ ناقص بھی ہے۔ یہ بیان حقیقت سے قریب تر ہو جائے گا۔ اگر ہم یہ سمجھ لیں ۔

---

[1] ایک معمہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا
زندگی کا ہے کو ہے خواب ہے دیوانے کا

[1] یہ وہ دھڑکن ہے جسے فراقؔ اپنے مخصوص انداز میں "سنا ٹا گیت" کہا ہے
[2] انگریزی کے مشہور شاعر شیلے کا کہنا ہے کہ:-
ہمارے شیریں ترین نغمے وہ ہیں جو ہمیں غم کی یاد دلاتے ہیں۔

عالم ایجاد اک مجموعۂ اضداد ہے
اختلافِ رنگ و بو سے انجمن آباد ہے (فانی)

ہم اپنے رنج و خوشی کے پیمانے سے دنیا کے رنج اور خوشی کو ناپتے ہیں "بخمیرۂ فطرتِ گلشن اس قید سے آزاد ہے" انسانی زندگی میں غم اور خوشی اس طرح پیوست ہیں کہ ان کو علیحدہ علیحدہ خانوں میں رکھ کر تولا نہیں جا سکتا۔ اس نوع کی تعلیم کا خیال ہمیشہ ان دماغوں میں پیدا ہوتا ہے جو خیالی دنیا میں زندگی بسر کرتے ہیں اور عمل کی دنیا سے کوئی واسطہ نہیں رکھتے۔ جن کے نزدیک تخیل سب کچھ ہے تجربہ کچھ نہیں جو زندگی کے جدلیات سے گریز کرتے ہیں۔

فانی کے فلسفۂ غم کے متعلق نقادوں نے طرح طرح کی نکتہ آفرینیاں کی ہیں۔ کوئی انہیں غم زدۂ ازلی قرار دیتا ہے، کسی نے اسے شخصی ناکامیوں کا نتیجہ بتایا ہے کوئی اسے موجودہ ماحول کی پیداوار بتاتا ہے جس میں "احساسِ[2] شکست اور غم بے حاصل زیادہ ہے"۔

کسی کے خیال میں جب شاعر کی انفرادیت زمانے کے آئین و قوانین کو، رسم و رواج کو، ماحول اور سماج کو اپنے بچھے ہوئے تیوروں کا ساتھی نہ بنا سکی تو وہ اپنی انفرادیت کے خلاف علمِ بغاوت بلند کرتا ہے اور اس کا گلا گھونٹ کر تسکین حاصل کرنا چاہتا ہے، اپنے ہی گریبان پہ زور چلتا ہے اور خواہشِ مرگ قوی تر ہو جاتی ہے۔

اسی سلسلہ میں ایک غیر جانب دار نقاد[1] کے دل میں کچھ وسوسے پیدا ہوتے ہیں۔ فانی کے حالاتِ زندگی سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی زندگی کا وہ دور جو اثرات قبول کرنے کے لحاظ سے سب سے زیادہ اہم ہوتا ہے۔ نہایت خوش حالی اور فارغ البالی کا تھا اور انہیں نکبت و افلاس کی وہ تلخیاں نہیں جھیلنا پڑیں جن کی بدولت زندگی میں تلخی یا جھلاہٹ پیدا ہو سکتی ہے۔ انھیں ایک معقول آبائی ورثہ ملا جسے انھوں نے دونوں ہاتھوں سے لٹایا۔ یار باش آدمی تھے، جہاں رہتے جانِ محفل بنے رہتے احباب کے جمگھٹے رہتے یا شعر و شاعری کی محفلیں اس طرح گرم رہتیں کہ اکثر کاروبار بھی بھول جاتے، لکھنؤ اور آگرہ کے زمانہ قیام میں "رنگین صحبتوں" کا بھی شوق رہا، اس کے بعد شاہانہ زندگی نہایت خوش گوار اور کامیاب گزری۔ مزاج میں حلم و مروت کے ساتھ ساتھ خود نمائی اور خود داری بہت تھی، طبیعت میں تکلف اس قدر تھا کہ ملنے کے کمرے میں بھی شیروانی پہنے بغیر نہ آتے تھے جس شخص کی زندگی میں یہ حالات[1] بھی ملتے ہوں اور جس کی سیرت میں یہ خصوصیات بھی پائی جاتی ہوں۔ اس کے منہ سے ہر لحظہ غم کا بیان اور خواہشِ مرگ کی تکرار میں قدرتے حیرت ہوتی ہے یہ حیرت ہمیں میر کے سلسلہ میں نہیں ہوتی اس لئے کہ ان کے اشعار پڑھ کر ہم جس قسم کی شخصیت کا تصور کر سکتے ہیں وہی میر کی شخصیت تھی، لیکن فانی کے سلسلے میں اس بیان میں ایک کمزوری ہے۔ ہم ظاہری حالات سے بطون کا قیاس کر سکتے ہیں لیکن یہ ضروری نہیں کہ یہ قیاس ہمیشہ درست ہو اور پھر انسان کی شخصی محرومیوں اور ناکامیوں کا صحیح اندازہ کون لگا سکتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ فانی کو ایسی ذہنی کشمکش اور شخصی ناکامیوں سے دوچار ہونا پڑا ہو جن کا دوسروں کو صحیح علم نہ ہو اور جنہوں نے فانی کے مزاج میں ایک سوگوارانہ کیفیت پیدا کر دی ہو۔ لیکن یہاں ایک اور سوال پیدا ہوتا ہے۔ اگر فانی کا غم ان کی ذاتی ناکامیوں اور محرومیوں کا نتیجہ تھا تو اس کا اثر ان کی تمام عمر کے آخری دور میں ملنا چاہیئے۔ جبکہ وہ اس بات کا اندازہ لگا سکے ہے کہ ان کی زندگی میں آنسوؤں کا پلڑا بھاری رہا یا قہقہوں کا لیکن فانی کے یہاں غم کے بیان کا ارتقا نہیں ملتا۔ عرفانیاتِ فانی کی (جو کہ جدید اور قدیم کلام کے مکمل مجموعہ پر مشتمل ہے) پہلی غزل میں غم کا بیان جو ملتا ہے وہ قافیہ اور ردیف کی تبدیلی کے ساتھ اکثر و بیشتر غزلوں میں آخری غزل تک پایا جاتا ہے۔ ظاہر کی اس ہمواری اور یک رنگی کو دیکھ کر از کم معنوی اعتبار سے شبہ ہوتا ہے کہ شاید ان کے تصوف کی طرح غم کا مضمون بھی عقل کا آفریدہ ہے اور غالباً یہی وجہ ہے کہ میر کے اشعار ہمارے دل پہ جس طرح چوکے لگاتے ہیں اور جس طرح ان کے لہجہ میں گداز اور درد کی کسک ملتی ہے وہ فانی کے یہاں مفقود ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان کی شاعری تمام تر بے اثر ہے ان کے یہاں ایسے اشعار ملتے ہیں جن میں گداز بھی ہے اور چھپی ہوئی نشتریت اور اثر آفرینی بھی۔ مگر ایسے اشعار کی تعداد کم ہے۔ ان کم تعداد اشعار کا نمونہ حسب ذیل ہے

۱ آل احمد سرور صاحب
۲ "کسی" کا اشارہ پروفیسر احتشام حسین صاحب کی طرف ہے۔

۱ یہ حالات ماہر القادری، میکش اکبرآبادی، حکیم مختار احمد بدایونی، تابش دہلوی اور محمد سبطین بدایونی وغیرہ کے مضامین میں ملتے ہیں۔

میں نے فانیؔ ڈوبتی دیکھی ہے نبضِ کائنات
جب مزاجِ یار کچھ برہم نظر آیا مجھے

عشق کی وہ لطافتیں، حسن کی وہ نزاکتیں
ہائے وہ زندگی جو اب خواب و خیال ہو گئی

آج ہم پی سکے نہ وہ آنسو :: ان کے آگے جو بار بار آیا
اک فسانہ سن گئے، اک کہہ گئے :: میں جو رویا مسکرا کر رہ گئے

اللہ رے سکون قلب اس کا جس نے دل لاکھوں توڑ دیئے
جس زلف نے دنیا برہم کی وہ آپ کبھی برہم نہ ہوئی

فانیؔ کے یہاں نہ تو سماج کا دکھ درد ملتا ہے اور نہ "اس کی ہڈیوں کے چٹخنے کی آواز سنائی دیتی ہے۔" ان کا غم انفرادی ہے اور شاعری میں جس آرٹ کے وہ قائل تھے اس میں سماج کے دکھ درد کے بیان کا زیادہ امکان بھی نہ تھا۔ "زندگی[1] کب موت بنتی ہے اور موت کب زندگی"۔ یہ آپ کو مزدور کی زندگی میں بھلے ہی مل جائے مگر فانی کی شاعری میں اس کی تلاش کی مثال ایسی ہے جیسے کہ غالب کی شاعری میں سیاسی بیداری کی۔ گنتی کے چند اشعار اور کشمیر پر تین رباعیوں کے علاوہ ہم کو کہیں بھی فانیؔ کی شاعری میں "اس ماحول کا عکس نہیں ملتا جس میں احساس شکست اور غم بے حاصلی زیادہ ہے، جس میں اچھی باتیں گھٹتی ہیں اور اہل ہنر پریشان رہتے ہیں۔" واقعہ یہ ہے کہ ایک ایسے شاعر سے جو شعر کو شعر کا مقصد سمجھتا ہو اور اسے غایتی بنانے پر کسی طرح تیار نہ ہو، ہم سماج کی شعوری عکاسی کا مطالبہ بھی نہیں کر سکتے۔ آرٹ اور شعر و ادب میں سماج کی شعوری عکاسی کے سلسلے میں ایک اہم نکتہ قابل غور ہے، دوستوں کی سرد مہری، فلک کی ستم رانی اور زمانہ کی قدر ناشناسی اور شاعری کے ایسے موضوع ہیں جن پر ہر اردو شاعر نے طبع آزمائی کی ہے۔ لیکن ان موضوعات پر جس نوع کے اشعار ملتے ہیں اس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ یہ سب روایتی اشعار ہیں۔ جنھیں محسوس کر کے نہیں کہا گیا اور پھر اساتذۂ قدیم کے یہاں تو ایسے اشعار کے لئے ایک جواز بھی ہے۔ لیکن دورِ حاضر میں اس قسم کے اشعار کی حیثیت محض روایتی ہے۔ میر و سودا کا زمانہ یقیناً پریشان حالی اور آشفتہ سامانی کا تھا۔ وہ زمانہ مزدور الیا تھا کہ انفرادی سکون اور اجتماعی چین دونوں مفقود تھے۔ ایک پورا معاشرتی اور سیاسی نظام درہم برہم ہو رہا تھا، مگر نئے نظام کے جنم لینے کے آثار پیدا نہ ہوئے تھے۔ وہ دور احساس شکست اور غم بے حاصلی کا تھا۔ آج اگر کوئی شخص سودا کے ابلق روزگار اور موجودہ زمانہ میں فرق نہیں محسوس کرتا تو وہ نئی قدروں سے عدم آگہی کا ثبوت دیتا ہے۔ آج زمانہ کے تیور یہ ہیں کہ ممولے میں شاہین سے ٹکرانے کا عزم و حوصلہ پیدا ہے۔ اس دور کی شاعری اپنے عہد کی نہایت ناقص ترجمانی کرے گی اگر وہ محض یہ بیان کرے کہ مزدور کی زندگی میں زندگی موت کب بنتی ہے اور موت کب زندگی! اگر اس کی نگاہ صرف دوزخ[2] میں سموئی ہوئی جنت تک پہنچے اور یہ دیکھنے سے قاصر رہے کہ انسانی عزم و حوصلہ اور جد و جہد کس طرح اس دوزخ میں سموئی ہوئی جنت کو سراپا جنت بنانے کی فکر میں منہمک ہے۔ دورِ حاضر کا شاعر یا ادیب اگر اپنی فنی تخلیق میں عصریت کی صحیح روح پھونکنا چاہتا ہے تو اسے محض ذہنی، مادی اور سیاسی کش مکش اور خلفشار کے بیان پر اکتفا نہ کر کے ان زبردست قوتوں اور محرکات کا بھی جائزہ لینا چاہیئے جو سماج کی زیریں سطح میں پوری شد و مد سے مصروف کار ہیں۔ جن سے اک نئی دنیا کی تعمیر ہو رہی ہے اور جن کی بدولت زندگی کی نئی معاشرتی قدریں اور نظریات پختہ اور مستحکم ہو رہے ہیں۔

فانیؔ کے کلام میں غم کا موضوع کس راہ سے آیا یہ ایک دلچسپ سوال ہے لیکن اس سے زیادہ اہم سوال یہ ہے کہ فانیؔ کے غم کی نوعیت کیا ہے۔ غم کے مواقع پر غمگین ہونا یا غم میں آنسو بہانا ایک فطری بات ہے۔ اسی طرح یہ بھی غیر فطری بات نہیں کہ انسان ضبط غم کا حوصلہ پیدا کر لے۔ بڑے سے بڑے صدمے کو دل پر سہہ لے اور زبان سے اف تک نہ کرے، لیکن غم جاوداں[3] کے نہ ملنے کے غم میں گھلنا اور غم میں نشاط کے تمام پہلو تلاش کرنا خلاف فطرت و صحت ہے جسے ہم ایک نفسیاتی بیماری سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ اسی مناکیت کا اثر تھا کہ فانیؔ خوشی میں بھی غم کے پہلو کرید کرید کر نکال لیتے تھے ؎

---

[1] [2] یہ جملے آل احمد سرور کے مضمون "اردو شاعری میں فانی کی قدر و قیمت" سے ماخوذ ہیں۔

[2] پھولوں کی نظر نواز رنگت دیکھی :: مخلوق کی دلگداز حالت دیکھی
قدرت کا کرشمہ نظر آیا کشمیر :: دوزخ میں سموئی ہوئی جنت دیکھی

[3] وہ بدگماں کہ مجھے تاب رنج زیست نہیں
مجھے یہ غم کہ غم جاوداں نہیں ملتا

غم عین نشاط در از تخلیق نشاط ∴ غم محبت انبساط و تصدیق نشاط

غم کا ہے تبسم جسے کہتے ہیں جوہر ∴ ہستی کو ہے غم کے دم سے توفیق نشاط

یہ بیمار ذہنیت جتنی خطرناک ہے اتنی ہی ناپسندیدہ اور ناقابل قبول بھی۔ جس طرح زندہ رہنے کی خواہش ایک ناقابل تردید حقیقت ہے اسی طرح یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ لمحات غم کو حاصل حیات تصور کرنا فطرت انسانی کے خلاف ہے۔ شاید اسی لئے انسان غم کے لمحات کو جلد سے جلد فراموش کرنا چاہتا ہے اور خوشی کے لمحات کو غم کی یاد میں غمگین بنانا گوارا نہیں کرتا۔ اس مسلمہ حقیقت کے خلاف جو مثالیں ملتی ہیں ان کی حقیقت مستثنیات کی ہے۔

غم کی طرح "یاس" کی بھی فانی کی یہاں بے حد فراوانی ہے۔ یاس کا جذبہ (اگر اسے جذبہ کہنا درست ہو) روح رواں کی طرح ان کے کلام میں جاری و ساری ہے۔ ان کو اپنی بدنصیبی و محرومی پر یقین کامل تھا امید و حوصلہ کی کوئی رمق ان کے کلام میں نہیں ملتی۔ جذبات کا فقدان یاس کی کیفیت پیدا کرتا ہے جو جذبۂ غم سے زیادہ مضرت رساں ہے۔ خوشی کی طرح غم کا بھی ایک اثباتی پہلو ہے۔ مگر یاس ایک منفی کیفیت ہے۔ یہ کیفیت اس وقت پیدا ہوتی ہے جب دل میں کوئی ولولہ، کوئی امنگ، کوئی خواہش اور کوئی امید باقی نہ رہ جائے۔ زندگی میں ایسے لمحات آتے ہیں جب انسان پر یہ کیفیت طاری ہوتی ہے لیکن یہ کیفیت زیادہ دیر تک قائم نہیں رہتی ورنہ زندگی اور موت میں کوئی فرق نہ رہ جائے۔ دنیا کی رنگا رنگی جذبات سے عبارت ہے۔ جذبات کے فقدان سے یاس کی جو کیفیت پیدا ہوتی ہے ان کا مزمن[51] ہو جانا شخصی اور اجتماعی زندگی کے لئے یکساں طور پر ہلاکت آفریں ہے۔

فانی میں یاس کی یہ شدت کچھ تو ان کی قنوطی طبیعت کا اثر ہے اور کچھ عجمی تصوف کا عمل اور جد و جہد میں ناکامی کی صورت میں یاس اور ناامیدی کا احساس فطری ہے مگر ہر ناکامی ایک صاحب عمل اور بلند حوصلہ انسان کے حق میں مزید کوشش کے لئے ایک تازیانہ ہے۔ اقبال نے اسی لئے زندگی کو جہد مسلسل کہا ہے۔ اس جہد میں جو لوگ کھپ جاتے ہیں وہ دوسروں کے لئے راستہ ہموار کر جاتے ہیں۔ فانی کے یہاں عمل اور جد و جہد کی مثالیں نہیں ملتیں۔

ان کے کلام میں شدت یاس کی یہی توجیہہ ہو سکتی ہے کہ ان کو اپنی محرومی و نامرادی پر اس درجہ یقین راسخ تھا کہ ان میں کبھی حوصلۂ عمل پیدا ہی نہ ہوا اور یاس کی کیفیت دل و دماغ کے ساتھ ساتھ ان کی ساری شاعری پر مستولی ہو گئی دوسرا اثر عجمی تصوف کا ہے۔ عجمی تصوف کا مسئلہ جبر[52] فانی کو بے حد راس آیا۔ عجمی تصوف نے قومی زندگیاں تباہ کی ہیں انہیں سرد اور بے عمل بنایا ہے۔ زندگی سے فرار کی راہ دکھائی ہے۔ پھر اس تصوف کا فانی کے کلام کو بے ذوق[53] اور افسردہ بنا دینا تو ایک معمولی سی بات تھی۔ جیسا کہ اوپر کسی جگہ ذکر آیا ہے۔ فانی کے یہاں ایسے اشعار ہیں جن کا گداز ہمارے دل میں کسک پیدا کرتا ہے۔ لیکن ان کی شاعری کی عام فضا روائتی سرد اور حوصلہ شکن ہے اس میں اس ہمت عالی کی وہ تلقین نہیں ملتی جو در یا بھی قبول نہ کرے وہ عمل افروز اور حیات افزا جذبہ نہیں ملتا جس کا زمانہ مقتضی ہے اور جس کی گونج ہم اقبال کے یہاں پاتے ہیں۔

غم و یاس کی طرح موت بھی فانی کی شاعری کا ایک مستقل اور محبوب موضوع ہے۔ اردو کے کسی شاعر نے موت کو اپنی شاعری میں مستقل موضوع کی حیثیت نہیں دی لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ اردو شعراء نے اس موضوع پر کچھ نہیں لکھا۔ موت چونکہ ایک ٹھوس حقیقت ہے اس لئے ہر شاعر نے اس کے متعلق اشعار کہے ہیں لیکن غالب، چکبست اصغر اور اقبال کو چھوڑ کر دیگر شعراء کے یہاں بالعموم متفکرانہ انداز فکر مفقود ہے۔ موت کا بیان ہمارے یہاں زیادہ تر دو طرح سے ملتا ہے۔ ایک تو شعراء ہجر یار میں روز مرتے تھے۔ دوسرے موت کے بیان سے دوسروں کو عبرت دلانا مقصود ہوتا تھا مگر فانی نے اس سلسلہ میں ایک انفرادی حیثیت حاصل کر لی ہے۔ انھوں نے اس موضوع پر بہت کچھ لکھا ہے لیکن چونکہ اظہار خیال متفرق اشعار میں کیا گیا ہے اس لئے ان کے یہاں وہ بلندیٔ فکر اور وہ تسلسل خیال جو اسی موضوع پر انگریزی نظموں میں نظر آتا ہے۔ تاہم ان کے اشعار میں تفکر کا انداز ضرور ملتا ہے۔ فانی نے موت کو حسین بنانے کی کوشش کی تھی اسے نامرادوں کی مراد اور علاج درد زیست کہا ہے۔ فانی کے حق میں ممکن ہے یہ سب کچھ ٹھیک ہو۔ ان کی غم نصیب و رتھکی ہاری زندگی ممکن ہے

---

۵۱ CHRONIC ۵۲ جبر و اختیار اسلامی علم کلام کی اصطلاحات ہیں اگر اسلام کے نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو جبر بھی عین عدل خداوندی ہے۔ مگر فانی کی نظر اس مسئلہ کے تاریک پہلو پر پڑی اس لئے ان کے یہاں جبر کا مفہوم انسان کی مجبوری محض ہے۔ صحیح اسلامی عقیدہ ما بین جبر و اختیار ہے۔

۵۳ شاعر کی نوا مردہ و افسردہ و بے ذوق ∴ افکار میں سرمست نہ خوابیدہ نہ بیدار

صرف موت کی آغوش میں سکون کی متلاشی ہو مگر ہم اسے زندگی کا صحت مند نظریہ کبھی نہیں کہہ سکتے۔ حیات اپنی تمام محرومیوں اور مجبوریوں کے باوجود نہایت عزیز شے ہے اور موت ایک خوف ناک حقیقت۔ ہم زیادہ سے زیادہ موت کی طرف سے بے اعتنائی برت سکتے ہیں! ہمارا یہ انداز ہو سکتا ہے کہ جب تک جیتے ہیں۔ جیتے رہیں جب موت آجائے گا تو چل بسیں گے۔ مگر انسان کے پہلو میں جب تک ایک دھڑکتا ہوا دل ہے جو اسے سود و زیاں کا احساس دلاتا ہے۔ اور جس کی بدولت دنیائے آب و گل سے اس کی وابستگی ہے۔۔ وہ موت کو حسین نہیں سمجھ سکتا۔ اور اس کی تمنا میں مر نہیں سکتا۔ فانی کے دماغ پر موت کا خیال ایک "COMPLEX" کی طرح مسلط تھا۔ وہ زندگی کے ہر لحظ کو موت سمجھتے تھے۔ اور ہر گھڑی انھیں موت کا انتظار تھا۔[۱]

ہر نفس عمر گذشتہ کی ہے میت فانی
زندگی نام ہے مر مر کے جئے جانے کا

بجھتی ہی نہیں شمع جلے جاتی ہے
کٹتی ہی نہیں رات ڈھلے جاتی ہے
جاری ہے نفس کی آمد و شد فانی
سینے میں چھری ہے کہ چلے جاتی ہے

۷۰

اب سوال یہ ہے کہ کیا فانی واقعی موت کو اتنا ہی حسین اور عزیز سمجھتے تھے۔ جتنا کہ ان کے کلام سے ظاہر ہوتا ہے۔ علیگڈھ میگزین کے فانی نمبر میں ماہر القادری صاحب کا ایک مضمون ہے اس میں فانی کی شخصیت اور سیرت کے چند پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے ان کا بیان ہے: "بیماری کے زمانہ میں ایک دن میں اور نواب نثار یار جنگ بہادر مزاج (پنشنر کلکٹر) فانی کے یہاں گئے۔ مزاج پرسی کے بعد فانی سے نواب صاحب نے کہا۔ فانی تم مر نہیں سکتے، تمھاری انرجی (قوت) ضائع نہیں ہوئی۔ وہی فانی جو ہمیشہ مرگِ ناگہاں کی تمنا کرتا تھا ان لفظوں کو سن کر اس کا چہرہ خوشی سے تمتما اٹھا۔ زندگی کتنی عزیز شے ہے!" اگر اس بیان میں صداقت ہے اور کوئی وجہ نہیں کہ اسے صحیح نہ سمجھا جائے تو اس سے پتہ چلتا ہے کہ فانی کی خواہشِ مرگ میں صداقت کا وہ درجہ تھا۔ جس کے بارے میں نقادوں نے صفحے کے صفحے رنگ ڈالے ہیں۔

فانی کی خواہشِ مرگ میں کتنی صداقت تھی وہ موت کو کتنا حسین سمجھتے تھے ان بحثوں سے قطع نظر یہ ایک حقیقت ہے کہ فانی نے جس انداز میں اس موضوع کو پیش کیا ہے وہ انتہائی غیر فطری ہے۔ موت کے مضمون کی کثرت نے ان کی شاعری کو اس درجہ سوگوارانہ رنگ دے دیا ہے کہ وہ کبھی مقبول اور پسندیدہ نہیں ہو سکتا۔ حیات و ممات کے متعدد ایسے مسائل ہیں جنھوں نے فلسفہ، سائنس اور مذہب کو یکساں طور پر اپنی طرف متوجہ کیا ہے شعراء نے بھی ان مسائل کی طرف توجہ کی ہے مگر ان مسائل کی حیثیت کبھی نہ حل ہونے والے معمہ کی ہے۔ ان مسائل پر جن مختلف زاویوں سے بحثیں ہوئی ہیں۔ ان کی تفصیلات میں پڑنا نہ تو ہمارا موضوع ہے اور نہ اس مختصر مقالہ میں اس کی گنجائش ہے۔ ہمارے مقصد کے لئے صرف اتنا ذہن نشین کر لینا کافی ہوگا کہ زندگی کی اصل نوعیت چاہے ایک معمہ حقیقت ہو یا نہ ہو لیکن اس کے جدلیاتی تنوع پر خود ہمارا مشاہدہ شاہد ہے۔ ہم دیکھ رہے ہیں کہ خوشی اور رنج، یاس و امید، نور و ظلمت، صلح و جنگ، اور اسی طرح متضاد کے بے شمار جوڑے آپس میں ٹکرا ٹکرا کر زندگی کے دھارے کو آگے بہائے لئے جا رہے ہیں۔ یہ ڈرامہ نہ جانے کب سے جاری ہے اور نہ جانے کب تک جاری رہے گا۔ پھر یہ تذکرہ تو اس ڈرامہ کا ہے جو ہم اپنی دنیا میں دیکھ رہے ہیں۔ ہماری دنیا سے باہر کائنات کی بسیط اور لا انتہا فضاؤں میں کیا ڈرامے ہو رہے ہیں۔ ان کا اندازہ کون لگائے؟

زندگی کے اس ڈرامے میں ہم ایک لمحہ کے لئے بھی زندہ رہ آتے ہیں اس فرصت میسر کو کسی طرح برتا جائے۔ ہم اس ڈرامہ کے (جس میں طربیہ اور المیہ کا نا قابل تقسیم امتزاج ہے) خاموش تماشائی تو بن

---

[۱] جوش نے اسی چیز پر سخت چوٹ کی ہے ۔ دامن کو ہمیشہ نم کیا کرتا ہے۔ دریا تیری آنکھوں سے بہا کرتا ہے
یک لخت اجل کو جان دینا بہتر مرتا ہے باقساط یہ کیا کرتا ہے

[۲] موت کی خواہش اور زندگی سے بیزاری کی جو شدت فانی کے یہاں نظر آتی ہے اس کے لحاظ سے تو فانی کو یہ سنکر اور بھی غمگین ہو جانا چاہئے تھا کہ وہ ابھی مر نہیں سکتے۔ نفسیات کے ماہر سگمنڈ فرائڈ نے ایک جھی بھلی بات کہی ہے۔ اس کا خیال ہے کہ اکثر ہم جس چیز سے اپنی سخت نفرت اور بیزاری کا اظہار کرتے ہیں جس کے لئے ہمارے دل میں ایک دبی ہوئی خواہش ہوتی ہے۔

نہیں سکتے۔ اس لئے کہ یہ تو آئینِ فطرت کے خلاف ہے ہم حصّہ لینے پر مجبور ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ اس لمحۂ فرصت کو محض اس اتفاق یا واقعہ پر آنسو بہانے میں صرف کر دیں کہ پردہ پر کیوں لائے گئے یا ہنسی خوشی اس میں شریک ہو کر اسے اپنی بساط بھر "خوب سے خوب تر" بنانے کی کوشش کریں۔

یہ خیال کہ انسان مجبورِ محض ہے اور قدرت کی اندھی مشین کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی ہے عجمی تصوف کا اثر ہے۔ جس کی بنیاد حقائق زندگی سے گریز پر قائم ہے یہ خیال شکست خوردہ ذہنیت سے پیدا ہوتا ہے اور دوسروں کو شکستہ پر بنا دیتا ہے۔ اسی عجمی لَے سے فانی کی شاعری کا خمیر تیار ہوا ہے یہ لَے زندگی کو صرف بے رنگ ہی نہیں بناتی بلکہ انسان سے زندگی کا سارا حوصلہ چھین لیتی ہے ان اشعار کو پڑھیے اور دیکھیے کہ ان کے اثرات کتنے حوصلہ شکن ہیں

نامرادی حد سے گذری حال فانی کچھ نہ پوچھ
ہر نفس ہے اک جنازہ آہ بے تاثیر کا

ہے موت ہی اب زندگیِ دل کا سہارا
جینے کی جو ایسی ہی تمنا ہے تو مرجا

یہ زندگی کی ہے روداد مختصر فانی
وجودِ دردِ مسلّم علاج نامعلوم

زندگی جبر ہے اور جبر کے آثار نہیں
ہائے اس قید کو زنجیر بھی درکار نہیں

میں کہاں اور کہاں عمرِ دو روزہ فانی
زندگی اب بہ تقاضائے گراں جانی ہے

پھر اگر یہ خیال یا نظریہ تصوف کے دیگر مسائل کی طرح محض "برائے شعر گفتن خوب است" تک محدود رہے تو ہرج نہیں۔ لیکن شاعر کی اس ذہنیت یا نظریہ کا قومی اور اجتماعی زندگی میں سرایت کر جانا انتہائی ہلاکت آفریں ہے۔ اقبال اس عجمی لَے کی زہر آگیں سے آگاہ تھے وہ اس رمز سے واقف تھے کہ صوفی، فقیہ اور شاعر نے مل کر کتنے سفینے ڈبوئے ہیں۔[2] اقبال کا یہ کارنامہ ہے کہ انھوں نے قومی زندگی کو اس زہر آگینی سے بچانے کی کوشش کی اور اس میں ایک نئی روح ایک نئی تڑپ اور زندگی کا ایک نیا حوصلہ پیدا کیا۔

فانی کا ایک شعر ہے

اب نئے سر سے چھیڑ پردۂ ساز
میں ہی تھا اک شکست کی آواز

معلوم ہوتا ہے کہ فانی نے یہ محسوس کر لیا تھا کہ ان کا ساز نہ تو وقت کا ساز ہے اور نہ وہ ساز ہے جسے کاروانِ حیات کے لئے بانگِ درا کہہ سکیں، زمانہ کو جس ساز کی ضرورت تھی وہ ساز اقبال کے پاس تھا۔ اب اقبال کے بعد والے دور میں اس ساز کی لَے کیا ہو گی اس پر بحث کرنا ہمارے موضوع سے باہر ہے۔

غم و یاس، خواہشِ مرگ اور انسان کی مجبوریِ محض فانی کی شاعری، اور شاعری کیا ان کی زندگی کے سنگ بنیاد ہیں۔ اس بنیاد پر جس زندگی کی تعمیر ہو گی ظاہر ہے کہ وہ مدعائے حیات سے محروم ہو گی۔ مدعائے حیات سے محرومی اور پھر ہمہ وقت اس کا احساس ہمارے تخیل حیات کو کتنا تنگ، کتنا محدود اور کتنا بے رنگ و بے آہنگ بنا دیتا ہے یہ کاروانِ حیات کس منزل کی طرف رواں دواں ہے اور کہاں جا کر دم لے گا؟ ان سوالوں کا جواب دینا تو آسان کام نہیں، ہاں اتنا ضرور محسوس ہوتا ہے کہ انسان اپنی تمام کوتاہیوں، تمام کمزوریوں اور تمام محرومیوں کے باوجود آگے بڑھ رہا ہے وہ دیکھتا ہے کہ یہ زندگی خواب نہیں بلکہ ایک عینی حقیقت ہے۔ لیکن فانی کے نظریہ حیات کا نقطۂ عروج دوسری انتہا پر جا کر رکا۔ جہاں زندگی محض خواب ہے اور بے مدعا و بے مقصد۔[3] اگر فانی کا یہ خیال صحیح ہے تو پھر اقبال کا یہ شعر کیا معنی رکھتا ہے۔

عروجِ آدمِ خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں
کہ یہ ٹوٹا ہوا تارا مہِ کامل نہ بن جائے

زندگی کو بے مدعا اور بے مقصد قرار دینے والی شاعری کا اور اس عمل افروز اور حیات افزا شاعری میں جو آدمِ خاکی میں مہِ کامل سے بھی روشن ترین بن جانے کا حوصلہ پیدا کرے انتخاب کرنا زمانہ کے لئے دشوار نہ ہو گا۔ قرائن بتا رہے ہیں کہ زمانے کا تناظر جیسے جیسے دور ہوتا جائے گا۔ موخر الذکر شاعری کی مقبولیت اور اہمیت جس رفتار سے بڑھے گی۔ اول الذکر شاعری اسی رفتار

[1] ہر نگارے کہ مرا پیش نظر می آید
خوش نگارے ست و لے خوش تر ازاں می باید

[2] خبر نہیں کہ سفینے ڈبو چکی کتنے
فقیہ و صوفی و شاعر کی ناخوش اندیشی

[3] مری حیات ہے محروم مدعائے حیات
وہ رہ گذر ہوں جسے کوئی نقش پا نہ ملا

سے پس پشت پڑتی جائے گی۔

کہا جاتا ہے کہ یہ نظریۂ حیات صرف فانی کے ساتھ مخصوص نہیں ہے دنیا میں ایسے بہت سے روحانی پیشوا اور فلاسفر گزرے ہیں۔ جنھوں نے دنیا کو غم کدہ تصور کیا ہے اور اس تنگ و تاریک غم کدہ سے فرار کی راہ دکھائی ہے۔ لیکن ان کے خیالات کا اثر ہمیشہ محدود اور وقتی رہا ہے۔ دنیا کی برگزیدہ ترین ہستیاں وہی شمار کی جاتی ہیں اور انہیں کے پیغامات کو عالم گیر اثر اور قبولیت حاصل ہوتی ہے۔ جنہوں نے انسان کو روحانی اور مادی خوشیوں میں اضافہ کیا ہے اور ان کی ترقی کے لئے نئی راہیں سجھائی ہیں۔ زندگی کو بے مقصد اور بے مدّعا سمجھ کر اور دنیا کو غم کدہ تصور کرکے اس کے ہنگاموں اور محشر سامانیوں سے گریز انسانی فطرت کے منافی ہے۔ جس دن انسان انسان نہ رہ جائے گا اور اس کا دھڑکتا ہوا دل خاموش ہو جائے گا اس دن شاید دنیا محض غم کدہ بن جائے اور اس کی زندگی بے مقصد و بے مدّعا۔

تازہ ایڈیشن

زیر طبع

رنگ محل

ساغر دورِ جدید کا پیامی ہے، اس کی بہار آفریں شاعری اِک صبحِ نو کی تمہید ہے۔ اس کے نغمے میں ماضی کی غنائیت نہیں ہے بلکہ اُس رنگ محل کا انعکاس ہے۔ جس کے سندر کلس اور بُرج اور گنبد مستقبل کی زرّیں دھوپ میں چمکتے نظر آتے ہیں۔

جب ساغر شباب کی تازہ اور سُرخ شراب زندگی کے جام میں اُنڈیلتا ہے۔ تو خوش شاعری "ساقیِ جلوہ دشمن و ایمان و آگہی" بن کر محفلِ نشاط میں رقص کرنے لگتی ہے۔ اس رقصِ جادو داں کی دلدوزیوں کو اس کی بلاخیزیوں کو، رنگ محل کے ایوانِ خاص میں دیکھئے۔

جب ساغر بہارِ جوانی، اور ابدیت کے گیت گاتا ہے تو اس کی شاعری کی ترنم فضا بے تہوروں کے بہاریہ نغمے کی یاد تازہ کر دیتی ہے، وہ جب حسن، سندرتا اور کنواریوں کی موہنی کو اپنے نغموں میں سمو دیتا ہے تو کیوپڈ کے ترکش سے اندھے تیر بے اختیار مچل کر باہر نکلتے نظر آتے ہیں۔ وہ جب اشتراکیت کے درخشندہ رنگ محل کی جلوہ آفرینیوں کو اپنے مخصوص رجائی انداز میں دکھاتا ہے تو ہمارے ذہن میں سانے کے مستقبل کی ایک ایسی واضح روشن اور خوبصورت تصویر کھنچ جاتی ہے کہ ساری کائنات پر اک عجیب کیف اک عجب سرمستی چھانے لگتی ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ (BACCHUS) مدہوش ہو کر اس طوفانِ لے کی لہروں پر ناچ رہا ہے۔

رنگ محل میں ساغر نے زندگی کے پیکرِ نو کی تخلیق کی ہے، آپ کے لاشعور کے سپنوں کو الہامی کیفیت بخشی ہے ساغر کے اِک ساغرِ نو کی تشکیل کی ہے جس کی نازک گلکاریوں کے حسین نقش رنگ محل میں دیکھئے۔

کرشن چندر

ملنے کا پتہ:-

ادبی مرکز ہند پبلشرز کرائسٹ چرچ روڈ، بائیکلہ بمبئی ۸

مہندر ناتھ

انسان کی لاش!

شرنارتھیوں کے لئے کیمپ کھل گیا تھا۔ ایک چھوٹے سے ٹمینٹ میں اسکول کھولا گیا تھا۔ اس اسکول میں صرف ہندوؤں کی لڑکیوں کو پڑھایا جاتا تھا۔ لڑکیوں کی عمریں زیادہ نہ تھیں۔ یہ وہ لڑکیاں تھیں، جو پاکستان سے بچ کر آئی تھیں، ان میں کئی کی مائیں مر گئی تھیں، کسی کا باپ قتل کر دیا گیا تھا۔ کئی لڑکیوں کی مائیں ابھی تک پاکستان میں تھیں۔ اور کئی کا سارا خاندان تباہ و برباد ہو گیا تھا اور کئی لڑکیوں کو یہ بھی علم نہ تھا۔ کہ ان کے والدین زندہ ہیں یا قتل کر دیئے گئے ہیں۔ لڑکیاں ہندوؤں کی تھیں۔ لیکن اسکول کی استانی مسلمان تھی۔ جب دہلی میں ہندو مسلم فساد شروع ہوا اور ہندوؤں اور سکھوں نے مسلمانوں پر وہ ظلم ڈھائے، جن کی نظیر ہندوستان کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ لوگ کہتے ہیں کہ ہندوؤں اور سکھوں نے مسلمانوں سے بدلا لیا تھا لیکن کن مسلمانوں، کن مسلمان عورتوں سے، کن مسلمان بچوں سے؟ شاید، ان لوگوں نے یہ نہ سوچا، کہ وہ جن مسلمانوں کو تہ تیغ کر رہے ہیں، ان کا مغربی پنجاب پر ظلم ڈھانے میں کوئی ہاتھ نہ تھا، بربریت کے اس لمحے میں کسی نے کچھ نہ سوچا کہ یہ عورت جس کو وہ ننگا کر کے بازار میں سے لے جا رہے ہیں، یہی ان کی دادی اماں تھی، اسی سے دہلی کی گلیوں میں وہ کئی بار مل چکے تھے، اسی دادی اماں نے ان کے سروں پر شفقت کا ہاتھ پھیرا تھا۔ درازیٔ عمر کی دعا کی تھی۔ ان کی پیشانی چومی تھی، ان کے بیاہ میں ڈھولک بجائی تھی، گیت گائے تھے، لیکن انہی سنگلاخی ہاتھوں نے دادی اماں کا گلا گھونٹ دیا۔ اس کی بچوں کو نیزہ پر چڑھا کر اپنی اندھی حیوانیت کا ثبوت دیا۔ لوگ کہتے ہیں کہ جب ہندو فسادیوں کے ہاتھ میں ایک دایہ لگی تو انہوں نے اس سے پوچھا۔

"تمہارا نام؟" "ہندو ہو یا مسلمان؟"

"دایہ!" "دایہ!"

بولتی نہیں۔

میں ہندوؤں کے گھر میں گئی ہوں اور مسلمانوں کے گھروں میں بھی، ہندو بچوں کو اس گودی میں پالا ہے ان کو ان چھاتیوں سے دودھ پلایا ہے، ان ہاتھوں سے انہیں نہلایا ہے، کھلایا ہے اور اسی طرح مسلمانوں کے بچوں کو پالا ہے، پوسا ہے،۔ میں سب کی ماں ہوں!

ایک سکھ نے آگے بڑھ کے اس کا بازو اس زور سے مروڑا کہ دایہ کے منہ سے اللہ کا کلمہ نکل گیا۔ واہگورو کا نام لے کر سکھ کی کرپان اس دایہ کے پیٹ میں تھی۔ اور دایہ لڑکھڑاتی ہوئی زمین پر گر پڑی اور دوبارہ زمین سے نہ اٹھ سکی۔

آج ہندوؤں اور مسلمانوں کی مائیں مر چکی تھیں، دونوں کے بچے خون کی ہولی کھیل رہے تھے، — اسکول کی مسلمان استانی یہ سوچ رہی تھی کہ گھنٹی بجی، اور لڑکیاں کمرے میں داخل ہوئیں۔ آج اسکول میں لڑکیوں کی تعداد زیادہ تھی، سامنے بورڈ پر ہندوستان کا نقشہ لٹک رہا تھا۔ استانی نے رجسٹر سے لڑکیوں کا نام پکارا۔ سب کی حاضری لی، اور پھر نقشے کی طرف دیکھنے لگی، اور کہنے لگی، یہ ہے ہندوستان یہ ہے ہمارا دیس، یہ ہیں اس کے پہاڑ، یہ ہے ماؤنٹ ایورسٹ، دنیا کی سب سے بڑی چوٹی، یہ ہے کشمیر، ہندوستان کی جنت، اور یہ جنگل، دریا، سمندر، — یہ ہے پنجاب۔ راوی کے اس پار مسلمان بستے ہیں، اور ادھر ہندو، — میں تمہیں ہر روز یہ سبق پڑھاتی ہوں، اس نقشے کی طرف دیکھو، اس کی حدیں بھول نہ جانا (لڑکیوں کی طرف دیکھ کر) "بملا کہاں دیکھ رہی ہو،" استانی نے کرخت لہجے میں یہ الفاظ کہے۔

بملا نے استانی کی طرف دیکھا اور کچھ گھبرا سی گئی، وہ کچھ سوچ رہی تھی، اس کا دھیان نقشے کی طرف نہ تھا۔ بملا کی عمر ہوگی، آٹھ نو برس، اس کی ننھی ننھی سی آنکھیں حیران اور ششدر

ہو کر رہ گئی تھیں، کبھی وہ اُستانی کی طرف دیکھتی، کبھی بورڈ کی طرف اور کبھی بیٹھی ہوئی لڑکیوں کی طرف، جو اُس کی طرف بار بار دیکھ رہی تھیں، جب کبھی اُستانی بملا سے کوئی سوال پوچھتی۔ بملا اوٹ پٹانگ جواب دیتی۔ اُستانی جواب سُن کر ہمیشہ اُسے جھڑکتی، آج جب بملا نے پھر اُس کے سوالوں کا ٹھیک جواب نہ دیا۔ تو اُستانی آپے سے باہر ہو گئی۔ اور چیخ کر بولی۔

ہندوستان کی تقسیم کس نے کی؟ جواب ندارد۔

ہندوستان میں کس قوم کے باشندے بستے ہیں، بملا خاموش تھی

پاکستان میں کون سی قوم بستی ہے، بملا خاموش تھی،

جالندھر کہاں ہے، بملا! اُستانی نے کڑک کر پوچھا۔

"وہاں ہے" بملا نے نقشے کی طرف دیکھ کر کہا۔

وہاں کہاں۔ ہندوستان میں یا پاکستان میں،

پاکستان میں، بملا نے حیران کن نگاہوں سے دیکھ کر،

یہ جواب سُن کر سب لڑکیاں ہنس پڑیں،

اُستانی کو اور غصہ آیا۔ اُس نے بملا کی طرف قہر آلود نگاہوں سے دیکھا اور کہا "تم کیا کرتی ہو، تمہارا دھیان کس طرف ہے، کھڑی ہو جاؤ، بنچ پر، دیکھو انگلی کو منہ میں نہ ڈال۔ سیدھی کھڑی رہ، تمہیں یہ بھی نہیں معلوم کہ جالندھر کہاں ہے، اتنی سی بات، کیا کرتی ہو دن رات، پڑھتی کیوں نہیں ہو، ناخنوں کو دانتوں سے کاٹتی رہتی ہو، اگر تم اس طرح پڑھتی رہیں، تو کبھی امتحان پاس نہ کر سکو گی

بملا چپ چاپ کھڑی رہی، اور پریشان کُن نگاہوں سے اُستانی کی طرف دیکھتی رہی۔

"تو یہ ہے ہندوستان کا نقشہ۔ ادھر پاکستان ہے، یہاں مسلمان رہتے ہیں، مسلمان جناحی ٹوپی پہنتے ہیں، وہ ہندو اور سکھوں سے نفرت کرتے ہیں، پہلے یہ دونوں بھائی بھائی تھے، بڑے آرام اور پیار سے رہتے تھے، اگر گھر میں لڑائی جھگڑا ہوتا تھا۔ تو خود ہی نپٹ لیتے تھے، اب کے جھگڑا ہوا۔ تو انھوں نے انگریز کو بلایا۔ اور انگریز نے دونوں کو اپنا اپنا حصہ دے دیا۔ ـــ ادھر ہندوستان ہے، یہاں زیادہ تر ہندو رہتے ہیں، ہندو دھوتی پہنتا ہے، ماتھے پر تلک لگاتا ہے۔ اور اکثر تیرتھ یاترا کرتا ہے!، ہندو مسلمان سے نفرت کرتا ہے۔ تو یہ ہے ہمارا ملک، اور ہم ہیں اس کے باشندے اگر پاکستان جانا ہو تو پاسپورٹ لے کر جاؤ اور ہندوستان آنا ہو، تو بھی پاسپورٹ لے کر آؤ۔ ہمارا ملک بہت بڑا ملک ہے

یہاں کارخانے ہیں، ریلیں ہیں۔ ہوائی جہاز ہیں، فیکٹریاں ہیں چمکتی موٹریں ہیں اور پیداوار کافی ہے۔ لیکن لوگ بھوکے مرتے ہیں۔ کپڑا بہت بنتا ہے، لیکن لوگوں کو ننگا رہنے کا شوق ہے اس ملک میں سونے کی کانیں ہیں، چاندی کی کانیں ہیں، کوئلے کی کانیں ہیں، ہندوستان میں تاج محل ہے، قطب صاحب کی مینار ہے، لال قلعہ ہے اور اب اس کی آبادی چالیس کروڑ سے پینتیس کروڑ رہ گئی ہے، سمجھ گئیں بملا، کیا کہا میں نے،

شانتی۔ دنیا میں سچے آدمی کی عزت ہوتی ہے یا جھوٹے کی؟

سچے آدمی کی اُستانی جی، شانتی نے فوراً جواب دیا،

"شاباش" اُستانی نے خوش ہو کر کہا

لڑکیو! یہ بتاؤ کہ ہندو بڑا ہے یا مسلمان؟

"ہندو" سب لڑکیوں نے یک زبان ہو کر کہا۔

"شاباش" اُستانی نے چیخ کر کہا

"تم بتاؤ۔ بملا۔ تم کیوں خاموش ہو۔ ہندو بڑا ہے یا مسلمان"

بملا خاموش رہی۔

"بولتی کیوں نہیں، جواب کیوں نہیں دیتی۔ نقشے کی طرف گھور گھور کر کیوں دیکھ رہی ہو۔ انگلیوں سے نہ کھیلو، گردن اونچی کرو۔ پیچھے نہ دیکھو، سیدھی کھڑی رہو،

آج اُستانی کو ضرورت سے زیادہ غصہ آ رہا تھا وہ غصہ میں بھری ہوئی بملا کے قریب گئی۔

بتاؤ۔ ہندو بڑا ہے یا مسلمان۔ اُستانی نے چیخ کر کہا۔

بملا خاموش تھی۔ ــــ

نکل جا یہاں سے، اسی وقت چلی جا، نہیں تو مار مار کر جان نکال لوں گی۔

"بملا جانے لگی"

"ٹھہر جا"

باقی سب لڑکیوں کو اُستانی نے چھٹی دیدی۔ لڑکیاں چلی گئیں اور کمرے میں بملا اور اُستانی رہ گئیں۔

بملا رو رہی تھی۔

اُسے روتا دیکھ کر اُستانی کو رحم آ گیا۔

"کیوں رو رہی ہو میری بچی!"

"اُستانی جی، بملا نے آنکھوں کو پونچھتے ہوئے کہا۔ میں ـــ میں ـــ رات بھر نہ سو سکی۔

"کیوں میری بچی، آواز میں شفقت اور پیار تھا۔

"رات بھر اماں جاگتی رہی، اور روتی رہی؟

"وہ کیوں؟

ماتاجی نے مجھے بتایا کہ میرے پتاجی کو کل گاڑی میں قتل کر دیا گیا۔ وہ چھپ کر ایک مسلمان کے گھر میں ٹھیرے ہوئے تھے کہ باقی لوگوں کو علم ہوگیا۔ انھوں نے اس مسلمان کو مار ڈالا اور میرے پتاجی کو، یہ کہہ کر بملا رونے لگی، میں رات بھر جاگتی رہی، مجھے بالکل نیند نہ آئی، میرے پتاجی معلوم نہیں، اب کہاں ... گئے ماتاجی کہتی ہیں کہ وہ واپس نہیں آئیں گے۔

یہ سن کر استانی کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ غصہ کافور ہوگیا اس نے اپنی ساڑھی کے پلو سے بملا کے آنسو پونچھے، اور کہنے لگی روؤ مت میری بچی، میں بھی رات بھر نہ سو سکی، میں بہت پریشان تھی۔ ایک پل بھر نہ سو سکی۔

"وہ کیوں، بملا نے روتے ہوئے کہا

"میرا بھائی جالندھر میں تھا، ہندوؤں کے قبضہ میں آگیا اور بیچارا مارا گیا۔ ایک ہی بھائی تھا میرا۔ خاندان کی آخری نشانی تھی وہ بھی بیچارا قتل کر دیا گیا۔

"کس نے مارا، استانی جی؟

"ہندوؤں نے"

دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا، سامنے نقشہ لٹک رہا تھا۔ ہندوستان کا نقشہ!

ایک طرف ہندو۔ دوسری طرف مسلمان، ایک دل کے دو ٹکڑے ہوگئے تھے۔ ایک ہی وطن، جسکی تقسیم میں خون کی ندیاں بہہ نکلیں، نہ ہندو بڑا تھا۔ نہ مسلمان؛ دونوں رہزن تھے۔ دونوں حیوان تھے!

دونوں نے گھور کر نقشے کی طرف دیکھا۔

ایک طرف ہندو کھڑا تھا، دوسری طرف مسلمان کھڑا تھا۔ ان دونوں کے درمیان انسان کی لاش تھی۔ دونوں کمرے سے باہر نکل گئیں!

ترقی پسند تحریکوں کا ترجمان

پندرہ روزہ

نیا پرچم

جو فروری سنہ ۴۹ء سے ہر مہینے کی پہلی اور پندرہ تاریخ کو شائع ہوگا

ترتیب دینے والے

وشوامتر عادل
نظر جعفری
محمد حمید راسد

پہلے نمبر کے چند فنکار:- کرشن چندر۔ ڈاکٹر ملک راج آنند۔ سردار جعفری۔ کیفی اعظمی۔ ساغر نظامی۔ مہندر ناتھ۔ ظ انصاری۔ مجروح سلطانپوری۔ ممتاز حسین۔ حبیب تنویر۔ رتیش منگھوی۔ چیخوف۔

"نیا پرچم" حسن چیمبرز، پارسی بازار اسٹریٹ، فورٹ، بمبئی۔

لرزشیں

میرا جی

سکوں کا سایہ ابھی اس طرف سے گذرا تھا،
یہ کون؟ آج بھی تم دوریوں کو طے کرکے
اُسی طرح میرے خوابوں کو گدگداتے ہو؟
زمانہ سر پہ کھڑا قہقہے لگاتا ہے
ہجوم — سرد، خموش
کبھی تو دُور سے تکتا ہے، مسکراتا ہے،
کبھی قریب جو آئے تو جیسے ایک خیال
اندھیری رات کی تنہائی میں ڈراتا ہے
وہ آگے بڑھتے ہی جلدی سے لوٹ جاتا ہے،
ہجوم کب ہے؟ جھجھکتا ہوا خیال... جھجھکتا ہوا خیال تو ہے!
تمہیں بھی میرے ستانے میں لطف آتا ہے —
تمہیں بھی شوق یہ رازِ دروں بتاتا ہے —
کہ اک تڑپ کو دوامِ حیات کہتے ہیں؟
ہجوم جہل کی بکھری ہوئی نمائش ہے
ہجوم قتل کی جرأت نہ ہو تو دور سے ہی
ہزاروں پارۂ سنگ
اُٹھا کے پھینکتا ہے، اور بھول جاتا ہے
کہ ایسے اپنی جہالت کے نقشِ محکم کو
سوارِ وقت کا وہ ہمعناں بناتا ہے،
شکارِ خونِ رگِ دل کے پھوٹ پڑنے پر
سکوں کے سایۂ خاکی میں ڈوب جاتا ہے
سکوں کا سایہ نہ تھا، تم نہ تھے، وہ میں بھی نہ تھا،
یہ چند لمحے تھے جو وقت سے جُدا ہوکر
ہمارے دورِ مکاں میں گداز لائے تھے
اور اب ہمیشہ کو اک کاہشِ بقا ہوکر
اُدھر ہی لوٹ گئے جس طرف سے آئے تھے

ماہنامہ ایشیا فروری ۱۹۴۹ء

اسرار الحق مجاز بی، اے

خوبصورت حقائق

کیا ہوا میں نے اگر ہاتھ بڑھانا چاہا
آپ نے خود بھی تو دامن نہ بچانا چاہا

یوں تو افسانۂ الفت تھا ازل سے رنگیں
ہم نے کچھ اور بھی رنگین بنانا چاہا

سمجھ بوجھ کر پرسشِ حال کیجیے
کہیں کوئی عرضِ تمنّا نہ کر دے

پہلے وہ جور پر پشیماں تھے
اور اب لطف پر پشیماں ہیں

وہ نقاب آپ سے اٹھ جائے تو کچھ دور نہیں
ورنہ میری نگہ شوق بھی مجبور نہیں

خاطرِ اہلِ نظر حُسن کو منظور نہیں
اس میں کچھ تیری خطا دیدۂ مہجور نہیں

جرأتِ عرض پہ وہ کچھ نہیں کہتے لیکن
ہر ادا سے یہ ٹپکتا ہے کہ منظور نہیں

دل دھڑک اٹھتا ہے خود اپنی ہی ہر آہٹ پر
اب قدم منزلِ جاناں سے بہت دور نہیں

ہائے وہ وقت کہ جب بے پیئے مدہوشی تھی
ہائے یہ وقت کہ اب پی کے بھی مخمور نہیں

دیکھ سکتا ہوں جو آنکھوں سے وہ کافی ہے مجاز
اہلِ عرفاں کی نوازش مجھے منظور نہیں

کلیم اللہ

مارشل پلان

مارشل پلان گزشتہ سال بھر سے ساری دنیا کا موضوع بنا ہوا ہے اور کوئی دن نہیں جاتا کہ اخباروں اور رسالوں میں اس کی موافقت اور مخالفت میں مضامین نہیں چھپتے۔ خود ہندستان میں لوگوں کو اس سے کافی دلچسپی ہوگئی ہے اس لئے کہ اکثر لیڈر اس کا چرچا کر رہے ہیں کہ اسی منصوبہ کے تحت ہندستان بھی امداد حاصل کرلے۔ امریکہ کے سابق سفیر مسٹر گریڈی جب یہاں تھے تو انھوں نے بھی اس کا بہت پروپیگنڈہ کیا اور سفارش کی کہ ہندستان بھی ایک نہرو پلان بنائے اور امریکہ ہر طرح کی مدد کے لئے تیار ہے۔

اس منصوبہ کو شروع ہوئے ایک سال ہوتا ہے اس لئے اسے سمجھنے کے لئے اصولی بحث کی ضرورت نہیں رہی ہے بلکہ ایک سال کے تجربات سے ہم کافی صحیح نتائج پر پہنچ سکتے ہیں۔

اس منصوبہ کا اعلان سب سے پہلے امریکہ کے وزیر خارجہ مسٹر مارشل نے ہارورڈ میں کیا تھا۔ جس میں انھوں نے کہا تھا کہ یورپ جنگ کی وجہ سے بڑا تباہ ہوگیا ہے۔ وہاں معاشی بحران بڑھ رہا ہے امریکہ کی یہ خواہش ہے کہ وہ یورپ کی مدد کرے تاکہ وہاں کی زراعت اور صنعتیں اپنے پاؤں پر کھڑی ہوسکیں اور یہ ملک بحران سے نکل سکیں۔ اسی کے ساتھ انھوں نے یہ بھی بتایا کہ خود یورپ کے ملکوں کو اس کا تصفیہ کرنا چاہیے کہ انھیں کس قسم کی امداد کی اور کتنی ضرورت ہے اور اس کے لئے بہتر ہوگا کہ ایک کانفرنس کی جائے اور سب ملک مل کر ایک مشترکہ پروگرام پیش کریں۔

اسی کے مطابق جون اور جولائی ۱۹۴۷ء میں سوئیٹ یونین برطانیہ اور فرانس کے وزرا اعظموں کی ایک کانفرنس پیرس میں ہوئی سوئیٹ یونین کے نمائندوں نے امریکہ کی امداد کا خیر مقدم کیا اور کہا یہ بات بڑی قابل قدر ہے لیکن ساتھ ہی انھوں نے اس پر بھی زور دیا کہ یہ امداد یورپ کی نئی تعمیر کے لئے اسی وقت مفید ہوگی جبکہ یہ تمام ممالک اپنی تعمیر کی بنیاد اس امداد پر نہ رکھیں بلکہ اپنی بنیاد اپنے وسائل پر رکھیں اور اس امداد کو وسائل میں اضافہ کرنے میں استعمال کریں اسی کے ساتھ یہ امداد دیتے وقت ان ممالک کے اندرونی معاملات میں کسی قسم کی مداخلت نہ کی جائے اور انھیں اس کی پوری آزادی دی جائے کہ وہ اپنی معاشی زندگی کو جس طرح چاہیں تشکیل دیں۔

برطانیہ اور فرانس کے نمائندوں نے اس نقطۂ نظر کی سخت مخالفت کی اور کہا کہ بیرونی امداد ہی فیصلہ کن چیز ہے اور اسی پر یورپ کی تعمیر کا دارومدار ہے۔ برطانیہ اور فرانس امریکہ کی طرف سے یورپ میں اس منصوبہ کو عملی شکل دیں گے۔ اس کے لئے ایک کمیٹی بنائی جائے گی جو امداد حاصل کرنے والے ملکوں کے اندرونی معاملات میں مداخلت کرے گی۔

سوئیٹ یونین اس تجویز کو ماننے کے لئے تیار نہیں ہوا اس لئے کہ معنی صاف طور پر یہ تھے کہ امریکہ کی سرپرستی میں ایک ایسا ادارہ قائم ہوجاتا جو یورپ کے ہر ملک کی معاشی زندگی میں مداخلت کرتا اور اس کا تصفیہ کرتا کہ کون سا ملک کس قسم کی صنعت قائم کرے گا اور اس طرح امریکہ سارے یورپ کو اپنا معاشی غلام بنا لیتا

اس سلسلہ میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ روس اور مشرقی یورپ کے دوسرے ملکوں نے اسے کیوں رد کردیا اور مغربی یورپ کے ملکوں نے قرضہ کی تھوڑی سی رقم کی خاطر اپنی آزادی کا سودا کیوں کرلیا۔

اس کا جواب بہت آسان ہے گزشتہ جنگ میں تقریباً سارا یورپ تباہ ہوگیا۔ جنگ کے بعد پیداوار گر گئی۔ لوگوں کا افلاس بڑھ گیا۔ بے روزگاری عام ہوگئی اور معاشی بحران بڑھنے لگا مشرقی یورپ کے ملکوں نے اس بحران پر قابو پانے کے لئے اپنے یہاں جاگیرداری مٹا دی۔ بڑی صنعتوں کو قومی ملکیت بنا دیا اور سارے ملک کے لئے ایک معاشی منصوبہ بنایا۔ جس کی وجہ سے یہ ممالک

بڑی تیزی کے ساتھ بحران سے نکل رہے ہیں اور ترقی کر رہے ہیں۔ اس کے مقابلہ میں مغربی یورپ میں ابھی تک اسی طرح سرمایہ داری نظام جاری ہے۔ پیداوار منصوبہ کے تحت نہیں ہوتی بلکہ اس کا انحصار سرمایہ داروں کے منافع پر ہے اور اس لئے بحران گھٹنے کے بجائے اور بڑھتا جاتا ہے۔ مالدار سرمایہ دار دولت لوٹ کر اور امیر ہوتے جاتے ہیں اور غریب اور غریب ہو رہے ہیں اس کی وجہ سے افراط زر اور چور بازاری کے ساتھ ساتھ بے روزگاری اور فاقہ کشی بڑھتی جاتی ہے۔

مغربی یورپ کے سامنے دو ہی راستے ہیں یا تو موجودہ سرمایہ داری نظام ختم کر کے صنعتوں کو قومی ملکیت بنا کر منصوبہ بندی کریں یا یہ بحران بڑھتا چلا جائے۔ وہاں کے حکمراں سرمایہ دار سرمایہ داری بھی باقی رکھنا چاہتے ہیں اور ساتھ ہی بحران کو بھی روکنا چاہتے ہیں چنانچہ جب امریکہ نے امداد کا اشارہ کیا تو وہ اس کے پاؤں پر گر پڑے اور اپنی آزادی بیچنے پر تیار ہو گئے۔

اب دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ امریکہ جو خود سرمایہ دار ملک ہے اس قدر رحم دل کیسے بن گیا۔ اس کی رحمدلی کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ وہ نہیں چاہتا کہ یورپ سے سرمایہ داری ختم ہو جائے اور بڑی وجہ یہ ہے کہ گزشتہ جنگ میں امریکہ کا نقصان نہیں ہوا بلکہ پیداوار تقریباً ڈھائی گنا بڑھ گئی۔ اور اس کے لئے اسے منڈیوں کی تلاش ہے اور اسلئے وہ یورپ اور دنیا کے دوسرے ملکوں کو معاشی طور پر غلام بنانا چاہتا ہے تاکہ انھیں اپنی منڈی بنا سکے۔

۱۹۲۹ - ۳۹ء کی امریکہ کی اوسط برآمد سالانہ ۳۶ کروڑ ڈالر یا کل پیداوار کی ۳ء۴ فی صد تھی۔ ۱۹۴۶ء میں یہ ۱۰۰ کروڑ ڈالر یا کل پیداوار کی ۹ء۴ فی صدی اور ۱۹۴۷ء میں ۱۵۱ کروڑ ڈالر یا کل پیداوار کی ۶ء۷ فی صدی ہو گئی۔ اس کے مقابلہ میں درآمد گر گئی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک سال میں امریکہ اپنا مال بہت زیادہ قیمت پر بیچتا رہا اور وہاں کا مال سستے داموں خریدتا رہا یورپ کی معاشی زندگی پر اپنا کنٹرول بڑھاتا رہا اسے سخاوت اور رحم کا نام دیتا رہا۔

مارشل کی تجویز کو عملی شکل دینے کے لئے جب مغربی یورپ کے ۱۶ ملکوں کی کانفرنس ہوئی تو پہلے ہی دن سے اس کی اصل تصویر سامنے آنے لگی پہلے تو کانفرنس ہی میں آپس میں خوب جوتا چلا بڑی بحث کے بعد سب نے ملکر ایک مشترکہ فہرست پیش کی اور چار سال کے لئے ۲۹۰ کروڑ ڈالر کا مطالبہ کیا۔

امریکہ اتنی بڑی رقم اور چیزوں کی فہرست دیکھ کر ناراض ہو گیا۔ نائب وزیر خارجہ کلیٹن اڈکر برس گئے اور اسے کم کرا کے ۲۰۶ کروڑ کروا دیا۔ جب یہ تجویز امریکی حکومت کے سامنے آئی تو اسے اور گھٹا کر ۱۷۰ کروڑ ڈالر کر دیا۔ اور اس کے بعد یہ تجویز کانگرس میں پیش ہوئی تو اور کمی کر دی گئی اور صرف ایک سال کے لئے عارضی امداد منظور کی گئی۔

اس کو عملی شکل دینے کے لئے امریکہ نے یورپ میں اپنے سابق وزیر تجارت ہیری مین کو مقرر کیا اور امریکہ میں ایک کمیٹی بنا دی جس کے صدر امریکہ کی موٹروں کی کمپنی کے ایک سابق صدر ہاف مین مقرر کئے گئے۔

یہ کمیٹی اتنی طاقتور ہے کہ برطانوی پارلیمنٹ میں ایک ممبر نے اس کے متعلق کہا تھا کہ اسے یہ اختیار حاصل ہے سوائے مرد کو عورت بنانے کے۔

ہاف مین ان ۱۶ ملکوں میں سے ہر ایک کی معاشی زندگی میں مداخلت کر سکتا ہے۔ امداد روک سکتا ہے۔ اور انھیں اس پر مجبور کر سکتا ہے کہ صرف انہیں ملکوں سے تجارت کریں جن کی وہ اجازت دے۔

جون ۱۹۴۸ء میں ہاف مین نے ان ملکوں میں سے ہر ایک کے سامنے معاہدہ کا ایک مسودہ پیش کیا اور کہا کہ وہ تین جولائی تک اس پر دستخط کر دیں۔ اس میں کہا گیا تھا کہ ہر ملک کو جو امداد ملے گی اس کا تصفیہ ہر سال کانگرس کرے گی۔ امریکہ ان میں سے ہر ملک کو اپنے سکہ کی قیمت ادا کرنے پر مجبور کر سکے گا اور وہ ملک کوئی جوابی کارروائی نہیں کر سکے گا۔ یہ ممالک درآمد برآمد کا محصول گھٹا دیں گے۔ یعنی اس طرح امریکہ نے نہ صرف یورپ کے ان ملکوں کی معاشی زندگی پر اپنا کنٹرول قائم کر دیا بلکہ انھیں اس پر بھی مجبور کر دیا کہ وہ اپنی نو آبادیات میں تجارت کے لئے بھی راستے کھول دیں۔

جب یہ منصوبہ منظر عام پر آیا تھا تو اسی وقت سوویٹ یونین نے کہا تھا کہ یہ یورپ کو غلام بنانے کا منصوبہ ہے لیکن اس وقت یورپ اور امریکہ کے سارے پریس نے سوویٹ یونین پر حملے کئے لیکن اب ایک سال بھی وہاں کے سرمایہ داروں میں بھی یہ دم خم نہیں رہا کہ اس کی شان میں قصیدہ پڑھ سکیں۔

گذشتہ جنوری ہی میں برطانیہ کی قدامت پسند جماعت کے

اخبار ایوننگ نیوز نے لکھا تھا۔

"امریکہ ہمیں دنیا تو خشک انڈوں کا سفوف ہے لیکن اس کے معاوضہ میں ہماری آزادی چھین رہا ہے"

۲۰ جون کو ایک اور رجعت پرست اخبار سنڈے ٹائمز نے بالکل اسی طرح کی شکایت کی تھی۔

اسی تاریخ رائٹر نے فرانس سے خبر دی تھی کہ وہاں کے ذمہ دار حلقے یہ محسوس کرتے ہیں' امریکی بڑے سرمایہ دار فرانس کی معاشی زندگی کا گلا گھونٹ دیں گے۔

آخر کیا بات ہے کہ امریکہ کے قصیدہ خواں آج اس کے خلاف منہ کھولنے کی جرأت کر رہے ہیں؟ آج اصل حقیقت آنکھوں کے سامنے آگئی ہے اور امریکہ بھی سود خور یہودی کی طرح پیش آرہا ہے وہ بات چبا کر نہیں کرتا بلکہ صاف صاف منہ پہ کہتا ہے۔ مارشل پلان کو چلانے والے سب سے بڑے افسر ہاف مین نے ۱۳ مئی ۴۸ء کو سینٹ میں تقریر کرتے ہوئے کہا۔

"ہم بے فکر ہیں اور ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس وقت تک پیسہ نہیں دیں گے جب تک ہماری شرطیں پوری نہ ہوں۔"

اور یہ شرطیں کیا ہیں؟ برطانیہ کے سخت احتجاج کے باوجود فرانس کے سکے فرانک کی قیمت کو کم کر دیا گیا۔ گرین لینڈ میں امریکہ کو فوجی اڈے دیئے گئے۔ جرمنی کے ٹکڑے کر دیئے گئے۔ برطانیہ کا اسٹرلنگ بلاک ختم کر دیا۔ ترکی کو بے شمار امریکی مشیر رکھنے پڑتے ہیں اور ان کے اخراجات اٹھانے پڑتے ہیں۔

ہاف مین نے نئی دہلی اسمبلی کے نمائندوں کو مئی میں بیان دیتے ہوئے یہاں تک کہا ہے کہ اب امریکہ برطانیہ کی ایک تہائی درآمد کو بھی اپنے کنٹرول میں لے لے گا۔ برطانیہ کو اس پر مجبور کیا گیا ہے کہ وہ اپنی صنعتوں کو قومی ملکیت بنانے کا پروگرام ملتوی کر دے۔

جب مارشل پلان آیا تو یورپ کے ان سولہ ملکوں نے یہ سوچا تھا کہ اس امداد سے وہ مشین خریدیں گے اور اپنے یہاں کی صنعتوں کو ترقی دے کر اس بحران سے نکلنے کا راستہ پیدا کر لیں گے اور اسی لئے...... انھوں نے امریکہ کے سامنے جو فہرست پیش کی تھی اس میں سب سے زیادہ جگہ مشینوں کو دی گئی تھی۔ لیکن ان کی ساری اُمیدیں خاک میں مل گئیں۔

مارشل امداد حاصل کرنے والے ملکوں میں ایک بلجیم بھی ہے یہ صنعتی طور پر بہت ترقی یافتہ ہے۔ جنگ کے زمانہ میں یہ زیادہ تباہ بھی نہیں ہوا لیکن یہ آج معاشی بحران کا سخت شکار ہے۔ غذائی صنعت کے لئے کچا مال نہیں ملتا ہے۔ فولاد کے کارخانے بند پڑے ہیں۔ یہاں کے فولاد کے کارخانوں کے وائس پریسیڈنٹ نے حال ہی میں اخباروں سے کہا تھا "چند دن سے ہم ایک عجیب و غریب صورت حال کا شکار ہیں مارشل امداد سے ہماری حالت بہتر بننے کی بجائے بگڑ رہی ہے۔"

یہی حال ناروے سویڈن اور ڈنمارک کا ہے۔ ایک سال ہوتا ہے کہ مارشل پلان کے پرستاروں نے یقین دلایا تھا کہ اس امداد سے وہاں کی معاشی معیار میں ۱۰ فیصدی اضافہ ہو جائے گا۔ چنانچہ ان تین ملکوں نے پانچ سال کے لئے ۵ کروڑ ڈالر کا مطالبہ کیا اور کہا کہ اس قیمت کا انھیں کوئلہ، لوہا اور فولاد دیا جائے تاکہ وہ اپنے کارخانے چلا سکیں۔

انھیں نہ صرف اتنی امداد نہیں ملی بلکہ لوہا اور کوئلہ بھی نہیں ملا اور امریکہ نے انہیں مجبور کیا کہ وہ لوہے اور فولاد کی بنی ہوئی چیزیں خریدیں یعنی اپنے کارخانے بند کر دیں۔

سویڈن سے کہا گیا ہے کہ وہ اپنی لوہے کی پیداوار بڑھائے۔ لیکن یہ کچ دھات اپنی صنعتوں کے لئے استعمال نہ کرے بلکہ جرمنی بھیج دے اور اس کے معاوضہ میں، اکروسکہ سگریٹ دیئے جائیں گے اور ڈنمارک کو پندرہ مہینوں میں امریکہ کی بنی ہوئی اتنی موٹر گاڑیاں دی جائیں گی جو وہ شاید پانچ سال میں بھی نہیں بیچ سکے گا۔

ناروے جہازی اور الیومینیم کی صنعتیں قائم کرنا چاہتا تھا یہ تجویزیں رد کر دی گئیں اب اسے امریکہ کے پرانے جہاز خریدنے ہوں گے اور امریکہ کا بنا ہوا الیومینیم کا سامان وہاں بھیجا جائے گا۔

اسی طرح انگلستان نے زرعی مشینری، لوہے فولاد اور فولاد کے سامان کا مطالبہ کیا تھا۔ لیکن اسے ملا کیا؟ شکر، کافی مچھلی، اخباری کاغذ اور چمڑا۔ جن میں سے اس نے کوئی بھی چیز نہیں مانگی تھی۔ لیکن چونکہ یہ امریکہ کے پاس فاضل ہیں اس لئے کسی کے سر تو منڈھنا ہی ہے۔

برطانیہ نے ۱۹۴۷ء میں جتنی موٹریں امریکہ سے منگوائی تھیں اس سال اس سے ۳۳ فی صدی زیادہ منگوانی ہوں گی اس لئے کہ ہاف مین صاحب جو مارشل پلان کے کرتا دھرتا ہیں موٹروں کے بہت بڑے کارخانہ دار ہیں۔

یعنی یہ امداد اس لئے نہیں ہے کہ یہ ممالک اپنی ضرورت

کی چیزیں حاصل کرسکیں بلکہ اس لئے ہے کہ امریکہ کا مال بک سکے
ان ملکوں کو اس طرح جو مال ملتا ہے اس کے بکنے کے بعد اس کی قیمت ایک الگ فنڈ میں جمع کردی جاتی ہے اور اس پر امریکہ کا کنٹرول ہوتا ہے۔ چنانچہ اٹلی میں امریکی مشن کے اخراجات اسی فنڈ سے ادا کئے جاتے ہیں۔ یہی حال دوسرے ملکوں کا ہے۔

جرمنی اور اٹلی کو جو امداد دی گئی ہے اس سے بے حساب فائدہ اٹھایا گیا۔ اربوں روپیہ امریکی بینکوں میں منتقل کر دیا گیا ہے۔ کتنی بڑے بڑے نادر کارخانے امریکہ منتقل کردیئے گئے ہیں۔ جرمن صنعتوں کے پیٹنٹ پر قبضہ کر لیا گیا۔

مغربی جرمنی کی تجارت پر پوری طرح امریکہ کا قبضہ ہو چکا ہے امریکہ یہاں کا بنا ہوا مال مثلاً موٹریں، کیمیائی اشیاء اور فوٹو کا سامان نہایت سستے داموں خریدتا ہے اور اس سے باہر سونا بناتا ہے۔

ٹرکی جیسے ملک کو جو جرمنوں کے ساتھ پوری طرح ملا بھی نہیں تھا، نہیں بخشا گیا۔ اسے جو قرضہ دیا گیا تو اس کے ہاتھ چار آبدوز کشتیاں بیچ دی گئیں۔ جن کی قیمت پورے قرضے سے ۲ کروڑ ڈالر زیادہ ہے۔ ٹرکی میں امریکہ کے جو مشیر اور مشن ہیں ان پر ترکی حکومت کے ۳ کروڑ، ۷۲ لاکھ ڈالر سالانہ خرچ ہوتے ہیں۔

حال ہی میں اس سلسلہ میں فرانس اور امریکہ میں جو معاہدہ ہوا ہے اس کی رو سے فرانس کسی ملک سے ایسے تجارتی تعلقات پیدا نہیں کرسکتا۔ جس سے امریکہ کے تجارتی مفاد پر برا اثر پڑے۔ فرانس جو چیز بھی درآمد کرے گا اس کا استعمال امریکہ کے مشورہ سے کرے گا۔ فرانس کو باکسائٹ کرومیم اور دوسری کچی دھاتیں امریکہ کو مہیا کرنی پڑیں گی (یعنی فرانس کو اپنے کارخانے بند کرنے پڑیں گے۔ فرانس میں امریکی تاجروں اور صنعت کاروں کو وہی حقوق حاصل رہیں گے جو فرانسیسیوں کو حاصل ہیں۔ فرانس اپنی معاشی زندگی کے متعلق تفصیلی معلومات امریکہ کو دیتا رہے گا۔ معاشی تعلقات کے سلسلہ میں فرانس جس قسم کی توقیت امریکہ کو دیگا اسی طرح کی مغربی جرمنی، جاپان اور کوریا کو بھی دے گا۔ یعنی فرانس امریکہ کا محکوم بن جائے گا۔ صنعتیں ختم ہو جائیں گی۔ اور ایک زرعی ملک بن کر رہ جائے گا۔

امریکہ مارشل پلان کے ذریعہ نہ صرف یورپ کو غلام اور زرعی ممالک بنانے کی کوشش کر رہا ہے بلکہ اب ان کی نوآبادیات سے بھی انہیں نکال رہا ہے۔ چنانچہ اس نے امداد دینے کے بعد نہیں اس پر مجبور کردیا ہے کہ وہ نوآبادیات کے دروازے امریکہ کے لئے کھول دیں۔ اس کی سب سے بڑی زد برطانیہ پر پڑ رہی ہے اس لئے کہ اس کی آمدنی کا سب سے بڑا ذریعہ ملیں تھیں۔

مثلاً ہندستان ہی کو لیجئے۔ ۱۹۴۲ء میں امریکی درآمد ۱۹۳۹ء کے مقابلہ میں ۹ گنا بڑھ چکی تھی۔

اس کے علاوہ انڈونیشیا، انڈوچائنا اور بلجیم کانگو میں امریکی سرمایہ تیزی کے ساتھ داخل ہو رہا ہے۔ ان نوآبادیات پر اپنا اثر قائم کرکے امریکہ چاہتا ہے کہ ساری دنیا کے کچے مال اور منڈیوں کو اپنے قبضہ میں کرلے۔ تمام دنیا کے صنعتی ملکوں کی صنعتیں ختم کرکے انہیں زرعی ملک بنا دے۔ تاکہ یہ سب کچا مال امریکہ بھیجیں اور امریکہ اپنا صنعتی مال وہاں بھیجے۔ جس طرح انگلستان ایک زمانہ میں ہندوستان میں کیا کرتا تھا۔

اس سلسلہ کی یہ بڑی دلچسپ چیز ہے کہ مغرب کے سامراجی مثلاً برطانیہ، ہالینڈ اور فرانس وغیرہ مشرق کے محکوم ملکوں (برما، ملایا، انڈونیشیا وغیرہ) کی ابھرتی ہوئی عوامی تحریکوں کو کچلنے کے لئے کروڑوں روپیہ صرف کر رہے ہیں اور اس کا سارا فائدہ امریکہ اٹھا رہا ہے وہ صرف کچھ مشورے دیدیتا ہے کچھ تیار مال اور روپیہ دے دیتا ہے۔ اس سے یہ چیز ظاہر ہوتی ہے کہ امریکہ ساری دنیا کے خلاف ایک زبردست معاشی لڑائی چھیڑے ہوئے ہے اور پوری دنیا کو غلام بنانے کے منصوبوں کو آگے بڑھا رہا ہے۔

۸۱

اس سلسلہ میں اس نے سب سے پہلا قدم یہی اٹھایا کہ مارشل پلان کے ذریعہ یورپ کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا اور مغربی یورپ کو اس پر مجبور کر دیا کہ وہ مشرقی یورپ سے کوئی تجارتی تعلق امریکہ کی مرضی کے بغیر نہ رکھے۔

اس سے خود مغربی یورپ کو زبردست معاشی دھکا لگا۔ اس جنگ سے پہلے مشرقی یورپ مغربی یورپ کی زبردست منڈی تھی۔ مغربی یورپ کا صنعتی مال مشرقی یورپ جاتا اور وہاں کا غلہ اور کھانے پینے کی ضروریات مشرقی یورپ سے پوری ہوتیں۔ اور یہ سلسلہ منقطع ہو جانے سے مغربی یورپ اپنی غذائی ضرورتوں کے لئے امریکہ کا محتاج ہو گیا اور امریکہ اسے استعمال کرکے اپنا معاشی غلام بنائے جا رہا ہے۔

یعنی مارشل پلان سے مغربی یورپ خوشحال ہونے

کے بجائے تباہ حال ہو رہا ہے۔ اس امداد سے بڑے مالدار طبقہ اور حکمران طبقہ کی جیبیں تو چور بازاری سے بھر جاتی ہیں۔ لیکن عوام میں بے روزگاری اور افلاس بڑھ رہا ہے۔

ان سب چیزوں کے باوجود امریکہ کے سرمایہ دار یہ سمجھتے ہیں کہ وہ اس سے سوویٹ یونین اور جمہوری محاذ کو کمزور نہیں کر سکے اور نہ مغربی یورپ اور خاص طور سے فرانس اور اٹلی میں اور ایشیا میں جمہوری تحریک کو کچلنے میں کامیاب ہو سکے۔ بلکہ یہ دن بدن بڑھتی ہی جاتی ہیں وہ جانتے ہیں کہ جب تک انھیں کچلا نہ جائے تب تک ساری دنیا پر تسلط نہیں قائم ہو سکتا اور جب تک تسلط قائم نہ ہو اور ساری دنیا امریکہ کی منڈی نہ بن جائے۔ تب تک اس بحران کو ٹالا نہیں جا سکتا۔ اس لئے وہ اپنی کوشش بڑھا رہا ہے۔

امریکہ سمجھنے لگا ہے کہ صرف معاشی اور سیاسی لڑائی سے جمہوری طاقتوں کو زیر نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے لئے فوجی لڑائی ضروری ہے۔

اور آج امریکہ پوری تیزی کے ساتھ اس طرف قدم بڑھا رہا ہے۔ امریکہ کی سرپرستی میں مغربی یورپ کا متحدہ فوجی محاذ قائم کیا جا رہا ہے۔ کانفرنس ہو رہی ہیں اور جنگی منصوبے بنائے جا رہے ہیں۔ مغربی یورپ کی حکومتوں کے فوجی بجٹ تیزی کے ساتھ بڑھائے جا رہے ہیں۔ فوجوں کی تعداد بڑھ رہی ہے۔ ساری دنیا میں جنگ کا بخار پیدا کیا جا رہا ہے۔

امریکہ نے فوجی اڈے آرکٹک، اٹلی، یونان، ترکی جاپان، اسٹریا، مغربی جرمنی، ایران، مصر، شمالی افریقہ اور سعودی عرب میں قائم کر دیئے ہیں اور انہیں مضبوط بنایا جا رہا ہے۔

مغرب میں جرمنی اور مشرق میں جاپان میں فوجی صنعتوں کو ترقی دی جا رہی ہے۔ پرانے فاشسٹوں کو پھر سے منظم کیا جا رہا ہے۔ تمام ملکوں میں زبردستی رجعت پرست حکومتیں قائم کی جا رہی ہیں (مثلاً اٹلی، یونان، کوریا وغیرہ میں یہی ہو چکا ہے)۔ ایشیاء کی عوامی تحریکوں کو کچلنے میں پوری مدد دی جا رہی ہے۔

لیکن ان سب چیزوں کے باوجود عوامی قوتیں ہر جگہ اس کی مزاحمت کر رہی ہیں۔ خود امریکہ میں ہنری ولیس اور ان کے ساتھی اس کی سخت مزاحمت کر رہے ہیں۔ مغربی یورپ میں مزدور تحریکیں برابر بڑھ رہی ہیں اور مقابلہ کر رہی ہیں سوویٹ یونین اور مشرقی یورپ کی جمہوریتیں تیزی کے ساتھ معاشی اور سیاسی ترقی کر رہی ہیں اور مضبوط ہو رہی ہیں۔ چین میں رجعت پرست چیانگ کائی شیک کی حکومت آخری سانس لے رہی ہے اور برما، ملایا، انڈوچائنا اور دوسرے محکوم ملکوں میں زبردست عوامی تحریکیں اٹھ رہی ہیں۔

امریکہ آج بالکل اسی راہ پر چل رہا ہے جو راہ ہٹلر نے اختیار کی تھی لیکن آج عوامی طاقتیں بہت زیادہ مضبوط ہیں اور امریکہ کا بھی وہی حشر ہوگا۔ جو ہٹلر کا ہوا تھا۔

نہیں کہ تیری محبّت کا اعتبار نہیں
مگر یہ دل کہ مجھے جس پہ اختیار نہیں

گذر رہے ہیں کچھ اس طرح رات دن میرے
کہ جیسے مجھ کو کسی شے کا انتظار نہیں

یہ کیسے مان لوں گلشن میں اب نہیں صیّاد
کہ جس بہار کو سوچا تھا وہ بہار نہیں

نیا زمانہ جنم لے رہا ہے خوف نہ کھا
یہ صبحِ نو کا اُجالا ہے کچھ غبار نہیں

علی جعفری

غلام ربانی تاباں

دیوالی

وقارِ روح کے تاروں کو کیوں چھوا تم نے
تمہاری نظم "دیوالی" بہت ہی اچھی ہے
مگر — یہ رات کی گردن میں دیپ مالائیں
سیاہیوں میں اجالے کے بد نما دھبے
غریب حبشی کو جیسے زکام ہو جائے
یہ ٹمٹماتے دئیے —
یہ ٹمٹماتے دئیے صبح کا بدل تو نہیں!؟

میں سوچتا ہوں کہ اس رات چین و برما میں
کسی محاذ پہ کتنے دئیے جلے ہونگے
جوان خون کی ہر بوند اک کرن بنکر
ایک ایسی صبح کی تشکیل کر رہی ہوگی
ہزار صدیوں کی تاریک سرد راتوں میں
بنی رہا ہے جو انساں کے خواب کا معہود
وہ صبح دور نہیں
اندھیری رات کے سینہ سے نور کا چشمہ
ابلنے والا ہے

یہ ٹمٹماتے دئیے — لکشمی کے چرنوں میں
تمہی نے حسنِ عقیدت کے پھول ڈالے ہیں
وہ جن کو لکشمی دیوی سے قربِ خاص نہیں
گھروں میں اپنے بھی دیپک جلائے بیٹھے ہیں
شکستہ جھونپڑیوں کو سجائے بیٹھے ہیں
کہ اس طرف بھی عنایت کی اک نظر ہو جائے
مگر وہ بھولتے ہیں
شکستہ جھونپڑیوں - ٹوٹے پھوٹے کھنڈروں میں
کبھی بھی لکشمی دیوی نہ مسکرائے گی
کبھی بہار نہ اُن کے چمن میں آئے گی
اگر وہ خود ہی نظامِ چمن نہ بدلیں گے

سیاہیوں کے نمائندے — رات کے بیٹے
ہمارے فکر و تخیل کو باندھنے کے لئے
توہمات کی زنجیریں ڈھال لیتے ہیں
کبھی دیوالی کبھی شب برات آتی ہے

راجیندر پرکاش

شادی کا باجا

روپا اچھوت رام دین کی بیٹی تھی۔ صرف یہی اس میں خرابی تھی۔ ورنہ تو وہ بھی اپنے ماں باپ کی اکلوتی بیٹی تھی۔ بڑی منتوں کے بعد انھوں نے اس چاند کے ٹکڑے کو پایا تھا۔ اپنے ٹوٹے پھوٹے مکان میں سب سے اچھے گدڑوں میں لپیٹ کر پالا تھا۔ لیتے پھٹنے کے سب کپڑے اس کی چارپائی پر بچھا دیئے تھے جس سے اس نازک بدن کو اس کے بان نہ چبھیں۔ رام دین نے اسی لئے زمیندار کے یہاں نوکری بھی کر لی تھی کھیتی کے ساتھ ساتھ......... جس سے اس کی روپا کو زمیندار کے گھر کی جھوٹی گیہوں کی روٹی کھانے کو مل سکتی تھیں.........

...... زمیندار کے گھر کے پھینکے ہوئے بچوں کے ٹوٹے جوتے بھی رام دین اٹھا لاتا اور بڑی خوشی کے ساتھ اپنی روپا کو پہناتا۔ روپا بہت خوش ہوتی۔ اور ساتھ ساتھ رام دین بھی۔

روپا اس گھر کی شہزادی تھی۔ جس کی ایک مانگ پر دو آدمیوں کی زندگیاں نثار تھیں۔ جس کے ایک آنسو کی قیمت کو ادا کرنے کے لئے رام دین اور چندا کے خون کی بوندیں قربان ہونے کے لئے موجود تھیں۔ اتنا سکھ شاید ہی کسی شہزادی کو ملا ہو......... ...... اور ...... اس کی ہنسی کے ساتھ ساتھ اس ٹوٹے ہوئے گھر کی ایک ایک اینٹ .... ایک ایک ذرہ ہنس پڑتا تھا.........

وہ ...... قسمت۔ انسانوں کی بستی سے باہر پھینکے ہوئے ماں باپ اس لمحہ کم سے کم اپنے کو اصلی معنی میں راجہ رانی سمجھ بیٹھے تھے۔ دھوپ کے جلائے ہوئے چہرے دمک اٹھتے تھے ...... اور دکھوں سے تپایا ہوا دل نیا جیون پا جاتا تھا......... یہ تھا اس روپا کا سنہرا بچپن.........؟

بچپن کا روپ اب روپا میں نکھرنے لگا تھا۔ آنکھوں کو لال ڈورے گھیرنے لگے۔ چاند کا بکھرا بکھرا سا عکس اسے لبھانے لگا۔ بھونروں کی گھن گھن کرتی صدا پھولوں کے چاروں طرف اسے اپنی طرف کھینچنے لگی۔ کالی کالی گھٹاؤں اور گھنگھور پانی کی رم جھم کی صدا میں اسے اکیلے پیڑ کے نیچے بیٹھنا اچھا لگنے لگا......... یہ جوانی کی شروعات تھی۔ ......؟

چندا ایک دن رام دین سے بولی۔ ...... دیکھو۔ اب بٹیا بڑی ہو گئی ہے۔ ان پھٹے چیتھڑوں میں اس کا بدن بھی نہیں ڈھکتا۔ ...... کہیں سے کپڑوں کا انتظام کرو"......؟

اسے بھی دھیان آیا اب۔ اس کی بیٹی جوان ہو گئی ہے ......

...... لیکن نئے کپڑے جو پھٹے ہوئے نہ ہوں کہاں سے لائے.. ..

...... کھیت سے تو مالک کا لگان بھی پورا نہیں ہوتا...... ......

پھر بھی...... روپا اب بڑی...... ہو گئی...... ہے'۔

......" سبھی سوچتا ہوا رام دین نوکری پر چلا گیا...... ...

آج کام کرنے میں اس کا دھیان نہ تھا...... دھیان تو روپا کے کپڑوں کا تھا...... وہ جھنجھلا رہا تھا۔ اپنی قسمت پر۔ ورنہ معلوم کیا کیا سوچ رہا تھا......... اس کے سامنے سے زمیندار کی کالی کلوٹی لڑکیاں سجی بنی کبھی کبھی گذر جاتی تھیں......... اس کا من۔ اس سے کہنے لگا......؟

کتنا عجیب اس دنیا کا انتظام ہے۔ یہ بدشکل چھوکریاں اپنے ذرا ذرا سے بالوں میں کیسے خوشبودار تیل ڈالتی ہیں...... گھنٹوں پھولوں کو اپنی چوٹی میں سجاتی ہیں۔ تھوڑی دیر میں نئی نئی ساڑیاں بدل ڈالتی ہیں .... کتنی بے شرم ہے یہ......

...... اور میری روپا...... ان سب باتوں میں اچھی ہے۔ پھر بھی۔ اس کے پاس پہننے کو کپڑے نہیں ہیں...... کیوں نہیں ہیں"؟ ...... وہ اس سوال کا جواب خود بھی نہ سوچ سکا۔

......" کچھ بھی ہو آج ضرور مالک سے کچھ روپیہ قرض لونگا۔"

...... اس نے سوچ لیا۔ مالک نے بیس روپیہ...... بیس روپیہ کا رقعہ لکھا کر دو مہینے کے اندر اندر چکا دینے کے وعدے پر دیدیئے۔

...... ـــــــ بیٹی کی محبت نے ...... بیٹی۔

کے ادھ ڈھکے بدن کی بیلو نے باپ کو اتنا بھی سوچنے کا موقع نہ دیا ۔۔۔

۔۔۔ پاگل دو مہینے کے اندر یہ روپیہ کہاں سے پیدا کریگا" ۔۔۔۔۔۔

بہت خوش خوش رام دین ایک لال ساڑی اور پیلا جمپر اپنی بیٹی کے لئے لیکر شام کو اپنے گاؤں کو چلدیا ۔۔۔۔۔۔ جیسے جیسے اس کا گھر قریب آتا جاتا ۔ اس کے پیر اور خوشی سے اٹھتے جاتے ۔ وہ بار بار ہنس پڑتا تھا یہ سوچکر ۔ کہ دھوتی دیکھ کر روپا ناچ اٹھے گی ۔۔۔۔۔۔

اور ہوا بھی ایسے ہی ۔۔۔۔۔۔ روپا نے وہ کپڑے بسنت کے تیوہار کے لئے رکھ دیئے جس کے ابھی تین مہینے تھے ۔۔۔۔۔۔

کائنات نے اپنا چولا بدلا ۔ درختوں نے نئے بانے پہنے ۔ کھیتوں نے رنگ برنگی چادریں اوڑھیں ۔ گھر گھر میں جھولے کے گیت ڈھولکوں پر گونج اٹھے ۔ جنگل میں جھینگر جھن جھن کرنے لگے ۔ اور پرندوں نے نئے راگ گانا شروع کیا ۔ بسنت رت آ گئی ۔۔۔۔۔۔ نوجوان دلوں میں نئی امنگیں جاگ اٹھیں ۔۔۔۔۔۔ اوہ ۔۔۔۔ اور

۔۔۔ روپا نے نہا کر اپنی وہ لال دھوتی اور پیلا جمپر پہنا ۔ ۔

۔۔۔۔۔ کٹورے کے پانی میں جو منہ دیکھا ۔ تو خود بخود اس کی آنکھیں تھوڑی دیر کے لئے بند ہو گئیں ۔۔۔۔۔۔ اپنی شراب سے خود ہی بیہوش ہو گئی ۔۔۔۔ چندا کی آنکھیں بھی اپنی بیٹی کی طرف اٹھ گئیں ۔ اس کے ہونٹ خوشی سے تھرتھرا ہی رہے تھے ۔ کہ یکایک اسکا منہ پیلا پڑ گیا ۔۔۔۔۔۔ اس کا دل کانپ گیا ۔۔۔۔ کیوں ۔۔۔۔۔۔

۔۔۔ کیونکہ وہ جانتی تھی کہ غریب کے گھر کی مایا ۔ عزت اور بدن سب پیسے والوں کے کھیل کا سامان ہوتا ہے ۔ ۔ ۔

وہ بھی ایک دن روپا کی طرح جوان تھی ۔ سندر تھی ۔۔۔۔ اس لئے اُس کے گاؤں کے زمیندار نے ایک دن کھیت پر کام کرتے ہوئے اس کا زبردستی ہاتھ پکڑ لیا تھا ۔۔۔۔۔۔ وہ گڑگڑائی تھی ۔ پیروں پر سر رکھ دیا تھا ۔۔۔۔۔۔ ظالم کی لاتیں بھی سہیں ۔۔۔۔۔ اس کی عزت کے جانے میں کسر ہی کیا رہ گئی تھی ۔ اگر کچھ آدمی ادھر سے نہ نکلے ہوتے ۔۔۔۔۔ ہائے اُس بھوکے جانور کے ہاتھ ڈھیلے ہوتے ہی تو کس طرح جان لیکر بھاگی تھی ، ۔۔۔۔۔۔ وہ یہ سوچ ہی رہی تھی کہ روپا بول اٹھی ۔۔۔۔۔۔ "ماں ۔۔۔۔ یہ ساری کتنی اچھی لگتی ہے ، ۔۔۔۔۔ ماں چونک گئی ۔۔۔۔۔۔ اور "ہاں" کہکر اندر چلی گئی ۔۔۔۔ گھر سے تھوڑی دور پر رام دین نے روپا کے لئے آموں کے پیڑوں میں جھولا ڈال دیا تھا ۔۔۔۔۔۔ روپا وہیں دوڑ گئی ۔۔۔ ۔۔۔۔ ؟

زمیندار کا شوقین اکلوتا بیٹا نرنجن جو لکھنؤ یونیورسٹی کا گریجویٹ تھا ۔۔۔۔۔۔ اپنے اردلی کے ساتھ اپنی ٹم ٹم پر بسنت موسم کی اداؤں کا لطف لینے گھر سے نکل پڑا ۔ اردلی جوان مالک کی عادت سے واقف تھا ۔۔۔۔۔ اور اسی لئے اس نے ٹم ٹم کا رُخ گاؤں کی طرف کر دیا ۔ ۔۔۔۔۔۔ ؟

اس شہر کے رہنے والے ۔ عیاشی میں پلے ہوئے اکلوتے نے ابھی تک جوانی دیکھی تھی ۔۔۔۔۔۔ لیکن رنگ اتری ہوئی ۔۔۔۔۔۔ پاوڈر اور لپ اسٹک میں چھپی ہوئی ۔ ساڑیوں اور جمپروں میں ڈھکی ہوئی ۔۔

۔۔۔ لیکن آج اس نے قدرت کی خوبصورتی دیکھی جس پر نیا رنگ تھا ۔۔۔۔۔۔ جس میں عجیب الہڑپن تھا ۔ مستی تھی ۔ معصومیت تھی اور جو برہنہ تھی ۔۔۔۔ آج اس نے وہ حسن دیکھا جو خود اپنے حسن سے بے خبر تھا ۔۔۔۔ اس کا دل اچھلنے لگا ۔ ۔۔۔ "کیسے اچھے اچھے پھول ۔۔۔۔۔۔ اور دھول میں کھیل رہے ہیں ۔۔۔۔۔۔

اوہ ان سے تو زندگی کی بہت سی راتیں سجائی جا سکتی ہیں ۔۔۔۔ کتنے لطف ہوں گے اُس زندگی میں ۔۔۔ کون روک سکتا ہے ۔

۔۔۔۔۔ یہ سب ہمارا ہی تو کھاتے ہیں ۔۔۔۔ ہم ہی فائدہ نہ اٹھائیں گے تو ۔۔۔۔ ایک سُریلی گلے کی الاپ نے اس کے ہوائی قلعوں کی عمارت کو آدھی بنی حالت ہی میں ڈھا دیا ۔ ۔

۔۔۔۔ ۔۔۔ روپا گا گا کر پینگیں بڑھا رہی تھی ۔ ۔۔ ۔۔۔۔ ساری سر سے ڈھلک گئی تھی ۔۔۔۔ جھولے کے پیچھے پیچھے سانپ کی طرح لہریں کھا رہی تھی ۔۔۔۔ ۔ نرنجن نے دیکھا اور ۔۔۔۔۔ دیکھتا ہی رہ گیا ۔ کس غضب کی جوانی تھی ۔۔۔۔۔۔ کیا حُسن کی بارش تھی ۔ معصومیت نے جس کو چار چاند لگا دیئے تھے ۔۔۔۔۔۔

اُسے یاد نہیں پڑتا تھا کہ اپنی یونیورسٹی میں کبھی اس سے زیادہ خوبصورت لڑکی دیکھی ہو ۔۔۔۔۔ ٹم ٹم رک گئی ۔ اردلی نے مالک کی طرف دیکھا جیسے وہ مالک کے دل کا حال سمجھتا ہو ۔۔۔۔۔۔ نرنجن گھورتا رہا ۔ جیسے شکاری گھات لگاتا ہے ۔ کدھر سے شکار پر وار کرے ۔۔۔۔۔۔ ۔ اردلی اور مالک میں اشارے ہوئے ۔۔۔۔۔ اور دونوں اتر پڑے ۔۔۔۔۔۔ ؟

"اے لڑکی ۔۔۔۔۔۔ ارے ۔ اے ۔ سنتی ہے یا نہیں ۔ ذرا جھولا روکو" ۔۔۔۔ اردلی نے آواز دیکر کہا ۔ پیچھے ایک ہیبت لئے صاحب کو جو روپا نے دیکھا ۔ وہ سہم گئی اور جھولا روک دیا ۔

"تمہارا کیا نام ہے"

"روپا"

"کس کی لڑکی ہو"

"رام دین کی"

اوہو۔ جو ہمارے یہاں نوکر ہے۔ ۔ ۔ ۔ تب تو کوئی بات نہیں ہے" نرنجن نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ روپا سمجھی اس سے کوئی خطا ہوئی تھی۔ لیکن اس بات سے اُسے اس کی معافی مل گئی ہے۔ اُسے تسلی ہوئی اور سہمے ہوئے چہرے پر خوشی کی جھلک دوڑ گئی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ نرنجن کچھ اور ہی سمجھا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ سوچا کہ چڑیا پھنس گئی ہے۔ ۔ ۔ ؟

"یہ گھاس جو پڑی ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ذرا اٹھا کر وہ ٹم ٹم کے گھوڑے کے آگے ڈال آ"۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اردلی نے مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے کہا۔ ۔ ۔ ؟

مالک کا کام بھلا کیسے ٹالتی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اردلی وہیں رہ گیا اور نرنجن اس کے ساتھ چل دیا۔

روپا گھاس ڈال کر گھومی لوٹنے کو لیکن نرنجن نے اس کی کمر اپنے ہاتھوں میں جکڑ لی تھی۔ اور ٹم ٹم کے اندر لے جانے کی کوشش کر رہا تھا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ روپا نے مالک کا چہرہ دیکھا اس کی وہ زہریلی آنکھیں دیکھیں۔ اس کی گرم سانس سے اپنے کو جلتے پایا۔ اس نے اپنے بدن کو برہنہ کرتے پایا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وہ ڈر سے کانپ گئی اور چیخ اس کے منہ سے نکلی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ "کیا کرتے ہو مالک مجھے چھوڑ دو"۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں ٹم ٹم کے اندر نہ جاؤنگی۔ نہیں۔ مجھے روپیہ نہ چاہئیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میری ماں مجھے ڈھونڈ رہی ہوگی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مجھے چھوڑ دو"۔ ۔ ۔ ۔ ۔ پنجے میں پھنسی چڑیا کو باز اس کے آنسو کی قیمت نہیں دیتا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ روپا نے زور سے اپنے باپو کو آواز دی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ نرنجن نے اس کا منہ مسل دیا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وہ مصیبت کے درد میں ڈوبی ہوئی پکار جنگل میں گونج اٹھی۔ ۔ ۔ ۔ اور رام دین کے کانوں میں بھی۔ جو کھیت سے کچھ سبزی توڑ کر گھر لوٹ رہا تھا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ لاٹھی سنبھالتا ہوا ہوا کے مانند وہ ادھر لپک گیا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ رام دین تڑپ کر ایک گز زمین سے اچھل پڑا۔ جیسے بجلی اس پر گری ہو۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جیسے کسی نے اس کے سینہ میں چھرا گھونپ دیا ہو۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جیسے دو پہاڑوں کے بیچ رکھ کر اس کا دل مسل دیا ہو۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس کی آنکھوں کے سامنے نرنجن نے اس کی بھولی سی بیٹی کے لات ماری۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ رام دین کی آنکھیں خون سے رنگ گئیں۔ اتنی زور کا بھرپور ہاتھ مارا کہ نرنجن

۸۶

زمین چاٹنے لگا۔ اتنے ہی میں غصہ کم ہوا، اس کے سر پر اور منہ پر نہ معلوم کتنی لاتیں لگائیں۔ ۔ ۔ ۔ وہ تو اُسے مار ہی ڈالتا اگر روپا اُسے اپنے ساتھ نہ کھینچ لیتی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ روپا ابھی تک سسک رہی تھی اور رام دین زخمی سانپ کی طرح پھنکارے مار رہا تھا۔ ۔ ۔ ۔ روپا کا بدن ڈر سے کانپ رہا تھا اور رام دین کا غصے اور انتقام کی آگ سے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ چندا نے جب یہ حال سنا۔ اس کا خون سرد ہو گیا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس کے منہ سے صرف یہی نکلا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

"کیا دین آدمیوں کا یہی بھاگیہ ہوتا ہے پرمیشور"

تھوڑی دیر بعد اردلی لوٹا۔ مالک کو چت پڑے دیکھا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جان باقی تھی۔ گھر اٹھا کر لے گیا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ زمیندار کو سب بات معلوم ہوئی۔ اپنے بیٹے کی اس درگت پر خون کھول گیا۔ لیکن اس وقت چپ رہا۔ یہ کہکر ایک دو دن میں اس کمین کو اس کا مزہ چکھا دوں گا"۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ؟

سب سے اچھا راستہ اپنی عزت کی بچت کا ان غریبوں نے یہی سمجھا کہ روپا کی شادی فوراً تین چار دن کے اندر ہی کر دینی چاہیئے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کرشن داس پاس کے گانوں کا انھیں غریبوں میں ایک کا لڑکا تھا جو اس ضلع کے اچھوتوں میں پہلا گریجویٹ تھا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس نے روپا کو ایک دن انہی کے گھر پر دیکھا تھا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وہ راضی تھا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ شادی طے ہو گئی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس واقعہ کے تیسرے دن کی

۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

غریبوں کے گھر کی شادی ہی کیا۔ دوسرے گانوں سے لڑکا اور اس کے پتا۔ چاچا چلے آئے۔ گانوں کے برہمن نے شادی کی رسم ادا کر دی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بدا کی تیاری ہونے لگی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اپنے جگر کے ٹکڑے کو اپنے سے الگ کرنے ماں۔ باپ انھیں لے کر گھر سے نکلے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ دیکھا تو دو ایک لال پگڑی والے سپاہی اور کچھ زمیندار کے نوکر رام دین کا انتظار کر رہے تھے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بغیر کچھ کہے اس کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈالدیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یہی نہیں۔ بلکہ پیروں میں لوہے کی بیڑیاں بھی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جس سے وہ بھاگ نہ جائے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مجھے آخری بار اپنی بیٹی کو گلے تو لگا لینے دو۔ یہ کہکر رام دین اپنی بیٹی کی طرف بڑھا۔ لیکن حاکم صاحب کے بید کی ایک چوٹ نے رام دین کا منہ پھیر دیا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بید اس کی آنکھوں پر پڑا اور لڑکھڑا کر گر پڑا۔ چندا اسے سنبھالنے کے

لئے آگے بڑھی۔ ایک ڈنڈا اس کے ہاتھوں پر بھی پڑا ....
ادھر وہ لوہے کی ہتھکڑیاں جھنکار اٹھیں۔ اور اِدھر حنیدا کی سہاگ کی
چوڑیاں چھن چھن کرکے زمین پر بکھر گئیں .... پردے سے
ڈھکے منہ سے ایک چیخ نکلی .... چھپر پر بیٹھے ہوئے

پرند چیں، چیں، کرکے اڑ گئے ...... ظالم دنیا نے رویا کو
برا کر دیا .... ان سب جھنجھناہٹوں کے درمیان ..... یہ بھی اور بیا
کی شادی کا ڈھول باجا .... اس کی زندگی کے سب سے زیادہ
خوشی کے وقت کا باجا .... ؟

افلاس

زندگی کا ایک ناقابلِ برداشت دَور! جس کے دن بغیر روٹی کے، صبحیں بغیر تازگی کے، شامیں بغیر روشنی کے اور راتیں بے خواب ہوتی ہیں۔

بے آگ کے چولھے، بغیر روشنی کے ہنستے اور امید سے تہی مستقبل، کپکپاتا ہوا احساس، لرزتے ہوئے ارادے تھرتھراتے ہوئے پاؤں اور شکست خوردگی کے کُہر میں لپٹے ہوئے تصوّرات، آنکھوں میں احساسِ کمتری کا سئہ دریوزہ گری پھیلائے، ثابت و سالم لباس میں سے نکلی ہوئی کہنیاں، اک گئی گذری ٹوپی پر زندگی کا بارِ گراں، چہرہ پر آفات کی گرد، لبوں پر نفسِ گرم کے جھکڑ، بغیر تلوں کی جوتیاں تپتے ہوئے راہیچوں کی تپش سے محفوظ برسات کے پانی کی پناہ گاہیں اور پھر تاریک و خاموش گھر میں واپسی اور پھر لرزتے ہاتھوں سے دروازے کا بند کرنا، وہ ہمسایوں کی طعنہ زنی اور گرجتی ہوئی قرض خواہی سے محفوظ ہونا، وہ مکاندار کی گرج دار آواز سے بچنے کی کوشش ناکام۔ سچ ہے افلاس زندہ موت ہے۔

ضمیر کی ملامت و ندامت، احساسِ وقار کی پامالی، نفرت، حقارت، افسردگی، انسانیت کے حلقوم میں ناقابلِ بیان تلخی!

کس طرح ایک مفلس اس تلخی کو نگلتا ہے اور کس طرح اکثر اوقات یہی غذا نگلنے اور پیٹ بھرنے کے لئے دستیاب ہوتی ہے۔ افلاس ان حقائق کا علم ہے۔

افلاس کچھ اور حقائق کا کشاف بھی ہو سکتا ہے اگر انسان اس سے بے نیاز ہو کر اپنی روحانی دولت کا احساس کرے۔ اگر قدرت اور سماج کی ناانصافی کا سِرا تیری جستجو کے ہاتھ پڑ جائے تو تیرے ٹوٹتے ہوئے اعصاب میں آہن کی سی صلابت اور شعلے کی سی حرارت دوڑنے لگے۔

کبھی یہ سوچ قدرت اندھی کیوں ہے؟ اور کبھی یہ غور کر سماج کی آنکھیں چھوٹی اور دانت بڑے کیوں ہیں!؟ کیا تو اس کی طویل انگلیوں میں دو دو گز کے ناخن نہیں دیکھتا!؟

ساغر

مسعود رزمی (میرٹھی)

غزل

بے سوزِ تپشِ نغمہ، بے ذوقِ خلشِ محفل
کچھ اور ابھی ترسے زخمہ کو ربابِ دل

ناقہ کا نشاں پیدا، غائب ز نظر محمل
منزل جسے ہم سمجھے تھی گردِ رہِ منزل

غافل نہ رہے دل کے سرمایہ سے اہلِ دل
کھونا ہے اسے آساں پانا ہے اسے مشکل

پیمانہ و ساغر پھر پیمانہ و ساغر ہیں
دریا سے نہیں بجھتی لب تشنگیٔ ساحل

اس راہ کو طے کرتے گزرے مہ و سال اپنے
جس راہ میں تھا اپنا ہر نقشِ قدم منزل

عقبیٰ کے مناظر تو آنکھوں سے نہاں ٹھہرے
دنیا کی طرف دل کی وحشت نہیں کیوں مائل

واعظ! ترے دوزخ کی یہ آگ معاذ اللہ!
جینا تو کٹھن تھا ہی مرنا بھی ہوا مشکل!

خواجہ احمد عباس

سیاہ حاشیے

عسکری نے منٹو کو، اس کی انسانیت اور اُس کے آرٹ کو بڑے پیار سے، بڑی ملائمت سے، دھیرے دھیرے چھُری سے ذبح کر رہا تھا ــــ

منٹو نے پوچھا "جان کنی اچھی یا موت؟"

عسکری نے چھُری آہستہ آہستہ چلاتے ہوئے جواب دیا۔ موت بہتر ہے تاکہ ایک بار ہی تکلیف سے چھٹکارا ہو جائے۔"

منٹو نے اپنے بہتے ہوئے لہو سے زمین پر بیل بوٹے بناتے ہوئے کہا "تو پیارے عسکری۔ مہربانی کر کے میری گردن کا جھٹکا کر دو۔ تاکہ میں اس اذیت سے چھٹکارا پا جاؤں"

عسکری نے جواب دیا "تم نے کیا مجھے سکھ سمجھ لیا ہے؟" اور اس کی کند چھری دھیرے دھیرے بڑے پیار سے منٹو کی۔ منٹو کے آرٹ کی، منٹو کی انسانیت کی شہ رگ کو کاٹتی رہی۔

ہاہاہا۔ ہنسیئے صاحب۔ اور اس بات کا ثبوت دیجئے کہ آپ عسکری کی طرح اُن چند نفوس میں سے ہیں جو قتل و غارت کے مناظر میں بھی ہنسنے ہنسانے کے لطیفے تلاش کرنے کو ہی ادبی تخلیق کی معراج سمجھتے ہیں جو آرٹ کے پاک دامن کو کبھی انسان دوستی، جمہوریت، رواداری، اخوت وغیرہ جیسے ڈھکوسلوں سے ملوث نہیں کرتے۔ اور فسادات کی خوں ریزی میں بھی آپ کو زخمی انسانیت کی پکار نہیں سنائی دیتی۔ کیوں کہ (بقول عسکری) "دراصل ادب کو اس بات سے کوئی دلچسپی نہیں کہ کون ظلم کر رہا ہے کون نہیں کر رہا۔ ظلم ہو رہا ہے یا نہیں ہو رہا۔ جہاں تک ادب کا تعلق ہے۔ ظلم کا خارجی عمل اور اس کے خارجی لوازمات بے معنی چیزیں ہیں .... ادب میں عام زندگی والا خلوص کام نہیں دیتا...... ہم انسانوں سے تو نفرت اور محبت کر سکتے ہیں "ظالموں اور مظلوموں" سے نہیں"

ادب اور آرٹ کے بارے میں عسکری کے غیر ترقی پسندانہ خیالات تو ہمیں معلوم تھے لیکن یہ نہ معلوم تھا کہ "آرٹ برائے آرٹ" آگے چل کر ایک ایسی فن کارانہ بلندی پر پہنچا دے گا۔ جہاں سے ظالم اور مظلوم، انسان اور حیوان، میں تمیز کرنا مشکل ہو جائے گا۔ جس کا اظہار عسکری نے "سیاہ حاشیے" کے دیباچہ میں کیا ہے۔ کاش منٹو نے یہ دیباچہ لکھوا کر عسکری کے ہاتھوں اپنا خون نہ کرایا ہوتا۔

منٹو ایک عجیب و غریب اُلٹی کھوپڑی کا ریاکار ہے یعنی فطرتاً اور اصولاً ترقی پسند اور انسان دوست ہوتے ہوئے بھی ان لیبلوں سے گھبراتا ہے۔

منٹو اپنی قسم کا ایک ہی ادیب ہے اس کی کہانیاں ہر دوسرے افسانہ نگار سے مختلف ہوتی ہیں۔ منٹو کی ادبی تکنیک صرف منٹو کا حصہ ہے۔ اس کی وجہ صرف یہ نہیں ہے کہ وہ دوسروں سے منفرد ہونے کے لئے اس طرح لکھتا ہے بلکہ اس نے دنیا میں اتنی ریاکاری دیکھی ہے کہ اسے "اچھے پن" کے اعلان سے چڑ ہو گئی ہے اور نام نہاد "اچھوں" سے نفرت وہ "بُروں" میں اچھائی اور انسانیت تلاش کرتا ہے۔ گھٹیا قسم کی رنڈیوں میں۔ دلالوں میں "بابو گوپی ناتھ" جیسے عیاشوں میں وہ اپنی انسان دوستی کا اظہار بھی کبھی براہ راست نہیں کرتا۔ مگر جس کسی نے اس کی "ہتک"، "گالی"، "کھول دو" جیسی کہانیاں پڑھی ہیں وہ انکار نہیں کر سکتا کہ منٹو ظلم سے نفرت کرتا ہے اور مظلوموں سے ہمدردی رکھتا ہے اگرچہ وہ مر جائے گا۔ مگر کبھی بھی اپنی زبان یا قلم سے اقرار نہیں کرے گا کہ وہ اپنے قلم کو اکثر جراح کے نشتر سے تشبیہ دیا کرتا ہے۔ وہ سماج کے پکتے ہوئے پھوڑوں پر سے پٹیاں اتار کر نہایت بے رحمی سے ان میں اپنا نشتر چبھوتا ہے تاکہ پیپ اور فاسد مادہ نکل جائے۔

اس لئے اس کے اکثر افسانے (اپنے انوکھے ڈھنگ سے) انصاف

اور انسان دوستی کی قدروں کے حامل ہوتے ہیں اور ان کا شمار فلاحی اور ترقی پسند ادب میں کیا جاتا ہے۔

کبھی منٹو ایسے ادبی تجربے کیا کرتا ہے جو اکثر پڑھنے والوں کو متنفر کر دیتے ہیں۔ مثلاً اس کی چیت بسطری کہانی "موتری" جس میں اس نے آج سے چار سال پہلے آگاہ کر دیا تھا کہ ہندوستان اور پاکستان کے نام پر کتنی غلاظت اچھالی جائے گی، اس انوکھے اور بے ڈھب دماغ نے (جو فسادات کی ہولناکی) سے پوری حد تک متاثر ہوا تھا جس کا اظہار اس کی کہانی "کھول دو" اور (اغوا شدہ عورتوں کے بارے میں اس کے مضامین میں ہوا ہے) فسادات کا ایک دوسرا پہلو بھی دیکھا کہ قتل اور لوٹ کرنے والوں میں مشاق اور عادی مجرم ہی نہ تھے۔ بلکہ ان میں سے اکثر مضحکہ خیز حد تک سیدھے اور بے وقوف قسم کے معمولی انسان تھے جن سے وقتی جنون کے زیر اثر شرمناک اور ظالمانہ حرکتیں صادر ہوئیں مگر ظلم کے میدان میں ان قاتلوں کا "اناڑی پن" یا "بھولا پن" فسادات کی ہولناکی کو کم نہیں زیادہ کرتا ہے۔ اگر ایک پیشہ ور عادی مجرم قتل کرتا ہوا پایا جائے۔ تو کوئی خاص تعجب کی بات نہیں مگر جب سیدھے سادھے انسان انسانیت کا راستہ چھوڑ کر قتل و خون کرتے ہوئے پائے جائیں تو سمجھ لیجئے کہ ہمارے تمدن اور تہذیب کی بنیادیں ہل گئی ہیں۔

صحافت کا پرانا اصول ہے کہ اگر ایک کتے نے آدمی کو کاٹ لیا ہے تو یہ کوئی خاص اہم خبر نہیں ہے۔ لیکن اگر کوئی آدمی کتے کو کاٹ کھائے تو ضرور ایک سنسنی خیز خبر ہے۔ میرا خیال ہے کہ "سیاہ حاشئے" والے لطیفوں کو شائع کر کے منٹو اپنے انوکھے اور بے ڈھب انداز میں فسادات کے اس پہلو کی طرف توجہ مبذول کرانا چاہتا تھا کتاب کا نام ہی اس کی دلیل ہے کہ وہ ان حرکتوں کے بیان سے لطف اندوز ہونا یا کرانا نہیں چاہتا تھا بلکہ حقیقت کے شیشے میں انسانیت کو اس کا نیا اور مضحکہ انگیز حد تک مکروہ چہرہ دکھانا چاہتا تھا۔ تاکہ ہم پہچان لیں کہ فسادات میں کون اور لوٹ مار کرنے والے صرف پکے عادی مجرم اور غنڈے ہی نہیں ہمارے آپ جیسے معمولی آدمی بھی تھے۔

مجھے اس کا یقین ہے کہ "سیاہ حاشئے" لکھنے اور شائع کرنے میں منٹو کی نیت اچھی تھی۔ جس کا ثبوت یہ بھی ہے کہ ان واقعات کے انتخاب میں وہ کسی فرقہ وارانہ جذبے سے متاثر نہیں ہوا ہے اور اس نے ان "اناڑی" قاتلوں اور لٹیروں کی فہرست میں ہندو، مسلمان، اور سکھ سب کو شامل کیا ہے۔ مگر میرا خیال ہے کہ باوجود اپنی نیک نیتی کے منٹو یہ کتاب لکھ کر اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوا ہے۔ اس کی پہلی اور بڑی وجہ تو حسن عسکری کا دیباچہ ہی ہے۔ جس میں منٹو کی تعریف کے بہانے نہ صرف انسان دوست ترقی پسندوں پر حملے کئے گئے ہیں بلکہ منٹو کے مقاصد اور اس کی ادبی قدروں کو مسخ کر کے پیش کیا گیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ حسن عسکری کو اپنی رجعت پسندانہ ذہنیت پر پردہ ڈالنے کے لئے منٹو کی آڑ لینے کی ضرورت پیش آ رہی ہے۔ تعجب اور افسوس تو یہ ہے کہ منٹو جیسے ادیب کو اپنی ایک ادبی تخلیق کے لئے عسکری جیسے آدمی کی سفارش اور تعارف کی ضرورت پڑی۔

عسکری کے دیباچے سے قطع نظر بھی منٹو "سیاہ حاشئے" نہ لکھتا تو اچھا ہوتا۔ جس نظر سے منٹو نے فسادات کے اس مضحک المیہ کو دیکھا ہے۔ بہت کم پڑھنے والے وہ نظریا سمجھ بوجھ سکتے ہیں۔ ان میں سے زیادہ تر تو ان ہولناک لطیفوں کو مزا لے کر ہی پڑھیں گے، ظلم اور حیوانیت کے بعض مناظر صرف خون کے آنسو رونے کے لئے ہوتے ہیں۔ وہاں منٹو کا زہرخند بھی ممکن نہیں ہوتا۔ منٹو کا تیز نشتر سماج کے پھوڑوں اور ناسوروں میں سے پیپ نکالنے کے لئے اکثر موثر ثابت ہوا ہے۔ مگر اس نشتر سے اس نے چالیس کروڑ دلوں کے پھپھولوں کو نہ چھیڑا ہوتا تو بہتر تھا۔

بامن آمیزشِ اُو صورتِ موج است و کنار

دمبدم بامن و ہر لحظہ گریزاں از من

ایم۔ ایم جوہر میرٹھی

گورکی اور ٹالسٹائے

اس کو خواہ اتفاق کہئیے خواہ قدرت کا طریقۂ کار خیال کیجئے کہ بیشتر مشاہیر کی زندگی دنیاوی اعتبار سے معائب و آلام کا شکار ہی رہی۔ اول تو بہت کم ایسے ہیں جو آسودہ گھروں میں پیدا ہوئے اور جو ہوئے بھی اُنھوں نے بھی عسرت کی زندگی اختیار کر لی۔ شاید عسرت اور معائب کی زندگی ہی انسان میں وہ خاص ادراک اور نفسی پختگی پیدا کرتی ہے جو اس کو دنیا کا امام بنا دیتے ہیں جذباتی اور نفسیاتی اعتبار سے بھی شاید انسان اسی وقت مکمل ہوتا ہے جبکہ وہ آسودگی کو ہمیشہ کے لیے خیرباد کہکر دوامی اقدار کو اپنے لیے مشعلِ راہ بنا لیتا ہے۔

گورکی بھی مثل دیگر مشاہیر کے ایک نادار گھر میں پیدا ہوا اور ابھی بچہ ہی تھا کہ یتیم ہوگیا۔ گورکی کے نانا نانی اس حادثہ سے بڑے پریشان ہوئے۔ کچھ دن تو وہ خاموش رہے پھر انھوں نے اپنی بیٹی (گورکی کی ماں) کا نکاح ایک گھڑی ساز سے کرنے کا ارادہ کیا لیکن وہ گھڑی ساز اتفاق سے اتنا بدصورت تھا کہ گورکی کی ماں اس سے شادی کرنے پر راضی نہ ہوتی تھی۔ گورکی اپنے بچپن کے حالات قلمبند کرتے ہوئے لکھتا ہے "اس زمانے میں میری ماں بڑی افسردہ رہتی تھی ..... اس کی رنگت اڑنے لگی تھی۔ مزاج چڑچڑا ہو گیا تھا۔ اِن بچپن کے زمانے میں مجھے یوں ہی سا خیال تھا کہ نانا میری ماں سے زبردستی کچھ کرانا چاہتے ہیں جس کو میری ماں پسند نہیں کرتی اس زمانے میں مجھے یاد ہے کہ ایک روز نانا نے دروازہ سے سر نکالا اور میری ماں سے کہا 'وہ آگیا ہے ذرا کپڑے پہن کر آجاؤ'، میری ماں نے یہ سن کر جنبش تک نہ کی اور گردن نیچے کیئے ہوئے دریافت کیا، کہاں آجاؤں؟' نانا بولے 'خدا کے لیے آجاؤ۔ وہ اچھا آدمی ہے اپنے گھڑی سازی کے کام میں ہوشیار ہے اور الیکسی (گورکی) کے ساتھ باپ کا سا سلوک کرے گا۔ ماں نے تیزی سے جواب دیا 'میں کہہ رہی ہوں میں نہیں کروں گی، اس جواب پر نانا لال پیلے ہوگئے اور چلائے، چلتی ہے تو چل ورنہ میں تیری چٹیا پکڑ کر گھسیٹتا ہوا لے جاؤں گا" اس پر میری ماں چلائی 'مجھ گھسیٹو گے؟' وہ غصہ میں کھڑی ہوگئی اور اس نے سوائے ایک کپڑے کے باقی تمام کپڑے اتار ڈالے اور کہا 'ہاں اب مجھے گھسیٹو، اور وہ خود دروازہ کھول کر اسی حالت میں باہر جانے لگی۔ میرے نانا بہت تلملائے انھوں نے بہت دانت پیسے اور کہا 'میری عزت خاک میں ملاتی ہے تو ہمیں تباہ کردے گی'، نانی اماں پہلے ہی سے دروازہ روکے کھڑی تھیں اور میری ماں کو پرے اس طرح ڈھکیل رہی تھیں جیسے مرغیوں کو ڈربے میں ڈھکیلتے ہیں' میری ماں نے نانی سے کہا 'کان کھول کر سن لو میں اس کے پاس نہیں جانے کی"۔ اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ گورکی کس طبقہ کا آدمی تھا اور اس کی پرورش کس ماحول میں ہوئی تھی۔

اگر معائب صرف یہیں ختم ہو جاتے تب بھی غنیمت تھا لیکن گورکی کی قسمت میں جلد ہی بیسیر ہونا بھی لکھا تھا۔ چنانچہ اس واقعہ کے کچھ ہی عرصہ بعد گورکی کی ماں فطری جذبات سے متاثر ہو کر ایک شریف زادے کے ساتھ اسکو بھاگ گئی۔ وہ میاں ابھی کالج ہی میں تعلیم پاتے تھے۔ چنانچہ جب تک روپیہ رہا اسکو ہیں خوب عیش کرتے رہے جب روپیہ ختم ہوگیا تو رومانیت بھی ختم ہوگئی اور دولہا صاحب بھی اس پر مجبور ہوئے کہ ساس و سسر کے پاس پناہ لیں۔ گورکی کی زندگی کا یہ زمانہ بہت تاریک گزرا ہے،

کیونکہ اس کا سوتیلا باپ نہ صرف گورکی کے ساتھ بلکہ اس کی ماں کے ساتھ بھی بُرا سلوک کرتا تھا۔ اب اس نوجوان کا دل محبت سے سیر ہو چکا تھا۔ گورکی کی ماں جب ماسکو سے واپس آئی تو حالتِ امید میں تھی اور کچھ اس وجہ سے اور کچھ مالی مشکلات اور شوہر کی بے رحمی کے سبب اپنی رونق کھو رہی تھی۔ اس کا شوہر اس کی صورت کا مذاق اڑاتا اور چڑانے کے لئے اپنی نئی عیاشیوں کے افسانے اس کے سامنے فخریہ بیان کرتا۔ درحقیقت اس کی ان باتوں سے اس قدر کڑھتی کہ اس کو دق ہوگئی۔ ایک دن کا ذکر ہے گورکی دیوار کے پاس کھڑا تھا کہ اس نے اپنی ماں کو نوجوان سے یہ درخواست کرتے سُنا کہ وہ بھی اس عورت کو دیکھنا چاہتی ہے جو نوجوان کی محبت کی مالک ہوگئی ہے۔ گورکی اپنی سوانح میں لکھتا ہے "میں یہ سُن ہی رہا تھا کہ دیوار کے پیچھے سے گھونسے کی آواز آئی۔ میں فوراً لپکا۔ دیکھتا کیا ہوں کہ میری ماں گھٹنوں کے بل گری پڑی ہے۔ اس کی بُری حالت ہے اور میرا سوتیلا باپ چمکدار پوشاک پہنے پاس کھڑا ہے اور اس کے سینے پر ٹھوکریں مار رہا ہے۔" گورکی کو یہ منظر دیکھ کر تاب نہ رہی اور اس نے میز سے چھری اُٹھا کر اپنے سوتیلے باپ کے ماری جس سے کپڑے تو پھٹے۔ لیکن چوٹ نہ آئی۔ گورکی آگے چل کر لکھتا ہے کہ "اسی روز شام کو اماں جان میرے پاس آئیں۔ پیار کیا اور رو کر کہنے لگیں، میں خود کو خطا محسوس کرتی ہوں مجھے معاف کردو۔"

یہ اس زمانے کے واقعات ہیں جب گورکی چھ سال کا تھا۔ جب ۴۶ سال کا ہوا اس وقت لکھتا ہے "چالیس برس گزر گئے لیکن آج بھی اس کمینہ پن کو ایک عورت کی چھاتی پر ضرب لگاتے دیکھتا ہوں۔" اس چھری کے واقعہ کے کچھ ہی عرصے بعد گورکی کا سوتیلا بھائی پیدا ہوا۔ ماں زچگی کے زمانے ہی میں رخصت ہوگئی اور ماں کے مرنے کے کچھ ہی دن بعد وہ بچہ بھی چل بسا۔

ماں کے بعد گورکی کا نانا نانی کے سوا کون تھا چنانچہ وہ وہیں رہنے لگا۔ یہاں کا ماحول بڑا خراب تھا۔ گورکی کے ماموں شرابی، کبابی اور عیاش تھے۔ ہر وقت یا تو آپس میں یا اپنے ماں باپ سے برسرِ پیکار رہتے تھے ایک دن ایسی لڑائی ہوئی کہ گورکی کی نانی کی بانہہ ٹوٹ گئی۔ گورکی کا ابتدائی بچپن ان ہی لڑائی جھگڑوں میں گزرا۔ جب ذرا بڑا ہوا تو نانی نے اسکول میں داخل کردیا۔ لیکن اسکول کے وقت کے علاوہ گورکی ایک بوری لیے سڑکوں پر ردّی، دھجیاں اور کیلیں وغیرہ چُنتا پھرتا اور ان کو فروخت کرکے جو کچھ ملتا نانی اماں کو لا کر دیدیتا۔

لڑکپن شروع ہوا تو تعلیم ختم ہوگئی۔ نانی نے ایک جوتے والے کی دوکان پر نوکر کرا دیا۔ اس دوکان پر پہلا سبق یہ ملا "بے ایمانی کے بغیر دکانداری نہیں ہوتی" گورکی اس زمانے کا ایک واقعہ بیان کرتا ہے "دوکان کے نوکر بے ایمان تھے دوکان کی چیزیں اڑا لیتے تھے۔ ایک دن قریب کے گرجے کا دربان میرے پاس آیا اور مجھے پھسلانے لگا کہ اس کے پیر کا ایک جوتا چرا کر اس کو دیدوں۔ میں نے کہا اچھا تم بڈھے آدمی ہو تمہارے سفید بالوں کی خاطر مجھے یہ بھی کرنا پڑے گا۔ یہ بات ختم بھی نہیں ہوئی تھی کہ دربان بولا اگر میں تمہاری چوری کا ذکر مالک سے کردوں تو کیا ہو؟ دربان کی اس دھمکی سے میں بہت ڈرا۔ میرا خوف دیکھ کر وہ مجھے ایک طرف لے گیا اور چوری کے ارادہ پر مجھے بُرا بھلا کہنے لگا۔ پھر کہا "میاں لڑکے کیا یہ خیال کرتے ہو کہ انسان انسان کے ساتھ بُرائی نہیں کرسکتا۔ اہاہا تم بڑے بیوقوف ہو" گورکی ملازمت چھوڑ کر نانا نانی پر بار ہوگیا۔ اب نانی اور نواسے جنگل میں جاتے اور وہاں سے رس بھری اور خشک میوے چُن لاتے اور ان کو فروخت کرکے جو کچھ ملتا وہ نانی نانا کو لا کر دیدیتیں۔ اس پر بھی نانا آنکھیں نکالتے، غراتے اور کہتے تم تو کھانا جانتے ہو کمانا نہیں جانتے۔ کچھ دن بعد نانی نے اپنی بہن کے لڑکے کے دفتر میں گورکی کو ۲ روبل سالانہ پر رکھوا دیا۔ وہاں رشتہ کی نانی نے گورکی کو اتنا پریشان کیا کہ ایک روز جب اس نے صبح کا ناشتہ لانے کے لئے گورکی کو پیسے دیئے تو بجائے ناشتہ لے کر دفتر جانے کے وہ دریائے والگا کے کنارے نکل گیا اور ایک جہاز پر ملازمت کرلی خدا کی قدرت کہ اس جہاز کے بڑے باورچی کو کتابیں سننے کا شوق تھا اس نے گورکی کو یہ خدمت سپرد کی۔ اس طرح گورکی کو افسانے پڑھنے کا خوب موقع ملا اور شوق بھی بڑھ گیا۔ کیونکہ یہ ملازمت ایک خاص میعاد تک کی تھی اس لئے جب وقت پورا ہوگیا تو ملازمت بھی ختم ہوگئی اور گورکی کے سامنے پھر روزی کا مسئلہ آگیا وہ تلاش معاش میں شہر بہ شہر پھرتا پھراتا طفلس پہنچا جہاں حسنِ اتفاق سے اس کی ایک ایسے شخص سے ملاقات ہوئی جس کی ہمدردی نے گورکی کی زندگی بنادی۔ یہ شخص کلی آزنی نامی ایک انقلابی تھا جو سائبیریا میں چھ سال کی قید بامشقت کاٹ چکا تھا اس کا ایک بہت اچھا ذاتی کتب خانہ بھی تھا۔ یہ شخص گورکی کا شفیق ہوگیا اور اس نے آوارہ گرد گورکی کو اپنے کتب خانے سے فائدہ اٹھانے کی اجازت دیدی۔ جب دوستی بڑھی تو ایک دن کلی آزنی نے گورکی

کو کمرے میں بند کر دیا اور کہا کہ جب تک اپنی زندگی کے حالات ایک مضمون کی شکل میں قلمبند نہ کر دو گے دروازہ نہ کھلے گا چنانچہ گورکی نے حکم کی تعمیل کی اور وہ مضمون مقامی سرکاری اخبار میں ۲۴ دسمبر ۱۸۹۲ء کے پرچہ میں طبع ہوا۔ گورکی نے جب اپنی خود نوشتہ سوانح حیات سرکاری اخبار میں دیکھی تو بہت مسرور ہوا اب وہ کہانیاں لکھنے لگا اور رسائل میں بھیجنے لگا جس سے اس کی کچھ کچھ شہرت بھی ہونے لگی لیکن آمدنی کی کوئی صورت نہ نکلی اس زمانہ میں ایک وکیل کی محرری کر لی۔ تنخواہ ملی تو عشق کی سوجھی ایک پولینڈ کی عورت سے شادی کر بیٹھے ایک مکان دو روبل مہینہ کرایہ پر لیا وہاں عسرت میں بسر کی نتیجہ یہ نکلا کہ پھیپھڑوں کی دق ہو گئی۔ بھلا دماغی انسان اور بے دماغ عورت کی کب بنھ سکتی ہے ایک دن گورکی اور اس کی بیوی ہم آغوش تھے تو گورکی نے اس کو محبت کے متعلق اپنا نظریہ سمجھانا شروع کیا۔ گورکی لکھتا ہے "وہ میری باتیں سن کر بھونچکی سی ہو گئی اور کہنے لگی کیا واقعی تمہارا یہ خیال ہے۔ کیا واقعی تم یہ خیال کرتے ہو؟" وہ گورکی کی ہم خیال نہ تھی۔ اسکا نظریۂ محبت محض تفریحی تھا۔ وہ گورکی کے دوستوں سے بے تکلف تھی جس سے اس کو حسد ہوتا تھا۔ گورکی اپنی اس کمزوری کو فلسفے کے رنگ میں ڈھال کر یوں بیان کرتا ہے "مرد کی زندگی میں چند لمحے ایسے بھی آتے ہیں جب وہ اپنا دل عورت کے سامنے اس طرح کھول کر رکھدیتا ہے جس طرح کہ خدا کا پرستار خدا کے سامنے اپنے ظاہر و باطن کو بے نقاب کرتا ہے۔ جب عورت کے روبرو مرد کا باطن بے نقاب ہو جاتا ہے تو مرد خود اپنے آپ سے اجنبی سا محسوس کرنے لگتا ہے۔ شاید مرد میں حسد اس خوف سے پیدا ہوتا ہے کہ کہیں اس کی شریک حیات دوسرے مرد سے اتنی مانوس نہ ہو جائے کہ وہ شوہر کی رازکی باتیں دوسرے سے کہدے" قصہ کوتاہ کچھ عرصے بعد گورکی اور اس کی بیوی میں علیحدگی ہو گئی اور گورکی از سر نو آوارہ گردی کرتا رہا سمارا پہنچ گیا جہاں اس نے اخبار کے دفتر میں ملازمت کر لی۔

اخباری دنیا میں داخل ہو جانے سے زیادہ میل جول اور شہرت ہو ہی جاتی ہے چنانچہ گورکی کی بھی بہت سے لوگوں سے شناسائی ہو گئی۔ اگر ایک طرف شہرت بڑھی تو دوسری طرف اسکو برقرار رکھنے کے لیے زیادہ محنت کرنی پڑی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ گورکی ۱۸۹۶ء میں بہت سخت بیمار ہو گیا پھیپھڑوں کی دق تو دق کر رہی تھی لیکن جب کمزوری بڑھی تو ایک اور دکھ عود کر آیا۔ افلاس و مصائب کے زمانہ میں گورکی نے خودکشی کی نیت سے اپنے گولی مار لی تھی جو کمر میں ہی رہ گئی تھی اب اس گولی نے بھی تکلیف دینی شروع کر دی۔ حرارت ۱۰۴ درجہ رہنے لگی۔ ڈاکٹروں نے کچھ دن تو علاج کیا پھر زندگی سے ناامیدی ظاہر کی لیکن گورکی کی کاٹھی اتنی مضبوط تھی کہ وہ بیماری کو سنبھال لے گیا صحت ہو گئی تو دوستوں نے زور دیا کہ افسانوں کا مجموعہ طبع کرا دیا جائے۔ شاید اس سے گزارے کے لئے کچھ رقم وصول ہو جائے بڑی مشکل سے افسانے طبع ہوئے اور اس سے زیادہ دشواری سے دوکانداران کو ۵۰ فیصدی کمیشن لے کر فروخت کرنے پر راضی ہوئے۔ لیکن کتب فروشوں کی توقع کے خلاف ایک سال ہی میں ساری کاپیاں فروخت ہو گئیں۔ جب افسانے دوسری مرتبہ شایع ہوئے اور ناشروں نے گورکی کو ایک ہزار روبل نذرانہ کیئے تو اس غیر متوقع خوش قسمتی پر گورکی بہت خوش ہوا۔ اس کے پڑوسی کا بیان ہے جب گورکی کو ایک ہزار روبل ملے تو اس کو خوشی کی بہ نسبت حیرت ہوئی وہ میری ماں کے پاس آئے اور ٹانگیں چوڑی کر کے کھڑے ہو گئے۔ اور کہنے لگے "دیکھو! دیکھو!! انھوں نے مجھے پورے ایک ہزار روبل بھیجے ہیں۔ شیطان ان کو سمجھے انھوں نے مجھے پورے ایک ہزار روبل بھیجے ہیں۔ میں اس رقم کا کیا کروں گا۔ اسی دن سے گورکی کی فضول خرچیاں شروع ہو گئیں۔ سمارا میں گورکی کے ساتھ ایک اور دلچسپ واقعہ پیش آیا جس کو اس نے اس طرح بیان کیا ہے۔

"ایک روز دریائے والگا کے کنارے ٹہل رہا تھا کہ آواز آئی مدد کرنا! ارے بھائیو مدد کرنا! رات اندھیری تھی کچھ صاف دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ مجھے اندھیرے میں ایسا معلوم ہوا کہ کوئی دریا میں ہاتھ پیر مار رہا ہے، میں فوراً دریا میں کود پڑا تیرتا ہوا ڈوبنے والے کے پاس پہنچا اتفاق سے اس کے بال میرے ہاتھ میں آ گئے۔ میں بال پکڑ کر اس کو کھینچتا ہوا لے آیا جب کنارے پر آ گئے تو اس آدمی نے اچانک میرا گلا پکڑ لیا اور کہنے لگا "ابے! تجھے کیا حق تھا کہ میرے بال پکڑ کر مجھے کھینچا، میں نے

جواب دیا، ارے بھائی تم ڈوب رہے تھے۔ مدد کے لیے چلاّ رہے
تھے، وہ بولا، ارے احمق پانی تو میرے کندھوں تک تھا۔ رسّی
میں نے پکڑ رکھی تھی پھر میں کیسے ڈوبتا؟ کیا تو اندھا ہے؟ میں
نے جواب دیا۔ لیکن تم مدد کے لیے تو چلاّ رہے تھے کیا نہیں چلائے
اس نے کہا پھر کیا ہوا اگر میں مدد کے لئے چلایا۔ فرض کرو کہ میں
چلاؤں تو احمق ہے۔ تو احمق ہے تو کیا تو اس کا یقین کر لے گا۔
اچھا اب یا تو مجھے ایک روبل دے ورنہ تھانے چل، میں نے کچھ
دیر تو اس سے حجت کی پھر احساس ہوا کہ اپنے نقطۂ نگاہ سے
یہ بھی درست کہتا ہے میرے پاس تانبے کے کچھ سکے تھے وہ اس
کو دے کر جان چھڑائی اور گھر ہولیا۔ اس تجربہ کی بنا پر دنیا
کو زیادہ بہتر طریقہ سے سمجھنے لگا۔"

گورکی کی شہرت ہوئی تو اسکے دوست چیخوف ..... نے
گورکی کو غیر معروف وطن ترک کرنے اور ماسکو کی رہائش اختیار
کرنے کا مشورہ دیا لیکن گورکی نہ مانا۔ آخر کار چیخوف کو ایک
ترکیب سوجھی اس نے گورکی کو لکھا۔

"کل میں ٹالسٹائی کی خدمت میں حاضر ہوا تھا انھوں
نے تمہاری بڑی تعریف کی اور یہ خیال ظاہر کیا کہ تم
قابل قدر مصنف ہو۔ انھیں تمہارے دو افسانے،
گولتوا فیرا اور اون۔ دی رافٹ، بہت پسند ہیں لیکن
مالوا پسند نہیں آیا۔ وہ فرماتے تھے کہ جو کچھ تمہارا دل چاہے تم ایجاد
کرو لیکن نفسیاتی کیفیات ایجاد نہیں ہو سکتیں تم ایسی کیفیات ایجاد
کرتے ہو جو کم از کم ٹالسٹائی کے تجربہ میں نہیں آئیں میں نے ان کی
خدمت میں عرض کر دیا ہے کہ جب بھی تم ماسکو آؤ گے تو تم
اور میں ان کی خدمت میں حاضر ہوں گے۔
ٹالسٹائی تمہارے متعلق مدت سے دریافت کر رہے
تھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ تمہاری بابت بہت
اچھا خیال رکھتے ہیں۔"

یہ معلوم ہونا کہ ٹالسٹائی ملنا چاہتے ہیں کسی نوخیز مصنف
کے لیے باعث فخر تھا۔ چنانچہ اس اطلاع کے ملتے ہی گورکی
نے ماسکو جانے کی ٹھان لی لیکن اس زمانہ میں اخباری زندگی
کے انقلابی مقالے رنگ لا رہے تھے اور پولیس پیچھے پڑی ہوئی
تھی ایک مدت بعد جب پولیس سے رہائی ملی تو جنوری سنہ ۱۹۰۰ء
میں گورکی ٹالسٹائی سے ملنے گیا۔ ٹالسٹائی اس ملاقات کے
متعلق اپنی ڈائری میں اندراج کرتے ہیں۔

"گورکی ملنے آئے ان کے ساتھ باتوں میں اچھا وقت گزرا
مجھے گورکی پسند آئے۔ ایک عام روسی کی نفسیاتی کیفیت
کے پورے ترجمان ہیں۔ اور خود بھی انھیں میں سے ایک ہیں"

گورکی اس پہلی ملاقات کو اس طرح بیان کرتے ہیں۔

"ٹالسٹائی مجھے کتب خانے میں لے گئے مجھے بٹھایا اور خود
میرے سامنے جگہ لے کر میرے افسانہ "وارلنسکا" کی تحلیل
کرنے لگے کہنے لگے۔ تمہارے افسانے کی وہ لڑکی وارلنسکا
صحت کی اچھی اور عمر بھی پندرہ سال لیکن وہ تخلیقی محبت
سے بے پروا اور وہ نوجوان پروفیسر سے ہم آغوش تک
نہیں ہوئی یہ کیسے ہو سکتا ہے یہ نفسیاتی طور پر غلط ہے
پندرہ سال کی نوجوان لڑکی یہ چاہتی ہے کہ کوئی اس
کو چھوئے اور اس سے ہم آغوش ہو۔ ٹالسٹائی نے دوران
گفتگو میں ایسی بے حجابی برتی کہ میں پریشان سا ہو گیا۔
کبھی کبھی ان کی گفتگو صرف نامناسب ہی نہیں بلکہ گندی
تک ہو جاتی تھی"

ٹالسٹائی کی اس غیر متوقع طرز گفتگو پر پہلے پہلے تو گورکی کو یہ گمان
ہوا کہ شاید ٹالسٹائی اس کی سطح پر آ کر اس سے گفتگو کرتے ہیں
شاید یہ روسی ادب کے جنرل اس کو دیہاتی خیال کر کے اس سے
گاؤں والوں کی سی فحش گوئی کرتے ہیں۔ دو چار ملاقاتوں کے
بعد گورکی پر یہ راز افشا ہوا کہ ٹالسٹائی اصولاً دیہاتی زبان
بولنا پسند کرتے ہیں کیونکہ اس میں تصنع اور بناوٹ نہیں ہوتی
وہ زبان دانی اور شہری زبان کے تکلفات کو اچھا نہیں سمجھتے
جب دوستوں سے باتیں کرتے ہیں تو ٹھیکرا بن جاتے ہیں گورکی
کا بیان ہے "بعض مرتبہ ٹالسٹائی ایسی عریاں گفتگو کرتے تھے
کہ ہمارے چہرے شرم سے سرخ ہو جاتے تھے"

ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ ٹالسٹائی، گورکی اور چیخوف ٹہل
رہے تھے کہ دفعتاً ٹالسٹائی نے چیخوف سے اس کے نسوانی
تجربات بیان کرنے کی فرمائش کر دی۔ چیخوف بہت پریشان
ہوا۔ جب ٹالسٹائی نے چیخوف کی گھبراہٹ دیکھی تو خود
اپنے نسوانی تجربات ایک خاص لطف اور رنگینی کے ساتھ
بیان کرنے شروع کر دیے گورکی لکھتا ہے "اس وقت گندے
سے گندے الفاظ بھی جو ان بالوں سے ڈھکے ہوئے ہونٹوں سے

نکلتا تھا وہ اپنی غلاظت کھو دیتا تھا اور سادہ قدرتی معلوم دیتا تھا۔" کریمیا کا ایک اور واقعہ گورکی کا ایک دوست گورکی کی زبانی اس طرح بیان کرتا ہے۔

"ایک دن میں اور اس کا دوست سمندر کے کنارے ٹہل رہے تھے کہ ہم نے دیکھا کہ کچھ فاصلہ پر ٹالسٹائے کھڑے ہوئے ہیں اور ایک سمت کسی شے کو آنکھ مار رہے ہیں۔ ہم نے ادھر دیکھا تو کیا دیکھتے ہیں کہ ایک کبوتر کا جوڑا بیچ سڑک پر تخلیقی محبت میں مشغول ہے اور جہاں دیدہ لطف آشنا بڈھا ان کی طرف آنکھ مار رہا ہے"

کریمیا سے واپسی پر گورکی اور ٹالسٹائے میں خط وکتابت شروع ہو گئی، چند خطوط نمونتاً پیش ہیں۔

گورکی کا خط ٹالسٹائے کے نام۔

لیونیکولیوچ۔ اس حسن اخلاق کا جو آپ نے مجھ سے روا رکھا شکریہ مجھے آپ سے مل کر بہت مسرت ہوئی اور آپ سے نیاز حاصل ہو جانے پر فخر کرتا ہوں۔ اگرچہ مجھے پہلے سے اس کا علم تھا کہ آپ ہر مہمان سے سادہ اور پر خلوص طریقہ پر ملتے ہیں لیکن جو محبت آپ نے میرے ساتھ روا رکھی اس کی مجھے امید نہ تھی۔ اگر نامناسب خیال نہ فرمائیں تو اپنی ایک تصویر روانہ فرمائیں۔ میں ملتجی ہوں کہ تصویر سے محروم نہ فرمائیں۔"

میں ہوں آپ کا نیازمند

اے۔ پیشوف (گورکی کا نام)

ٹالسٹائے کا خط گورکی کے نام

"معاف کرنا کہ میں ایک عرصہ کے بعد جواب دے رہا ہوں اور ہنوز تصویر بھی روانہ نہ کر سکا مجھے تم سے مل کر اور تم کو زیادہ قریب سے جان کر بہت خوشی ہوئی اور میرے دل میں جو تمہاری محبت ہے وہ مجھے مسرور کرتی ہے۔ اکسا کوف کہا کرتا تھا کہ چند مصنف اپنی تصنیف سے بہتر ہوتے ہیں اور چند خراب۔ میں تمہاری تصانیف کا مداح ہوں لیکن ان سے زیادہ تمہارا مداح ہوں میرے اس جملہ سے سمجھ جاؤ کہ میں تمہارا کس درجہ مداح ہو گیا ہوں۔ تمہاری نسبت میری تعریف اگر قابل قدر ہے تو صرف اس لئے کہ یہ بے لوث ہے۔ اچھا رخصت میں خلوص سے اپنا ہاتھ تمہارے مصافحہ کے لئے پیش کرتا ہوں۔"

لیو ٹالسٹائے

گورکی کا خط ٹالسٹائے کے نام

"آپ کی تصویر اور محبت بھرے الفاظ کا بہت بہت شکریہ۔ لیونیکولیوچ۔ میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ میری ذات میری تصانیف سے بہتر ہے لیکن میرا یہ خیال ضرور ہے کہ ہر مصنف اپنی تصنیف سے بہتر ہوتا ہے، آخر کتاب ہے کیا؟ ایک معرکۃ آرا کتاب بھی مردہ الفاظ کا مجموعہ ہے جو صرف حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ برخلاف اس کے انسان کی زندہ ذات خدا کی صفات کی حامل ہوتی ہے میرا خدا کا مفہوم وہ جذبہ ہے جو انسان کو حقیقت شناسی، انصاف اور اپنے آپ کو کامل بنانے پر ابھارتا ہے۔ اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ ایک برا انسان بھی ایک اچھی کتاب سے بہتر ہوتا ہے۔ کیا ایسا نہیں ہے؟ میرا یہ راسخ یقین ہے کہ اس زمین پر انسان اشرف المخلوقات ہے اور مجھے ڈیوکرٹیس کے اس خیال سے اتفاق ہے۔ صرف انسان کا وجود حقیقت ہے باقی سب زاویۂ نگاہ ہے۔" میں انسان کا پرستار ہوں اور ہمیشہ رہوں گا۔ ہاں میں اس جذبہ کو پوری طاقت سے ادا نہیں کر سکتا۔ میں تجدید ملاقات کے لئے مضطرب ہوں اور مجھے افسوس ہے کہ فوراً ہی اپنی آرزو پوری نہیں کر سکتا مجھے کھانسی ہے اور دوران سر کی شکایت ہو گئی ہے اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ میں تیزی سے کام کر رہا ہوں۔ آج کل ضرورت سے زیادہ عقلمند لوگوں کے متعلق افسانہ لکھ رہا ہوں میرے خیال میں ایسے افراد جو اپنے آپ کو عقلمند تصور کرتے ہیں ارذل المخلوقات ہوتے ہیں۔ مجھے خوف ہے کہ مزید تحریر کہیں آپ کو اکتا نہ دے۔ اچھا رخصت میں مودبانہ آپ سے مصافحہ کرتا ہوں۔ میری طرف سے گھر والوں کو آداب۔

میں ہوں آپ کی صحت کا دعاگو

اے۔ پیشوف

کچھ عرصے بعد گورکی پھر روسی قلندر کے پاس آ گئے اور اس کی ہر ادا کا بغور مطالعہ کرنے لگے دونوں ساتھ ٹہلنے جاتے تو ٹالسٹائے گورکی کے افسانوں کے کرداروں کا بڑا مذاق اڑاتے اور کہتے۔ گورکی تم اپنے کردار ایجاد کرتے ہو۔ کبھی کہتے "تمہاری تصانیف سے تمہاری

.... باتیں زیادہ دلچسپ ہیں" ایک دفعہ کہنے لگے
"گورکی تم روحانیت پسند ہو، موحد ہو، اس قسم کے لوگ اشتراکی نہیں ہوتے بلکہ ملوکیت پسند ہوتے ہیں۔ ہیوگو۔ ہیوگو بالکل فضول، بکواس، ہاں تمہارا افسانہ مسافر، مجھے پسند ہے کیونکہ اس میں تم نے ایجاد سے کام نہیں لیا ہے اور وہ تمہارا دوست چیخوف شکسپیئر سے بھی خراب ڈرامے لکھتا ہے" ایک دن ٹالسٹائے کہنے لگے "ہم سب ادیب بے تکے موجد ہوتے ہیں۔ مجھے دیکھو جب میں افسانہ لکھتا ہوں تو کسی کردار پر مجھے رحم آنے لگتا ہے اور اس میں چند اچھی خصوصیات پیدا کر دیتا ہوں اور کبھی کسی کردار کو اچھی خصوصیات سے محروم کر دیتا ہوں تاکہ سب کردار ایک دوسرے سے گرنے نہ پائیں" اور پھر سنجیدہ لہجہ میں فرمایا" اسی لئے تو میں کہتا ہوں کہ ادب جھوٹ ہے، ایک دھوکا ہے اور اس وجہ سے مذموم ہے"

سنہ ۱۹۰۱ء میں حکومت کی مخالفت کی بنا پر گورکی اپنے ہی شہر کی جیل میں قید کر دیا گیا۔ جب ٹالسٹائے کو گورکی کے منیجر نے اس حادثہ کی خبر دی تو ٹالسٹائے نے فوراً ہی زار روس کے بہنوئی اور وزیر خارجہ کو خطوط لکھے جو حسب ذیل ہیں۔

ٹالسٹائے کا خط زار کے بہنوئی کے نام

جناب نواب صاحب!
وہی مصنف گورکی جس کی بابت گزشتہ سال میری اور آپ کی باتیں ہوئیں تھیں اور جس کی تصانیف کی آپ نے تعریف فرمائی تھی۔ اس پر ایک حادثہ گزر رہا ہے۔ وہ اپنے اہل و عیال سے چھین لیا گیا ہے اور بلا کسی عدالتی سماعت کے نوگورڈ کی جیل میں ڈال دیا گیا ہے۔ اس کی بیوی حالت اُمید میں ہے۔ جیل کے صحت شکن ماحول کا آپ خود اندازہ لگا سکتے ہیں اور خود سمجھ سکتے ہیں کہ وہ ایک دق کے مریض کے لئے کتنا مضر ثابت ہو سکتا ہے۔ گورکی کی بیوی اور اس کے دوستوں کو چونکہ اس کا علم ہے کہ بحیثیت ایک انسان اور مصنف کے میں گورکی کو پسند کرتا ہوں اس لئے انھوں نے مجھ سے یہ درخواست کی ہے کہ اس مصیبت میں جو کچھ بھی ان کی مدد کر سکتا ہوں کروں یہی وجہ ہے کہ میں آپ کو تکلیف دے رہا ہوں مجھے اُمید ہے کہ گورکی کو اس مصیبت سے نجات دلانے میں آپ سعی بلیغ فرمائیں گے اور نیکی کرنے کا جو یہ موقع ملا ہے اس کو ہاتھ سے نہ جانے دینگے۔ آپکا مخلص
تابعدار

ٹالسٹائے کا خط وزیر خارجہ کے نام

جناب عالی۔ گورکی کی بیوی اور اس کے دوستوں نے مجھ سے یہ درخواست کی ہے کہ پیشتر اس کے کہ نوگورڈ جیل میں بلا سماعت مقدمہ گورکی کو قتل کر دیا جائے میں اس کی رہائی کی کوشش کروں جو اس خاص جیل کے صحت شکن حالات مجھے معلوم ہوئے ہیں اُن کی بنا پر مجھے یقین ہے کہ ایک دق کا مریض ان حالات میں زیادہ دن تک زندہ نہیں رہ سکتا میں گورکی کو صرف اسی حیثیت سے نہیں جانتا کہ وہ یورپ کا ایک مشہور ادیب ہے بلکہ میں اسکو ایک معقول اور دلچسپ انسان ہونیکی حیثیت سے بھی جانتا ہوں۔ اگرچہ مجھے ذاتی طور پر آپ سے نیاز حاصل نہیں ہے لیکن مجھے اُمید ہے کہ گورکی اور اس کے اہل و عیال سے آپ ہمدردی فرمائیں گے اور جو کچھ آپ کے قبضۂ قدرت میں ہے اس سے دریغ نہ فرمائیں گے۔ اُمید ہے کہ مجھے نا اُمید نہ فرمائیں گے ....
لیو ٹالسٹائے

ان خطوط کا یہ اثر ہوا کہ گورکی کو جیل سے نکال کر صرف حراست میں رکھا گیا اس حراست کے دوران میں گورکی ٹالسٹائے کو خط لکھتے ہیں۔

"لیونیکولیوچ۔ میرے معاملے میں آپ نے جو سعی فرمائی اس کا بہت شکریہ۔ میں جیل سے رہا کر دیا گیا ہوں لیکن حراست میں ہوں۔ میری بیوی حالت اُمید میں ہے اس لئے حراست بھی رحمت ہے شاید ایک ماہ جیل میں رہا ہوں گا۔ اس عرصے میں میری صحت پر کوئی خاص برا اثر نہیں پڑا اور نہ میری بیوی کی صحت پر عدالتی تحقیقات جاری ہے، جہاں تک میں خیال کرتا ہوں اس تحقیقات کا یہ نتیجہ نکلے گا کہ وہ مجھے وطن سے دور کہیں پھینک دیں گے اور پولیس کی نگرانی میں رکھیں گے۔ دوبارہ میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور اس کی معافی چاہتا ہوں کہ اس معمولی سے معاملہ میں آپ کو تکلیف اُٹھانی پڑی۔
یہ حراست بڑی مضحکہ خیز ہے اگر ایک سپاہی باورچی خانہ میں ہے تو دوسرا میچے پر اور تیسرا سڑک پر۔ میں گھر کے قریب چہل قدمی کر سکتا ہوں لیکن پولیس کا سپاہی سایہ کی طرح ساتھ ہے۔ مجھے ان سڑکوں پر جانے کی اجازت نہیں جہاں آمد و رفت زیادہ ہو

میا سمی کو بھی ایک ایسے انسان کی نگرانی کرنا مضحکہ معلوم ہوتی ہے جس کا ارادہ کبھی کبھی وطن سے فرار ہونے کا نہیں۔ اچھا رخصت، آپ کو صحت، طاقت اور سکون قلب حاصل ہو۔ میں خلوص کے ساتھ آپ کے مصافحہ کے لئے اپنا ہاتھ پیش کرتا ہوں۔

اے پیشکوف

۱۶ر جولائی ۱۹۰۱ء کو جب ٹالسٹائے ایک خطرناک علالت کے بعد صحت یاب ہوئے تو دنیا کی ہر سمت سے تہنیت و مبارک باد کے تار آئے گورکی کے وطن سے بھی حسب ذیل تار آیا جس پر سب سے پہلے دستخط گورکی کے تھے۔

"سب لوگ بے حد مسرور ہیں کہ آپ بدبہ صحت ہیں۔
اے بزرگ انسان ہماری یہ دلی تمنا ہے کہ حق پرستی کے لئے تو اس دنیا میں صحت یاب رہے تاکہ تیرے انتھک شمشیر بکف الفاظ جھوٹ، کینہ اور افترا کے خلاف ہمیشہ جہاد کرتے رہیں۔"

۱۹۰۱ء میں جب ٹالسٹائے صحت کے خیال سے کریمیا گئے تو اس زمانہ میں دونوں دق کے مریض گورکی اور چیخوف بھی روسی قلندر کے پاس پہنچ گئے گورکی نے ایک یادداشت چھوڑی ہے جس کے حسب ذیل اندراجات دلچسپ ہیں۔

"ایک دن گورکی نے دیکھا کہ ٹالسٹائے اپنی مٹی میں ہاتھ دیئے کھڑے ہیں اور ایک گوہ (بڑی قسم کی چھپکلی) سے جو دھوپ کھا رہی تھی کہہ رہے ہیں "مزا آرہا ہے نا" پھر چاروں طرف دیکھا اور گوہ سے کہنے لگے "میں ہوں کہ زندگی میں کوئی لطف محسوس نہیں کرتا"۔

گورکی لکھتا ہے کہ باوجود اس امر کے کہ ٹالسٹائے نے اپنے پوشیدہ و پوشیدہ واقعات بے کم و کاست سپرد قلم کر دیے ہیں اور ان کا ذہنی رجحان شدت سے مذہبی تھا لیکن وہ زندگی کا معمہ نہ حل کر سکے تھے اور ان کی نگاہ جب بھی اٹھتی تھی تو خلا کے سوا کچھ نہ دیکھتی تھی گورکی لکھتا ہے "یہ خلا میں دیکھنا ٹالسٹائے کے ہر اثبات کی نفی کرتا ہے وہ جب اپنے بے تکلف دوستوں میں بیٹھتے تھے تو کبھی کبھی اس پردہ سے نقاب اٹھتا تھا"۔

ایک دن چیخوف نے لیو شیسٹوف کی کتاب "نطشے اور ٹالسٹائے کی تعلیمات میں خیر و شر کا تخیل" کا ذکر کیا اور اس پر تنقید کرتے ہوئے کہا کہ اس کو کتاب پسند نہ آئی۔ ٹالسٹائے نے اس کی فوراً مخالفت کی اور کہا "کتاب دلچسپ ہے۔ میں سطری قسم کے لوگوں کو پسند کرتا ہوں بشرطیکہ ان کے دل میں خلوص ہو۔ شیسٹوف کہتا ہے کہ حقیقت کی جستجو فضول ہے وہ درست کہتا ہے۔ حقیقت کس مصرف کی حقیقت معلوم ہو یا نہ ہو آخر مرجانا ہے" پھر تیزی سے بولے "ایک مرتبہ انسان فکر کرنے کا عادی ہو جائے پھر وہ خواہ کسی مسئلہ ہی پر غور کیوں نہ کرے در اصل وہ موت پر غور کرتا ہے اور جہاں موت ہے وہاں کیا حقیقت ہو سکتی ہے"۔

ایک دن ٹالسٹائے کہنے لگے "خلیفہ عبدالرحمٰن کہا کرتے تھے کہ تمام عمر میں ان کے چودہ دن خوشی سے گزرے ہیں لیکن میرے اتنے دن بھی خوشی سے نہیں گزرے اور اس کی یہ وجہ ہے کہ میں کبھی اپنے لئے زندہ نہیں رہا . . . . دکھاوے اور خود نمائی کے لئے زندہ رہا ہوں"۔ اس خود نمائی کے سلسلہ میں گورکی اور ٹالسٹائے کا حسب ذیل مکالمہ دلچسپ ہے۔

ٹالسٹائے:۔ گورکی ماسکو کب جا رہے ہو؟

گورکی:۔ اب تک چلا جاتا لیکن نوجوانوں کی لیگ نے مجھے دعوت دی ہے کہ ان کے جلسہ میں اپنا کوئی افسانہ پڑھوں۔

ٹالسٹائے:۔ کیا تم بہت اچھا پڑھتے ہو؟

گورکی:۔ نہیں تو۔

ٹالسٹائے:۔ تب دعوت قبول کرنے کی کیا ضرورت ہے! کیا خود نمائی مقصود ہے؟

گورکی:۔ (شرم سے سرخ ہو کر) نوجوانوں کی لیگ مصر ہے اس لئے مجھے دعوت قبول ہی کرنی پڑی۔

ٹالسٹائے:۔ خواہ کوئی مصر ہی کیوں نہ ہو لیکن اس طرح صرف خود نمائی کے لئے کہیں جانا ناجائز ہے۔ ایک دفعہ ماہرین سائنس کی کانگرس ہوئی ایک دوست مجھے بھی لے گئے جب میں صدر مقام پر پہنچا تو حاضرین نے مجھے پہچان لیا اور میرا استقبال کرنے کے لئے تالی بجائی۔ میرے دوست نے مجھے کہنی ماری اور کہا "لیو تمہارا استقبال ہو رہا ہے۔ حاضرین کے سامنے جھکو!" میں نے کہا کیوں جھکوں میں نے کیا قصور کیا ہے؟

اس مکالمے سے اگلے روز گورکی کے ایک دوست پولسی

ٹالسٹائے سے ملنے آئے تو ٹالسٹائے نے کہا ابھی کل میں نے تمہارے دوست کا دل دکھا دیا میں نے اس سے یہ نہیں کہا کہ اس کی سب سے بڑی ادبی خدمت یہ ہے کہ اس نے ہمارے سامنے ایک آوارہ انسان کا جیتا جاگتا مرقع پیش کیا ہے۔ دوستووسکی نے ایک مجرم کا اور گورکی نے ایک آوارہ انسان کا قابل داد مرقع پیش کیا ہے جو دنیا کے ادب میں یادگار رہے گا۔ گورکی میں صرف یہ کمی ہے کہ وہ بہت کچھ ایجاد کر دیتے ہیں نفسیاتی کیفیات کو وہ قدرتی نہیں رکھتے" ٹالسٹائے ایک دوست کو خط میں لکھتے ہیں "گورکی شاید غیر شعوری طور پر نٹشے کی مقبول تعلیم سے متاثر معلوم ہوتے ہیں مجھے نٹشے کی تعلیم بیحد مکروہ معلوم ہوتی ہے۔"

گورکی کے جو افسانے ٹالسٹائے کی نظر سے گزرے ان کے حواشی پر ٹالسٹائے کے قلم کے اس قسم کے نوٹ درج ہیں "غلط، نفرت آمیز، مکروہ، جب ٹالسٹائے نے گورکی کی تصنیف "اعترافات" پڑھی تو فرمایا "یہ عقل سے بالاتر ہیں" وفات سے دو سال قبل ٹالسٹائے اپنی ڈائری میں لکھتے ہیں "گورکی کی تصانیف پڑھیں بہت برا۔ مجھے ان کی ایجاد و اختراع بہت غلط معلوم ہوتے ہیں۔ اگر گورکی سے لطف اندوز ہونا ہے تو ان کی سقم پر نہیں بلکہ ان کی خوبیوں پر نظر رکھنی چاہئے۔ ڈائری میں دوسرا اندراج ہے گورکی کی تصانیف ختم کیں ایک مصنوعی جذبات طوفانی جذبات جو سب غلط اور اختراع معلوم ہوتے ہیں لیکن گورکی تمام کے ذہنی ہیں ان کو شاعری کرنی چاہئے کیونکہ شاعری میں خیال اور دماغ کے لئے آوارہ گردی کرنے کا میدان بہت وسیع ہے۔ شاعری میں ہر قسم کا اختراع سنبھ جاتا ہے یا پھر ڈراما لکھنا چاہئے کیونکہ اس میں بھی منظر اور ایکٹر ڈرامے کے سقم چھپا لیتے ہیں۔

ایک دن چیخوف اور ٹالسٹائے باتیں کر رہے تھے دوران گفتگو میں گورکی کا ذکر آ گیا چیخوف نے کہا "گورکی بڑا رحمدل انسان ہے" ٹالسٹائے نے فوراً گردن ہلائی اور بولے نہیں نہیں ان باتوں کو میں تم سے بہتر سمجھتا ہوں اس کی بطخ کی سی ناک ہے ایسے لوگ دل کے بڑے خراب ہوتے ہیں اور ہاں دوسری بات یہ ہے کہ عورتیں گورکی کو پسند نہیں کرتیں اور جس طرح کتا نیکدل انسان کو فوراً سونگھ لیتا ہے اسی طرح عورتیں بھی ایک نیکدل انسان کو سونگھ لیتی ہیں کیونکہ عورتیں گورکی سے محبت نہیں کرتیں اس لئے معلوم ہوتا ہے کہ وہ نیک دل نہیں ہے۔"

ایک دن ٹالسٹائے اور گورکی ٹہل رہے تھے کہ جھاڑی میں سے ایک چڑیا کے بولنے کی آواز آئی ٹالسٹائے نے اس کی آواز کی نقل کرنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہوا گورکی چڑیا رہ چکا تھا۔ اس لئے چڑیوں کی بابت اس کی معلومات کافی تھی گورکی نے اس چڑیا کی یہ خصوصیت بیان کی کہ یہ چڑیا بہت حاسد ہوتی ہے۔ اس پر ٹالسٹائے بولے "صرف ایک راگ سینے میں ہے اور اس پر بھی حاسد ہے۔ کیا ظلم ہے کہ انسان کے سینہ میں ہزاروں نغمے ہیں اور جب وہ حسد کرتا ہے تو دنیا اس کو برا کہتی ہے پھر حسد کی بابت گفتگو ہونے لگی اور ٹالسٹائے نے اپنے پہلے خیال سے جس کا اظہار وہ اپنے ناول "کوئرز سوناٹا" میں کر چکے تھے۔ اختلاف کیا گورکی نے کہا کہ "کرئزر سوناٹا" میں تو آپ نے اور خیال ظاہر کیا ہے اس پر ٹالسٹائے نے ہنس کر جواب دیا "میں چڑیا نہیں ہوں کہ ایک ہی راگ گائے جاؤں۔"

اگر ٹالسٹائے گورکی کی تصانیف پر سخت تنقید کرتے تھے تو گورکی بھی ٹالسٹائے کے فلسفہ پر تنقید کرنے میں کچھ کم نہ تھے گورکی کا خیال تھا کہ ٹالسٹائے کا فلسفہ ( ) مزاجی اور جنونیوں کا فلسفہ ہے۔ ان کا عدم تشدد اور اہنسا کا فلسفہ قوت عمل کو مفلوج کرتا ہے۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ گورکی ڈاکٹر الکوف اور ٹالسٹائے باتیں کر رہے تھے کہ ٹالسٹائے نے ایک مصنف کے ناول کے ایک سین کی بڑی تعریف کی جس میں ایک شرابی میاں نے اپنی بیوی کو زدوکوب کیا تھا لیکن باوجود خاوند کے اس تشدد کے شریف بیوی نے میاں کا بستر کیا اس کو آرام سے لٹایا اور اس کے سر کے نیچے تکیہ رکھا۔ ٹالسٹائے کی رائے تھی اس سین میں ادبی جوہر موجود ہے۔ گورکی اس وقت تو ٹالسٹائے کی رائے سنتا رہا لیکن جب ڈاکٹر الکوف کے ساتھ گھر واپس ہوا تو خیال میں مستغرق خود ہی خود طعن سے کہنے لگا تکیہ سر کے نیچے رکھ دیا! یہ ادبی جوہر ہے! ایک کفگیر اٹھا کر کھوپڑے پر مارتی" باوجود ان اختلافات کے گورکی ٹالسٹائے سے بہت محبت کرتا تھا۔ گرکیمیا کے حالات میں لکھتا ہے۔

"ایک روز چہل قدمی کر رہا تھا کہ دیکھا طالسطائے پتھروں میں تھکے بیٹھے ہیں ..... ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی پرانے پتھر میں جان پڑ گئی ہے ..... ایک پتھر پر کہنی ٹکی ہوئی ہے ٹھوڑی ہتھیلی پر رکھی ہے۔ ڈاڑھی کے سفید بالوں میں سے انگلیاں نکلی ہوئی ہیں اور سمندر کے پار نظر ڈال رہے ہیں ... سمندر کی موجیں اس پہاڑ سے ٹکرا رہی ہیں .... ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایک جادوگر سمندر کی موجوں کو حکم دے رہا ہے ..... اس سین نے میرے قلب پر عجیب اثر کیا ......

اس وقت مجھے ایسا احساس ہوا کہ جس وقت تک یہ انسان روئے زمین پر موجود ہے۔ میں یتیم و لیسر نہیں ہوں، جب طالسطائے کی وفات کی خبر آئی تو گورکی کی روتے روتے ہچکی بندھ گئی اور اس وقت واقعی اس کو یہ احساس ہوا کہ وہ یتیم و لیسر ہو گیا ہے۔

گورکی اگرچہ طالسطائے کے مذہبی تخیلات سے بیزار تھا، لیکن اتنا نہیں جتنا سمجھا جاتا ہے گورکی لکھتے ہیں:-

"طالسطائے نے اچانک مجھ سے دریافت کیا گورکی تم خدا کو کیوں نہیں مانتے؟ میں نے عرض کیا لیو نیکولیوچ مجھے یقین پیدا نہیں ہوتا۔ اس پر وہ فرمانے لگے یہ غلط ہے۔ تم فطرتاً خدا میں یقین رکھتے ہو۔ خدا کو مانے بغیر چارہ نہیں تم تھوڑے ہی عرصے میں اس حقیقت کا احساس کر لو گے۔ دنیا ویسی نہیں جیسا کہ تم اس کا ہونا چاہتے ہو۔ تمہارا خدا پر یقین نہ رکھنا صرف ہٹ دھرمی کی بنا پر ہے۔ کچھ لوگ صرف شرم کی وجہ سے خدا پر یقین نہیں رکھتے جیسے چند نوجوان ہیں کہ عورت ان کو پسند تو ہوتی ہے لیکن شرم یا کم سنی کی بنا پر اپنی پسندیدگی کا اظہار نہیں کرتے یقین مثل محبت کے جرأت چاہتا ہے۔ اگر انسان اپنے آپ سے کہے میں یقین کرتا ہوں تو سب کام درست ہو جائیں تم اپنی پیدائش سے خدا پر یقین رکھتے ہو اب یہ کہنا بیکار ہے کہ تم یقین نہیں رکھتے۔ تم کہتے ہو جمال اور جمال کیا شے ہے؟ یہ خدا کا بلند تر اور مکمل تر رُخ ہے کیونکہ طالسطائے نے اس سے قبل کبھی مجھ سے اس موضوع پر گفتگو نہیں کی تھی اس لئے اس غیر متوقع گفتگو نے مجھے متحیر سا کر دیا اور میں کچھ جواب نہ دے سکا۔ پھر طالسطائے نے ہنس کر انگلیاں میری طرف ہلاتے ہوئے کہا تم چپ رہ کر اپنا پیچھا نہیں چھڑا سکتے۔ ہرگز نہیں چھڑا سکتے" اس بات کے بعد گورکی لکھتے ہیں۔

"میں اگرچہ خدا پر یقین نہیں رکھتا لیکن اس وقت میں نے دل میں کہا کہ یہ انسان خدا سے قریب تر ہے"

ایک خط جس سے گورکی کی طبعی شرافت کا پتہ چلتا ہے حسب ذیل ہے جب گورکی کی تصانیف کی شہرت تمام دنیا میں پھیل چکی تھی اور وہ دنیائے ادب کا ایک درخشندہ ستارا مانا جا چکا تھا اس وقت اپنے دوست اور مربی گلی آزنی کو جس نے گورکی کو سوانح حیات لکھنے پر مجبور کیا تھا لکھا ہے:

میرے حبیب دوست اور استاد!

آج ۴۴ سال گزر چکے ہیں جب مجھے پہلی مرتبہ آپ سے نیاز حاصل ہوا تھا۔ جب آپ اور میں آخری مرتبہ ملے تھے اس کو بھی آج ۲۲ سال ہو چکے ہیں۔ اس طویل عرصے میں مجھے سیکڑوں انسانوں سے ملنے کا اتفاق ہوا جن میں امیر بھی تھے اور عالم بھی لیکن یقین کیجئے کہ ان میں سے کسی کی محبت نے اس جذبہ کو مدھم نہیں کیا جو آپ کے لئے میرے دل میں موجود ہے۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ آپ پہلے شخص تھے جس نے میری طرف خاص انسانی ہمدردی کی نظر ڈالی۔ آپ پہلے انسان تھے جس نے مجھ میں خود شعوری پیدا کی اور یہ آپ کی ہمت افزائی کا نتیجہ ہے کہ ۴۰ برس سے میں روسی ادب کی خدمت کر رہا ہوں اس امر کے تحریر کرنے کی ضرورت اس لئے محسوس کرتا ہوں تاکہ دنیا پر روشن ہو جائے کہ انسان کی انسان سے ہمدردی کرنا کتنی عجیب شے ہے۔ میرے دیرینہ دوست میرے حبیب اُستاد میں محبت اور تشکر سے اپنا ہاتھ آپ کے معانقہ کے لئے پیش کرتا ہوں۔

الیکسی پیشوف (گورکی کا اصل نام)

سیفی بک مینوفکچرنگ ڈپو

لیٹر بک، رائٹنگ پیڈ، نوٹ پیپر، اکسر سائز بک، نوٹ بک
ڈپلیکیٹ بک

اور

ہر قسم کی اسٹیشنری کے ہول سیل اور ریٹیل کیلئے

ہماری خدمات حاصل کرکے فائدہ اٹھائیے

سیفی بک مینوفکچرنگ ڈپو

۷۲ ۔ عبدالرحمٰن اسٹریٹ بمبئی ۳



کتب خانہ تاج آفس

پروپرائٹرز- سیفی فقیہ برادران

محمد علی روڈ بمبئی نمبر ۳

بڑھاپے میں

جوانی کی طاقت اور

تندرستی

پھر حاصل کیجیے

NIXOL



نِکسول

چندروزہ نِکسول کے استعمال سے

کمزور اور بوڑھے اشخاص میں بھی جوانوں کی سی طاقت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس طاقت کا دار و مدار جسم کے غدودوں پر ہے جیسا کہ تصویر میں بتایا گیا ہے نِکسول ان تمام غدودوں کو طاقت پہنچا کر انسان کو مضبوط بناتا ہے۔ قیمت بڑا بکس آٹھ روپیہ چھوٹا بکس تین روپیہ

ہر اچھے دوا فروش سے طلب کیجیے!

نکسول ڈپو، پوسٹ بکس نمبر ۳۰۶۵ بمبئی ۳

Printed and published by Saghar Nizami for the Proprietors Adabi Markaz Hind Publishers
at the Kadri Press Noor Manzil Mohamedali Road BOMBAY 3,

ہر قسم کی نہایت اعلیٰ چھپائی و رنگین لیتھو پرنٹنگ کا کام
نیز فینسی پیپر باکس و بلاک بکفایت تیار کئے جاتے ہیں

قادری پیپر بکس فیکٹری

نور منزل - محمد علی روڈ - بمبئی ۳

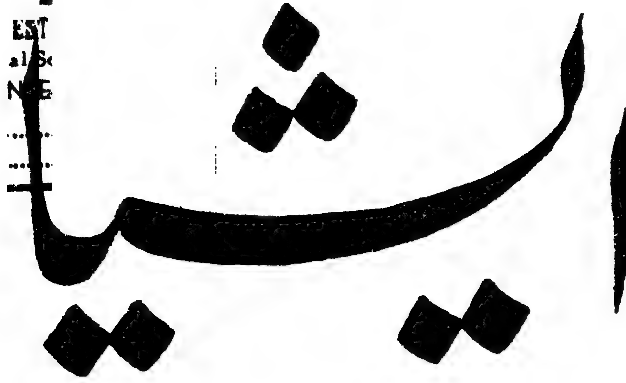
TEL:-27656

Kadri Paper Box Factory.

CARDBOARD BOX MANUFACTURERS AND PRINTERS

NOOR MUNZIL, MOHAMEDALI ROAD, BOMBAY 3.

ادبی مرکز ہند پبلشرز کا ماہنامہ



پروپرائٹرز ماہنامہ ایشیا ادبی مرکز ہند پبلشرز

ساغر نظامی

عبدالقادر محمد قادری

ناشر

ادبی مرکز ہند پبلشرز

ادارہ

ذکیہ سلطانہ

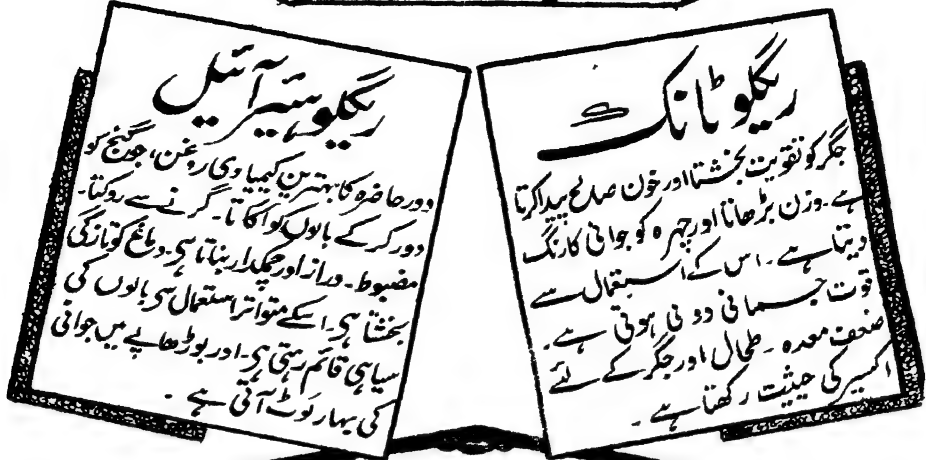
ساغر نظامی

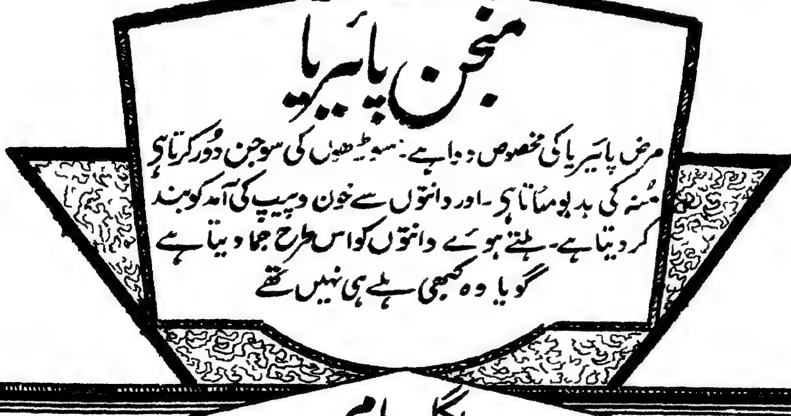
کورٹ رائل کرائسٹ چرچ روڈ بائیکلہ بمبئی ۸

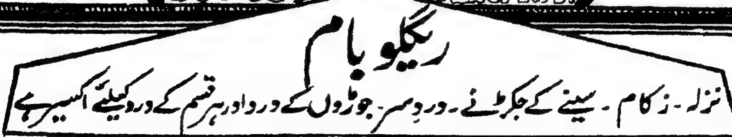
سالانہ چندہ	ششماہی چندہ	قیمت فی پرچہ
آٹھ روپیہ	پانچ روپیہ	بارہ آنے

پبلشر ساغر نظامی نے قادری پریس نور منزل محمد علی روڈ بمبئی ۳ میں چھپوا کر ادبی مرکز، ۷۔ اے۔ کورٹ رائل کرائسٹ چرچ روڈ، بائیکلہ بمبئی ۸ سے شائع کیا

ریگلو پروڈکٹس







ریگلو کیمیکل ورکس پردھان منشن۔ جے جے ہسپتال۔ بمبئی ۳

ماہنامہ ایشیا

جلد (۱۰) فروری سنہ ۱۹۴۹ء نمبر (۱)

۳

Call
Sub

انجام سے آغاز تک!

ایشیا ۵ سال کے بعد پھر شائع ہو رہا ہے۔ التوا کی یہ مدت اتنی طویل ہے کہ اس کی اشاعت کا خیال بھی دل میں نہیں آنا چاہئے تھا لیکن یقین کیجئے کہ ان پانچ برسوں میں ایک لمحہ بھی اس خیال سے آزاد نہیں گذرا کہ ایشیا کو زندہ ہونا چاہئے۔

ایشیا ۱۹۳۵ء سے ۱۹۴۴ء تک جاری رہا یعنی کامل ۹ سال تک اُس نے اُن تمام سیاسی، تہذیبی، علمی اور ادبی تحریکوں میں اپنی بساط کے مطابق حصہ لیا جو اس ملک کی ترقی پسند تحریکیں تھیں، اور جن تحریکوں کی کامیابی سے ملک کا مستقبل وابستہ تھا۔

ایشیا نے قومی تحریک کے ساتھ ساتھ ادب کی نئی تحریک کے لئے کام کیا۔ اُس نے صاف سوچنے والے شعراء اور اہل قلم کا ایک ترقی پسند حلقہ اس وقت بنایا جب ترقی پسند تحریک شروع بھی نہیں ہوئی تھی اور جب یہ تحریک شروع ہوئی تو ایشیا سب سے پہلا ماہنامہ تھا جس نے اس کی تائید و تبلیغ میں نمایاں حصہ لیا۔ نوجوان ذہن کے لئے وہ مستقل ترغیب تھا۔ اس نے نیا ادب، نئے ادیب اور نئے ادب نواز پیدا کئے اور خاص طور پر اردو پڑھنے والے ہندو مسلم عوام میں سیاسی شعور پیدا کرنے کی اَن تھک کوشش کی جس کی بنیاد ہنگامی سیاسیات پر نہیں، سیاست کی بنیادی باتیں جاننے پر تھی۔

ایشیا نہ صرف ہندو مسلم اتحاد کا دیوانہ تھا بلکہ اتحاد ایشیا کے گیت گانے والوں میں سے تھا اس کی آرزو تھی کہ مشرق کے تمام بکھرے ہوئے تہذیبی رشتے اس طرح جڑ جائیں کہ پھر کوئی طاقت ان کو نہ توڑ سکے۔

وہ اُن دیوانوں کا ایک کارواں تھا جو سود و زیاں سے آزاد ہو کر متحدہ قومیت کا خواب دیکھتے تھے، متحدہ ملک کا خواب دیکھتے تھے۔ انسانیت کا خواب دیکھتے تھے اور ان خوابوں کو حقیقت بنانے کے لئے انھوں نے اپنی فکری و عملی قوتوں کو وقف کر دیا تھا

خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہوئے۔ لیکن خواب شرمندۂ تعبیر ہوں گے۔ ہرچند کہ ۵ سال میں ملک کا نقشہ ہی نہیں بدلا، دنیا کا نقشہ بدل گیا ہے۔ لیکن ہر دم اک تازہ تغیر، اک نئی بے چینی، اک نیا کرب، اس بات کی دلیل ہے کہ کوئی بڑی پیدائش عدم میں کسمسا رہی ہے اور خواب حقیقت ضرور بنیں گے۔

۵ سال قبل ہمارے سامنے ملک کی آزادی اور تعمیر کا مقصد تھا۔ یہ مقصد آزادی کے بعد بھی پورا نہیں ہوا۔ تقسیم نے اس مقصد کی راہ میں نئی پیچیدگیاں پیدا کر دی ہیں ان پیچیدگیوں نے پہلی تمام کوششوں کو بے اثر کر دیا ہے۔ لہٰذا اب ازسرنو نئے حالات کی روشنی میں تمام بنیادی و تعمیری کوششیں کرنی ہوں گی۔

جہاں تک ایشیا کے طریق کار کا تعلق ہے شاید مجھے کہنے کی ضرورت نہیں کہ اس کا دائرۂ فکر و عمل کبھی محدود نہیں رہا وہ مسائل کے متحدہ حل کا قائل ہے اُس نے بار بار اس حقیقت کو دہرایا ہے کہ ہماری تہذیب ایک ہے اور ماضی کے اثرات سے آزاد ہو کر ہماری زندگی کی طرح نئی ہے اسی نئی تہذیب کو ہمیں سنوارنا اور نکھارنا چاہئے۔

چنانچہ ہم اب بھی جداگانہ ہندو مسلم تہذیب کے نام پر ہر اُس تہذیب سوز تحریک کے خلاف آواز بلند کریں گے جس کے ذریعہ ہندو مسلمانوں کے تہذیبی رشتوں کو توڑنے کی کوشش کی جائے گی۔ ہم تہذیب و تمدن اور زبان و ادب کی تقسیم کی ہر ممکن مخالفت کریں گے اور اردو ہندی کے ادیبوں کو ایک جھنڈے کے نیچے جمع ہونے کی دعوت دینگے تاکہ سب مل کر اپنے مشترک سرمایہ کی حفاظت کر سکیں۔

ریکو: ماہنامہ ایشیا فروری ۱۹۴۹ء

ہم جانتے ہیں کہ ہماری راہ کٹھن ہے اور ۱۹۴۵ء
کے مقابلے میں ۱۹۴۹ء میں ہمارے فرائض بہت کچھ بڑھ
گئے ہیں ان اہم فرائض سے عہدہ برآ ہونے کے متعلق وعدے
اور دعوے کرنا آسان بات نہیں۔ ہم صرف اپنی ہمت کا اظہار
کر سکتے ہیں اور جو کچھ کرنا چاہتے ہیں اس کے لئے شاید اعلان
کی ضرورت نہیں۔ ہماری راہ صاف اور پُر امید ہے ہم
راہ کے پیچ و خم اور ہمت شکن پست و بلند کو کسی نہ
کسی طرح عبور کریں گے اور اپنی منزل پر پہنچ کر دم لیں گے۔

ہم محسوس کرتے ہیں کہ اگر اس وقت بھی صحیح طور پر عوام
میں صحیح ذہنیت پیدا نہیں کی گئی تو نہ ہم آزادی کی حفاظت
کر سکیں گے اور نہ ملک ترقی کر سکے گا۔ کیونکہ اگر محض سیاسی
انقلاب ذہنیت میں تبدیلی پیدا کر سکتا تو ملک میں ہرگز وہ
وہ خونی کھیل نہ کھیلا جاتا جو دھڑلے سے کھیلا گیا۔ اس لئے
جب تک ادب کے ذریعہ عوام میں اتحاد، تعمیر، ترقی اور خیر سگالی
کے جذبات پیدا نہیں کئے جائیں گے۔ ملک خطروں سے محفوظ نہیں
ہو سکتا۔ تعمیر اور تحفظ کے لئے ہمیں فرقہ پرست، موقع باز،
اور تمام انحطاط پسند طاقتوں کے خلاف جد و جہد کرنی ہے
اور اس کے لئے آپ کا تعاون نہایت ضروری ہے۔

ہمیں ایشیا کے ناظرین سے توقع ہے کہ وہ بے حد مفید
مشورے دیں گے۔ اپنی امیدوں اور توقعات سے آگاہ
کریں گے اور ہمارے کاموں پر تنقید کریں گے۔ تاکہ ہم ان
خامیوں کو معلوم کر سکیں اور صحت کے ساتھ ان کی توقعات
کو پورا کریں۔

ایشیا کے پہلے ہی نمبر سے آپ کو اندازہ ہو گا کہ اسے
ملک کے تمام نئے اور پرانے بزرگ اور نوجوان معتدل
اور انتہا پسند، قدیم الخیال اور ترقی پسند شعراء ادیبوں
اور انشا پردازوں کی والہانہ تائید و حمایت حاصل ہے یہ
ادیب ایک آواز، ایک نغمہ بن کر مایوس اور مردہ دلوں میں
زندگی کی نئی جوت جگا رہے ہیں۔

ایشیا کی بزم ادب، مذہب نسل اور زبان کی پست و
نامبارک قیدوں سے آزاد ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ ہندو
مسلمان سکھ اور اردو ہندی کے لکھنے والے پہلو بہ پہلو
اس میں شریک ہیں۔ اور اپنے اشتراکِ فن سے اس کی رونق
کو چار چاند لگا رہے ہیں۔

ہرچند کہ مسائل کے متعلق ایشیا کی ایک طے
شدہ حکمت عملی اور بنی بنائی راہ ہے جس میں تخریب اور
رجعت کی کوئی گنجائش نہیں۔ لیکن جس طرح وہ خود اپنے
لئے اظہار و بیان کی آزادی چاہتا ہے اسی طرح ہر مکتب
خیال کے ادیبوں اور شاعروں کے حق کو تسلیم کرتا ہے۔ اس کے
دروازے سب کے لئے کھلے رہیں گے۔ یعنی جو ہماری
رائے سے متفق نہیں انہیں بھی کامل آزادی تحریر ہوگی لیکن
ہم اپنے بنیادی مقاصد کی بہرحال حفاظت کریں گے اور اس
تضاد سے ایشیا کو بچائیں گے جو تخریب و انتشار کا باعث
بن سکتا ہے۔

ایشیا کا پہلا شمارہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ یہ آپ کا
اپنا پرچہ ہے جس سے ماضی کی خوبصورت یادیں وابستہ ہیں
گو یہ مضبوط بنیادوں پر جاری کیا گیا ہے لیکن ہماری
طرح اس کی زندگی اور ترقی کی ذمہ داری آپ پر بھی ہے
اگر آپ نے تعاون کیا تو منزل ہم سے کچھ زیادہ دور نہیں۔

آخر میں ہم ان ادباء اور قائدین کا شکریہ ادا کرتے ہیں جنہوں نے
ایشیا کی نئی زندگی کا خیر مقدم کیا۔ [illegible]
انڈین پی۔ ای۔ این۔ محترمہ عصمت [illegible]
اور آنریبل مسٹر بی جی کھیر وزیر اعظم [illegible] راج سنگھ [illegible]
مسٹر [illegible] آف بمبئی [illegible]
کرشن چندر، خواجہ احمد عباس، پنڈت سندر لال جی، شیخ عبداللہ [illegible]
جموں و کشمیر، رامانند صاحب ساگر۔ آنریبل ڈاکٹر سمپورنانند وزیر تعلیم
حکومت یو۔ پی۔ [illegible]
[illegible] وزیر اعظم بنگال [illegible] ممبر پبلک سروس
کمیشن یو۔ پی۔ گورنمنٹ، [illegible] راجندر [illegible]
ایس کے مشن ممبر کانگریس ورکنگ کمیٹی [illegible]
سید ممتاز حسین ایم۔ اے۔ ہز ایکسیلنسی [illegible] گورنر [illegible] نواب
محمد اسمٰعیل خان صاحب رکن دستور ساز اسمبلی ہند [illegible]
آنریبل نثار احمد خان شروانی وزیر [illegible] یو۔ پی۔ گورنمنٹ۔ ڈاکٹر
سچدانند سنہا وائس چانسلر پٹنہ یونیورسٹی مسٹر یوسف مہر علی سوشلسٹ لیڈر،
پروفیسر رشید احمد صدیقی اور آنریبل حافظ محمد ابراہیم [illegible] وزیر مواصلات حکومت
یو۔ پی۔ کا ان بزرگوں اور ساتھیوں کے پیغامات میں مقصد کے مختلف پہلوؤں [illegible]

کی طرف ہدایت ہے۔ یہ ذمہ داری کی ایک اہم دستاویز ہیں۔ جس کے ایک ایک لفظ میں ہم سے بڑی دور رس امیدیں قائم کی گئی ہیں ہم ان امیدوں کو پورا کرنے کی ہر ممکن کوشش کریں گے۔

ادب کی قدروں پر تقسیم کا اثر

تقسیم سے قبل اردو ادب جن راہوں سے گذرا وہ جد و جہد کی ایسی راہیں تھیں جن میں سینکڑوں پگڈنڈیاں آکر ملتی تھیں۔ ان میں ماضی سے پھوٹنے والے راستے بھی تھے اور حال سے نکلے ہوئے نئے راستے بھی۔ ان راستوں پر مختلف تصورات اور متضاد خیالات کاندھے سے کاندھا ملائے ایک بڑی شاہراہ کی طرف چلتے رہے۔ یہ شاہراہ برطانوی غلامی سے آزادی حاصل کرنے کی شاہراہ تھی۔ جو فرقہ پرستی اور رجعت پسندی کے حملوں سے محفوظ نہ تھی۔

لیکن اردو ادب نے اپنی نوبہ نو تخلیقات سے ان دونوں کے حملوں کا مردانہ وار مقابلہ کیا، اس مقابلے سے اس میں نئی توانائی پیدا ہوتی چلی گئی۔ جیسے جیسے قومی تحریک میں عوامی تصور ترقی کرتا گیا۔ ادب کے موضوع اور مقصد بھی نکھرتے گئے یہاں تک کہ ادب میں وہ گہرائی پیدا ہوگئی جو نئے سماجی شعور کے تقاضوں کو گرفت میں لا سکی۔ انداز فکر میں ایک عمق، جرأت اور حکیمانہ انداز جھلکنے لگا۔ بعض گوشوں میں تو ادب کی نئی تحریک قومی تحریک سے آگے بڑھ گئی تاہم یہ نظریات اور عمل میں کوئی قطعی ربط پیدا کرنے کا عہد نہیں تھا۔ بہت کچھ بے ربطی موجود رہی۔ یہاں تک کہ ملک تقسیم ہوگیا۔ اور یہ بے ربطی نقطۂ عروج پر پہنچ گئی۔

تقسیم نے جہاں اور چیزوں کو تقسیم کیا ادب اور اس کی قدروں کو بھی الٹ پلٹ کر دیا۔ ہندوستانی وطنیت کا تصور کسی قدر تو انا تصور تھا وہ پارہ پارہ ہوکر رہ گئی۔ پاکستانی اور ہندوستانی قومیت میں تبدیل ہوگیا دو قومیت اور دو وطن بن جانے کا یہ ایک لازمی نتیجہ تھا جس نے ادیب کی مروجہ قدروں کو بھی ہلا دیا۔ جن کی گرفت اپنے فکر و عمل پر مضبوط تھی وہ اس تبدیلی کو برداشت کر گئے۔ لیکن جن کی فکر خام تھی وہ فرقہ پرستی اور تعصبات کی رَو میں بہہ گئے۔ ان میں سے کئی ایسے تھے جنہیں وقت اور مصلحت نے ترقی پسندی کی "رعایتی سندیں" دلوا دی تھیں لیکن اب یہی ان ہاتھوں کو کاٹنے کے لئے بڑھ رہے ہیں جن ہاتھوں نے انہیں سندیں عطا کی تھیں۔

لیکن ان لوگوں کو یہ فراموش نہ کرنا چاہئے کہ تقسیم ہوکر دونوں ملکوں میں زندگی "جامد" نہیں ہوگئی ہے۔ اگر زمین ہے تو اس کے سینے سے نئے درخت ضرور پھوٹیں گے اور ان درختوں کی شاخوں میں کبھی پھل پھول ضرور آئیں گے۔ اگر جدید نظام کے خول سے نئی روح ابھرتی ہے اور ضرور ابھرے گی تو اس وقت زندگی و ترقی سے فرار کرنے والے یہ ادیب کہاں پناہ لیں گے۔؟

تقسیم نے ایک خاندان کے افراد کو دو سلطنتوں میں ضرور بانٹ دیا ہے ہر دل ضرور زخمی ہے اور زخموں کا انجام اندمال کے سوا کچھ نہیں ہے لیکن آنکھیں محبت کے آنسوؤں سے خالی نہیں اور جب تک انسان میں انسانیت کی پیاس موجود ہے خالی نہیں ہو سکتیں۔

ان ادیبوں اور شاعروں کو جنکے ادب میں فرقہ پرستی، رجعت پسندی اور مذہبی عصبیت کا زہر جھلک رہا ہے یہ سوچنا چاہئے کہ ادب بدلتی ہوئی سیاسیات کا غلام نہیں ہوتا۔ ادب کی آفاقیت بھی اس کی ایک اہم قدر ہے اور اسے بہر حال ادب میں بھی باقی رہنا چاہئے۔

اب دونوں نوآبادیات میں جس اتحاد اور خیرسگالی کے جذبات ترقی پا رہے ہیں اور نزاعی مسائل کو مل بیٹھکر حل کرنیکی ذہنیت پیدا ہو چلی ہے یہ ہندو پاکستان کے لئے نہایت مبارک آثار ہیں۔ اب ادیبوں کا فرض ہے کہ وہ عوام میں اتحاد و انسانیت کے جذبات پیدا کرنیکی ذمہ داری کا احساس کریں۔ اور اتحاد و خیرسگالی کے نئے رشتوں کو مضبوط کریں۔

اور انہی کا نہیں اردو ہندی دونوں زبانوں کے ادیبوں کا فرض ہے کہ رجعت پسندی کو ہندو پاکستان میں بیخ و بن سے اکھیڑ پھینکیں، یہ رجعت پسندی اور غلط مذہبیت لاکھوں بے گناہ انسانوں کی تباہی و بربادی اور قتل و غارت کا سبب بن چکی ہے۔ اسکی بنیادوں پر اگر مستقبل کی تعمیر کی گئی تو وہ بے بنیاد ہوگی اور ماضی سے زیادہ خوفناک نتائج پیدا کرے گی۔

آج جب ہر طرف ذہنی انتشار ہے، ہزاروں برس کی تہذیبی روایات الٹ پلٹ ہو رہی ہیں ادب کی نئی قدریں خطرہ میں ہیں۔ ہمیں آگے بڑھ کر انکی حفاظت کرنا ہے اور اس طریقۂ فکر کو ختم کر دینا ہے جو دو سلطنتوں کی علیحدہ علیحدہ سیاسی خودمختاری سے پیدا کیا ہے اور جسے رجعت پسند طاقتیں پھیلانا چاہتی ہیں یہ طریقۂ فکر کہ سیاسی خودمختاری کی بنیاد پر ہر تہذیبی علیحدگی اختیار کر لی جائے ان سب رشتوں کو بھی توڑ دے گا جو تقسیم کے بعد بھی ایک دوسرے کو ملاتے ہیں۔ اگر ایسا ہوا تو ہم ایک دوسرے کے لئے بالکل اجنبی ہو جائینگے اور اس سے بڑی بدبختی اور کوئی نہیں ہوگی۔

ذکیہ سلطانہ
ساغر نظامی

ماہنامہ ایشیا فروری سنہ ۱۹۴۹ء۔

ڈاکٹر تیج بہادر سپرو

آزاد ہند کے آسمان پر ہزاروں نئے ستارے جگمگائینگے لیکن زندگی کے افق سے کبھی یہ ستارہ طلوع نہ ہوگا جو مشترک تمدن کا ستارہ تھا متحدہ تہذیب کا ستارہ تھا اور متحدہ قومیت کے عرش کی قندیل تھا۔!

سر تیج بہادر سپرو کی مسلسل علالت بجائے خود ہندستان کا مستقل نقصان تھی لیکن ان کی موت تو ایک ایسا نقصان ہے جس کی تلافی کوئی آنے والا زمانہ نہ کر سکے گا۔ ان کی ذات متحدہ قومیت، ملی جلی تہذیب اور ہندو مسلم اتحاد کا ایک آدرش تھی؛ وہ قدیم تہذیب و اخلاق اور جدید تمدن و تعلیم کا ایک شاندار مظہر تھے۔ ان کی ہستی قانون و سیاست ادب و صحافت اور علم و عمل کا ایک پاکیزہ امتزاج تھی، وہ ایک جامع الصفات شخصیت تھے اور ان کی سب سے نمایاں صفت اپنی ایک رنگی پر ان کا یقین تھا ان کے دماغ و روح کے درمیان ایسی کوئی خلا موجود نہ تھی جہاں زندگی کے کسی مسئلے کے متعلق شک اور تذبذب نے اپنا آشیانہ بنایا ہو۔

روح سے لے کر دماغ تک اور مذہب سے لے کر سیاست تک وہ ایک بالغ نظر، آزاد خیال مفکر تھے۔ جن کے اندازِ فکر میں کبھی دینی، سیاسی یا کلچرل عصبیت کا شائبہ تک محسوس نہیں ہوا۔ مادی ترقی کی معراج پر پہنچنے کے بعد وہ تہذیبی رجعت کے دام میں نہیں پھنسے وہ ماضی کی کال کوٹھری سے دور رہے اور حال کے ساتھ بڑھتے گئے۔ بالآخر اس مرکز پر قائم ہو گئے کہ ہزاروں سال میں ہندو مسلمانوں کے رضاکانہ میل جول سے جو کلچر، زبان اور زندگی پیدا ہوئی ہے وہ زندگی ہندوستانی قومیت کا ایک پورا نظام اپنے اندر مکمل کر چکی ہے۔ یہی نظام ہماری موجودہ نسلوں کے لئے ایک آدرشی نظام ہے۔ یہی ایک آئیڈیل تہذیب ہے جسے ہم اختیار کر چکے ہیں اور جو خود ہم میں بس چکی ہے۔!؟

سر سپرو کی صحبت میں یقین ہوتا تھا کہ ہم ایسے ملک کے باشندے ہیں جہاں صرف ایک قوم بستی ہے۔ جہاں ہندو مسلمانوں میں کوئی دوری نہیں ہے۔ جہاں انسانیت کے سوا کسی دوسرے مذہب کی حکومت نہیں ہے۔

وہ مجسم آدرش تھے، ایک اچھے ہندو کا، ایک اچھے مسلمان کا، ایک اچھے ہندوستانی کا اور ایک اچھے انسان کا ——— !؟ حیف وہ اچھا انسان، اس وقت ہم سے جدا ہو گیا۔ جب ہم سب کو اس کی سخت ضرورت تھی۔ سپرو کی موت ہند کے دل میں ایک گہرا زخم ہے جو آسانی سے نہیں بھرے گا۔ یہ ایک ہی زخم ہوتا تو شاید بھر بھی جاتا لیکن یہ احساس کہ نئے بننے والے سماج میں شاید اب کوئی دوسرا سپرو پیدا نہیں ہو سکے گا۔ بجائے خود ایک زخم ہے اور پہلے زخم سے کہیں زیادہ گہرا ہے؛

ڈاکٹر تیج بہادر سپرو فارسی اور اردو کے ممتاز عالم تھے تاریخ اردو کی بقا و ترقی سے متعلق ان کی مخلصانہ کوششوں کو کبھی فراموش نہ کر سکے گی۔

ہندی اردو کے سلسلے میں انھوں نے پوری رواداری اور وسیع القلبی سے مسائل کو حل کرنے اور دوسروں سے حل کرانے کی کوشش کی۔ ان کی ادب نوازی، اور اردو شاعری سے ان کا خلقی ذوق اردو کے تمام، قدیم جدید، نوجوان اور سن رسیدہ ادیب و شعراء کو ان کی ذات سے وابستہ رکھتا تھا۔ اور وہ بھی صحیح طور پر ان کے قدر شناس تھے، باوجود اختلاف خیال کے وہ اس عہد کے انقلابی شعراء

ماہنامۂ ایشیا فروری ۱۹۴۹ء

سے بھی اتنی ہی گہری دوستی رکھتے اور ان کی قدر و منزلت کرتے تھے جس قدر کہ وہ لکھنؤ اسکول کے شعراء کی عزت کرتے تھے۔ .... ان کی روحانی نفاست نے انہیں ہمیشہ زندگی کی بد ذوقیوں اور سیاست کی پستیوں سے محفوظ رکھا۔

ڈاکٹر سر تیج بہادر سپرو ایک ممتاز کشمیری خاندان کے فرد تھے۔ ان کے جد امجد پنڈت رادھا کشن سپرو کشمیر میں ڈپٹی کلکٹر کے عہدہ پر فائز تھے اور کشمیر کے معززین میں ان کا شمار ہوتا تھا۔

وہ ۱۸۷۵ء میں پیدا ہوئے ۱۴ سال کی عمر میں متھرا سے انٹرنس پاس کیا اور آگرہ کالج میں داخل ہوئے جہاں سے انہوں نے بی۔ اے اور ایم۔ اے کی ڈگریاں خصوصیت و سابقت کے ساتھ حاصل کیں۔ ۱۹۰۲ء میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی اور اس طرح ان کی شاندار علمی زندگی اپنے نقطۂ عروج پر پہنچی۔

قانونی زندگی کی ترقی کے ساتھ ساتھ وہ ملک کی عام سماجی و سیاسی تحریکات میں نمایاں شہرت حاصل کرتے گئے ۱۹۰۶ء میں وہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے ممبر بنے ۱۹۱۳ء میں یو۔ پی کی لیجسلیٹو کونسل کے رکن نامزد کئے گئے اور ۱۹۱۶ء سے ۱۹۲۰ء تک وہ امپیریل لیجسلیٹو کونسل کے رکن رہے۔ ۱۹۱۸ء میں وہ یو۔ پی کی لبرل لیگ کے صدر ہوئے ۱۹۲۰ء میں گورنمنٹ آف انڈیا میں قانون کے ممبر مقرر کئے گئے۔ ۱۹۲۳ء میں امپیریل کانفرنس کے رکن کی حیثیت میں ان کی صلاحیت و تدبر کو سراہا گیا۔

تیج بہادر سپرو لبرل عقیدہ رکھنے والے سیاست دانوں میں ایک نمایاں حیثیت کے مالک تھے۔ ظاہر ہے کہ وہ انتہا پسند اور کانگریسی نہیں تھے۔ لیکن کلچرل مسائل اور ایک متحدہ قومیت کے ترکیبی عناصر کے متعلق انتہا پسندوں سے زیادہ صاف مضبوط اور مثبت نقطۂ نگاہ رکھتے تھے بے شک وہ انقلابی نہیں تھے۔ لیکن وہ ایک صلح جو اور زبردست محب وطن ضرور تھے۔ خواہ اس حقیقت کو انقلابی ذہن تسلیم نہ کرے لیکن یہ ایک بین حقیقت ہے کہ بالآخر انتہا پسند قوم پرستوں کو بھی اپنی بلندیوں سے سیاست کی اسی سطح پر آکر غلامی کا سدباب کرنا پڑا جو معتدلین کی سطح تھی۔

بہر حال وطن کی تعمیر میں تیج بہادر سپرو کی تعمیری کوششوں کو قومی سیاست کی تاریخ میں ضرور جگہ دی جائے گی۔ ۱۹۳۰ء میں سپرو جیکر مشن نے حکومت اور کانگریس کے مابین ایک گول میز کانفرنس کے لئے سمجھوتہ کی بنیاد رکھی۔ اور ڈاکٹر سپرو نے ذمہ دار حکومت کے مطالبہ کو منوانے کے لئے متقابل قوتوں کو ایک نقطے پر متحد کرنے کی جان توڑ کوشش کی۔ یہ انہیں کی اخلاقی کشش اور قوت ارادی کا اعجاز تھا کہ اگست ۱۹۳۱ء میں ان کی دعوت پر مہاتما جی گول میز کانفرنس میں شریک ہوئے۔

۱۹۳۴ء میں وہ پریوی کونسلر مقرر ہوئے۔ ۱۹۴۳ء میں ۶ ہندوستانی لیڈروں نے کانگریسی رہنماؤں کے خلاف لگائے ہوئے الزامات کے خلاف ایک بیان دیا جس میں انگریزی حکومت سے آزاد تحقیقات اور غیر جانبدارانہ ثالث مقرر کرنے اور رہنماؤں کو رہا کرنے کا مطالبہ کیا۔ تاریکی اور مایوسی کے اس ہمت شکن عہد میں جن ۶ رہنماؤں نے ہندوستان کے سیاسی تعطل کو ختم کرانے کے لئے قدم اٹھایا ان رہنماؤں کے رہبر تیج بہادر سپرو ہی تھے۔

سیاسی میدان میں ان کی آخری جھلک کیبنٹ مشن کی آمد کے موقع پر دکھائی دی، اس کے بعد ان پر فالج کا حملہ ہوا اور وہ مفلوج ہو کر رہ گئے۔

پیغامات میں ان کا آخری خط پڑھ کر دل خون کے آنسو روتا ہے۔ عین اس وقت جب گہری تاریکی میں اس چراغ کی ضرورت تھی موت کے بے رحم جھونکوں نے اسے بجھا دیا۔ لیکن جوت ہمیشہ باقی رہے گی۔ ان کی زندگی ایک آدرش تھی ایک نمونہ تھی۔ جو ابد تک ہندوستانیت اور انسانیت کی جوت جگاتی رہے گی۔

ادارہ

پیغامات

آنریبل مسٹر بی جی کھیر وزیر اعظم بمبئی

کیمپ جے پور

۱۶ر دسمبر ۴۸ء

ہندوستان کی ذہنی اور کلچرل ترقی کے لئے ہمارے ذہین طبقہ کی لگاتار بے غرض کوشش بہت ضروری ہے، گذشتہ دور میں جب کہ ہم غیر ملکی اقتدار سے نجات حاصل کرنے کے لئے مصروف پیکار تھے قوم کی تمام کوشش اور توانائی سیاسی سرگرمی کی خاطر وقف تھی، حتیٰ کہ ہماری کلچرل سرگرمیوں میں سیاسی تنگ نظری کار فرما رہی، اس لئے کہ ہم ایسی کسی چیز کو قبول کرنے پر آمادہ نہ تھے جو ہمارے سیاسی مشن کی کامیابی میں براہ راست ممد نہ تھی، اب چونکہ سیاسی کشیدگی آزادی کی زیادہ خوش گوار اور کھلی فضا میں ختم ہو چکی ہے، ذہنی اور کلچرل سرگرمیوں میں ترقی کا بہت امکان ہے۔ ہمارے مستقبل کے لئے یہ ابتدا مبارک ہے کہ کلچرل نشاۃ الثانیہ کا مقصد پیش نظر رکھ کر بعض ادارے معماری آزادی کے اوائل ہی سے بڑے صبر آزما کام کے منصوبوں کو لے کر پیش قدمی کر رہے ہیں۔ ادبی مرکز کا ایشیا بھی اسی قسم کی ایک کوشش ہے۔ میں اس کا خیر مقدم کرتا ہوں، بالخصوص اس لئے کہ اردو ہندی اور انگریزی کے توسط سے کام لیا جائے گا اور اس طرح ہمارے تمدن میں تین گراں قدر دھارے سموئے جائیں گے۔ میں اس کی کامیابی کی آرزو کرتا ہوں،

(بی۔ جی۔ کھیر)

ہز ایکسیلنسی کنور سر مہاراج سنگھ گورنر آف بمبئی

گورنر ہاؤس بمبئی

۲۲ دسمبر ۱۹۴۸ء

ڈیر مسٹر نظامی!

مادام صوفیہ واڈیا۔ بانی انڈین پی۔ ای۔ این

۲۰ر دسمبر ۴۸ء

عزیز دوست!

آپ کے ۵ ار تاریخ کے خط کا شکریہ۔ خط سے زیادہ خوشی تو یوں ہوئی کہ میں خود آپ کے مسکن کا پتہ چلانے کی کوشش کر رہی تھی۔ پچھلی مرتبہ جب سے میں نے آپ کا کلام سنا ہے۔ تب سے کافی مدت گزر چکی ہے۔

مجھے سچ مچ ادبی مرکز اور "ایشیا" کی نئی زندگی کا حال سن کر بہت خوشی ہوئی۔ ایشیا نے پچھلے چند سالوں تک ہندوستان کی کلچرل اور ذہنی زندگی میں اپنا حق ادا کیا ہے اور آزاد ہندوستان میں ادبی مرکز اور ایشیا کے تازہ علمی و ادبی اضافہ کی حیثیت ایک اثاثہ کی ہوگی میں اپنی نہایت مخلصانہ اور نیک آرزوئیں ان دونوں اداروں کے لئے بھیج رہی ہوں کہ یہ قائم و جاری رہیں۔

آپ کی مخلص

صوفیہ واڈیا

محترمہ مسز عصمت چغتائی بی۔ اے

بہن ذکیہ۔

یہ سن کر کہ "ایشیا" پھر سے جاری ہو رہا ہے۔ مسرت ہوئی۔ اُمید ہے کہ اس کی صورت دیکھ کر بے اختیار کچھ لکھ دینے کو جی چاہے گا۔ نیز اُمید ہے کہ "ایشیا" بجائے گھنتی کے پرانے علم و ادب کے سہاروں کے نئے۔ لکھنے والوں کی رہنمائی اور ہمت افزائی کریگا زندگی نے جو یہ تازہ کروٹ لی ہے اس نے نہ جانے کتنے حساس لوں کو چونکا دیا ہوگا۔

خاکسار عصمت

9

ہز ایکسلنسی نے خواہش کی ہے کہ میں آپ کے ۱۸ تاریخ کے خط کا شکریہ ادا کروں۔ اور ذیل کا پیغام بھیجوں۔

"یہ ضرورت مسلمہ بن چکی ہے اور اب اس پر زیادہ زور نہیں دیا جا سکتا کہ ہم اپنے پرانے کلچر کے ورثہ کو محفوظ رکھیں اور اُسے مالا مال کریں آج دنیا کو جسے مادیت سے نقصان پہنچا رہا کلچر کے سہارے کی ضرورت ہے تاکہ وہ سربلند ہو سکے۔ میں ایشیا کی پوری پوری کامیابی کی آرزو کرتا ہوں۔ کیوں کہ میرے خیال میں یہ وہ جریدہ ہے جو اس نصب العین اور کلچرل اتحاد کے حصول کے لئے وقف ہے۔"

(ایل۔ ایم۔ ناڈ گرنی)

سر تیج بہادر سپرو بار ایٹ لا

۱۹ البرٹ روڈ الہ آباد
مورخہ ۱۵ دسمبر ۱۹۴۸ء

جناب بندہ۔ تسلیم و نیاز

میں تو ڈھائی سال سے مرض فالج میں مبتلا ہوں۔ ایک قدم بھی نہیں چل سکتا نہ کچھ کام ہاتھ سے کر سکتا ہوں۔ میں نے اپنے سیکرٹری سے کہہ دیا ہے وہ خط آپ کو میری جانب سے لکھ دیں گے۔

میں آپ کے رسالہ کی کامیابی دل و جان سے چاہتا ہوں۔ مگر میں خود کوئی کتاب یا اخبار نہیں پڑھ سکتا کیوں کہ اخبار یا کتاب اپنے ہاتھ میں پکڑنا میرے لئے غیر ممکن ہے۔ زیادہ نیاز

بندہ

تیج بہادر سپرو بقلم نوبت لعل سری واستوا سیکرٹری

ڈاکٹر سچدانند سنہا بار ایٹ لا
اولین صدر دستور ساز اسمبلی ہند

سنہا لائبریری روڈ۔ پوسٹ بکس ۴۲ جی پی او۔ پٹنہ
۱۵ دسمبر ۱۹۴۸ء

میرے پیارے نظامی صاحب

آپ کا گیارہ دسمبر کا خط انگریزی اور اردو دونوں میں مجھے ابھی ملا۔ میں نے آپ کے اور ماہنامہ کے مقاصد بڑی دلچسپی سے پڑھا اور میں اس کی

مسز کرشنا ہاتھی سنگھ

"ایشیا" کے لئے میری بہترین آرزوئیں قبول کیجئے۔

کرشنا ہاتھی سنگھ

شاعر انقلاب حضرت جوش ملیح آبادی

میرے واسطے خصوصیت کے ساتھ یہ ایک بہت بڑی خوش خبری ہے کہ حضرت ساغر (جنھیں میں ہرگز "نظامی" نہیں کہوں گا) "ایشیا" کو دوبارہ جاری، اور ایک دار الاشاعت کو قائم کر رہے ہیں۔

ساغر صاحب اس درجہ مشہور، اور اسی کے دوش بدوش اس قدر مقبول و محبوب شاعر ہیں کہ انھیں میرے یا کسی کے تعارف کی احتیاج نہیں لیکن اُن کی اس خاص صفت سے شاید لوگ زیادہ واقف نہیں کہ وہ ایک نہایت ضابطہ پسند، خوش سلیقہ اور بیدار مغز انسان بھی ہیں۔ اور اسی کے ساتھ ساتھ جن حضرات نے اُن کے مجموعۂ کلام "بادۂ مشرق" کا مطالعہ کیا ہوگا۔ وہ میرے اس دعوے کی تصدیق کریں گے کہ جہاں تک کتابوں کی طباعت و اشاعت، اور اُن کی زیبائش و آرائش کا تعلق ہے، ہندوستان کا کوئی صاحب مطبع اور کوئی ناشر اُن کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ "مار گزیدہ" اور "سگ گزیدہ" کے ساتھ ساتھ اس بدبخت ملک میں ادیبوں اور شاعروں کا ایک مظلوم طبقہ ہے۔ جسے "ناشر گزیدہ" کا خطاب دیا جا سکتا ہے۔ میں ان مظلوم ناشر گزیدگانِ ہند کو مژدہ ۔۔۔ سناتا ہوں کہ ادبی مرکز بمبئی میں ساغر صاحب کی زیر نگرانی "ہند پبلشرز" کے نام سے ایک دار الاشاعت قائم ہو رہا ہے۔ جس میں اُن کے تمام حقوق محفوظ رہیں گے۔ اور اُن کی دماغی پیداوار کی فراخ دلی و دیانت داری کے ساتھ داد دی اور قدر افزائی کی جائے گی وہ اسے اپنا ہی دار الاشاعت سمجھیں۔ اور اس سے مستقلاً وابستہ ہو جائیں۔

ساغر صاحب کی طرح "ایشیا" کے باب میں بھی کسی تعارف کی ضرورت نہیں ہے "ایشیا" میرٹھ سے جس آب و تاب کے ساتھ نکل چکا ہے، وہ سب کو معلوم ہے اور اسی پر قیاس کر کے سمجھ لینا چاہئے کہ وہ شائع ہوتے ہی تمام جرائد پر چھا جائے گا۔

جوش

کامیابی کی آرزو کرتا ہوں۔

میں بہت ممنون ہوں گا اگر آپ مجھے زحمت کر کے مختلف انگریزی اردو اور ہندی کی مطبوعات کی ایک فہرست بھیجیں۔ تاکہ میں اس کے بارے میں اپنی رائے قائم کر سکوں۔

میں آپ کے منصوبہ کی کامیابی کی آرزو کرتا ہوں

آپ کا مخلص

ایس۔ سنہا

مسٹر میکر نہاس میئر آف بمبئی

از بمبئی

۲۰ر دسمبر ۴۸ء

ڈیر مسٹر ساغر نظامی

آپ کا ۱۱ر تاریخ کا خط ملا۔ مجھے یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ آپ نے جنوری ۱۹۴۹ء سے ادبی مرکز کے تحت ماہنامہ "ایشیا" کی اشاعت کا ارادہ کیا ہے۔ ملک کے بدلے ہوئے حالات میں "ایشیا" کا مستقبل شاندار رہے گا۔ اس لئے کہ کلچرل اتحاد و ترقی اور کلچرل شائستگی جیسے نصب العین کے حصول کے بڑے مواقع ہیں۔ میں ماہنامہ کی پوری پوری کامیابی کی آرزو کرتا ہوں۔

آپ کا مخلص

میکر نہاس

میئر

مسٹر یوسف مہر علی سوشلسٹ لیڈر

فارجیٹ اسٹریٹ بمبئی ۲۶

۲۶ر دسمبر ۴۸ء

ڈیر ساغر نظامی صاحب

آپ کا خط ملا۔ اور مجھے یہ معلوم کر کے بڑی خوشی ہوئی کہ آپ "ایشیا" کو دوبارہ زندہ کر رہے ہیں۔ اس کوشش کے لئے بہت لوگ آپ کے ممنون ہوں گے کیوں کہ یہ بہت ہی اہم ہے کہ اردو اور ہندی پڑھنے والے دنیا کے سب سے بڑے براعظم کی زبردست بیداری سے واقف ہوں۔ ایشیا کی آبادی نصف دنیا کی آبادی کے برابر ہے

پروفیسر نجیب اشرف ندوی ایم۔ اے

آپ کے ایشیا اور ہمارے براعظم ایشیا کا حال یکساں رہا ہے، شاید یہ نام کی برکت یا اثر ہے، دوسری جنگ عظیم کے بعد ایشیا کی زندگی کا نیا دور شروع ہو رہا ہے اور اس مرتبہ مجھے یقین کامل ہے کہ وہ نہ صرف یورپ بلکہ ساری دنیا کی رہنمائی کرے گا۔ ان خوشگوار حالات میں آپ کے ایشیا کا بھی ایک نئی زندگی کے ساتھ منصۂ شہود پر جلوہ گر ہونے کا مژدہ خوشگوار تعلقات کی دنیا سامنے لا دیتا ہے، خدا کرے میرے یہ خواب شرمندۂ تعبیر ہوں۔ اس مرتبہ آپ نے جس جوش و انہماک سے اپنے کو اس کام کے لئے وقف کر رکھا ہے۔ کامیابی کی بڑی حد تک ضمانت ہے۔ اس لئے کہ ساغر وہیں کارآمد ہے اور اس وقت تک کارآمد ہے جب تک کہ وہ گردش میں ہو۔

آپ کا

نجیب اشرف ندوی

ملک راج آنند

مائی ڈیر ساغر صاحب

یہ پیغام آپ کے ماہنامہ کی عظیم ترین کامیابی کی آرزو کا حامل ہے۔ ہمارے ملک میں ماضی اور عصر حاضر دونوں کے ادبی اور کلچرل کام کا پھر سے محاسبہ کرنا اور اس کی قدریں معلوم کرنے کی سخت ضرورت ہے کیوں کہ اگر ہم بلند ترین آزمائشوں میں مسلسل طور پر چوکنا نہ رہیں گے۔ تو ہم نے اپنی نشاۃ الثانیہ میں جو کچھ حاصل کیا ہے۔ اس وقت کے معیار اتنے بلند نہ ہوں گے۔ جتنے کہ دوسری جگہ حاصل کئے جا چکے ہیں۔ میں یقین کرتا ہوں کہ آپ کی رہنمائی میں بہترین تخلیقی اور تنقیدی تحریریں اس رسالہ میں شائع ہوں گی۔

آپ کا مخلص

ملک راج آنند

اور اس میں اتنے قدرتی وسائل و ذخائر ہیں کہ خواب و خیال میں بھی نہیں آسکتے ہیں۔ اُس کے مختلف ملکوں میں سیاسی اور کلچرل بیداری کا ایک طوفان برپا ہے اور ہندوستان کو اس طوفان میں اپنا فرض انجام دینا ہے۔ میری یہ آرزو ہے کہ آپ کا ایشیا مظلوموں و محنت کشوں کی جدوجہد اور اُن کی اُمیدوں اور خوابوں کا ترجمان بنے۔

آپ کا مخلص

یوسف مہر علی

مسٹر ایس کے پاٹل ممبر آل انڈیا کانگریس کمیٹی

کانگریس ہاؤس بمبئی ۴

۳ر جنوری سنہ ۱۹۴۹ء

عزیز دوست!

مجھے آپ کا پچھلے ماہ کی ۲۸ تاریخ کا خط مل چکا ہے۔ حسب خواہش ایشیا کے لئے مختصر سا پیغام حاضر ہے

"ہندوستان کی آزادی حاصل ہوجانے کے بعد اوسط ہندوستانی کا نقطۂ نظر بدل جانا چاہئے اور یہ اس لئے کہ ہماری مشکل سے حاصل کی ہوئی آزادی مستحکم ہو۔ ہر اخبار کی یہ کوشش ہونی چاہیے کہ وہ اس سلسلے میں ہماری حکومت کی مدد کرے اور مجھے بھروسہ ہے کہ ایشیا بھی فرقہ وارانہ اتحاد، کلچرل بھائی چارہ، ذہنی ترقی اور قومی حکومت کے استحکام کے حق میں اپنا جائز حق ادا کرے گا اپنے ماہنامہ کی کامیابی کے لئے میری بہترین آرزوئیں قبول کیجئے۔

آپ کا مخلص

ایس۔ کے۔ پاٹل

مسٹر اے۔ اے۔ فیضی (رکن پبلک سروس کمیشن حکومت بمبئی)

"ایشیا ایک مدت تک سوتے رہنے کے بعد پھر سے بیدار ہو رہا ہے۔ جس کی بڑی خوشی ہے۔ ہندوستان کی موجودہ ذہنی پسماندگی کے دور میں ایسے رسائل کی بہت ضرورت ہے جو ہمارے ملک کے عوام کی اور خصوصاً مسلمانوں کی صحیح طریقہ پر رہنمائی کریں اور اُنھیں فرقہ وارانہ ذہنیت کے ادبار سے نکال کر عقل و اتحاد کا راستہ دکھلائیں۔ خدا کرے ایشیا کو اپنے مقاصد میں کامیابی

کرشن چندر (رکن ادارۂ نیا ادب بمبئی) —

۲ر جنوری ۱۹۴۹ء

پیارے بھائی ساغر

اس کی مجھے بے حد خوشی ہے کہ ایشیا دوبارہ شائع ہو رہا ہے، اور آپ کی ادارت میں۔ اب کے اسے آپ واقعی ایشیائی ادب کا ترجمان بنائیے۔ اس وقت پورے ایشیا میں عوام انقلاب کا دروازہ کھٹ کھٹا رہے ہیں، اس وقت اگر ہم ادیب لوگ سوئے رہے تو کوئی ہمیں اٹھائے گا نہیں۔ عوام سوئے ہوؤں کو پاؤں تلے روند کر آگے بڑھ جائینگے مجھے اُمید ہے کہ ایشیا بڑھتی ہوئی زندگی کا ساتھ دے گا۔ لاشوں کے ادب سے اس کا کوئی واسطہ نہ ہوگا۔

کرشن چندر

خواجہ احمد عباس (رکن ادارۂ نیا ادب بمبئی)

جس طرح دنیا کے اُفق پر ایشیا کا روشن ستارہ اُبھر رہا ہے اُسی طرح یقین ہے۔ ساغر صاحب کا "ایشیا" بھی آسمانِ صحافت پر چمکے گا۔

"ایشیا" کو دنیا کی ترقی پسند قوتوں کے ساتھ چلنا ہے۔ اور تمام ترقی پسندوں کو "ایشیا" کا ساتھ دینا ہے۔

احمد عباس

سیّد ممتاز حسین ایم۔ اے

ساغر نظامی صاحب نے ایک بار پھر ایشیا کی روح کو بیدار کرنے کی کوشش کی ہے۔ ایشیا جس آب و تاب اور نئے پیغام کے ساتھ میرٹھ کی پُرآشوب سرزمین سے نکالا گیا تھا وہی ایشیا آج پھر بمبئی سے نکالا جا رہا ہے۔ ساغر صاحب ایشیا کے ساتھ لازم و ملزوم ہیں اس دفعہ آپ ایشیا میں ایک نئی تبدیلی پائیں گے۔ اور یہ تبدیلی ایشیا کی زندگی کی تبدیلی کا نتیجہ ہے۔ آج پورا ایشیا اپنی آزادی کی آخری جنگ لڑ رہا ہے ہمارے ادیب اس کی روح کو ایک نئے پیغام حیات کے ساتھ مزین کر رہے ہیں۔ وہ پیغام زندگی کو لبیک کہنے اور تمام رجعت پسند طاقتوں کے خلاف جنگ کرنے کا پیغام ہے۔ میرا خیال ہے کہ ایشیا کا نیا پرچہ نہ صرف

حاصل ہو، اور موجودہ دور یہ تاریکی میں یک درخشاں ستارہ بن کر قوم و ملک کی رہبری کرے۔

آصف فیضی

نواب محمد اسمٰعیل خاں صاحب ممبر کانسٹی ٹیوٹ اسمبلی بمبئی

مجھے یہ معلوم ہو کر بڑی مسرت ہوئی کہ میرے نوجوان دوست ساغر نظامی صاحب نے ماہنامہ ایشیا کو دوبارہ جاری کرنے کا انتظام مکمل کر لیا ہے۔ ماہنامہ ایشیا ایک بلند پایہ ادبی رسالہ رہا ہے جس سے معلومات میں اضافہ ہوتا رہا اور اس ماہنامہ رسالہ کے متعلق یہ کہنا بھی ہرگز بے جا نہ ہوگا کہ یہ اردو ادب کا ایک معیاری رسالہ تھا۔ ارباب ذوق اس کے بند ہو جانے پر ایک خاص کمی محسوس کرتے تھے، ساغر نظامی صاحب مستحق مبارکباد ہیں کہ انھوں نے اپنی انتھک کوششوں سے اس کمی کو پورا کر دیا۔

میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ماہنامہ ایشیا کو خاطر خواہ طور پر کامیاب کرے۔ اور یہ رسالہ ادبی دنیا کے لئے مفید معلومات اور ادبی ذوق میں اضافہ کا باعث ہو۔

محمد اسمٰعیل خاں
ممبر کانسٹی ٹیوٹ اسمبلی ہند
۲۰ر دسمبر ۱۹۴۸ء

آنریبل نثار احمد خاں شروانی وزیر زراعت یوپی

۱۶ر دسمبر ۱۹۴۸ء

ماہنامہ "ایشیا" ایک عرصہ کے بعد پھر وجود میں آ رہا ہے یہ موقر جریدہ ساغر صاحب نظامی کی زیر نگرانی میرٹھ سے ماہ بماہ شائع ہو کر اعلیٰ ادب پیش کرتا تھا۔

میں ساغر صاحب سے ایک عرصہ سے واقف ہوں۔ کم عمری میں اُن کو شاعری کا شوق ہوا اور بہت جلد اپنے آپ کو اس نوجوان نے ادبی دنیا میں روشناس کرا لیا۔ آج ہندوستان کا ہر ادب نواز شخص اُن سے واقف ہے ان کی سیاسی نظمیں جو ان کے قوم پرورانہ جذبات کی آئینہ دار ہوتی ہیں۔ ملک کے طول و عرض میں خراج تحسین

انحطاط پسند طاقتوں کے خلاف جلال و جبروت کا مظہر ہو گا بلکہ نئی زندگی کی جمالی قدروں کا معمار بھی ہو گا

ممتاز حسین

راجندر سنگھ بیدی بی۔ اے

فیمس پکچرز لمیٹڈ۔ کیڈل روڈ
بمبئی

محترمی ساغر صاحب تسلیم

"ایشیا" کی تجدید کی متعلق سنا۔ بہت خوشی ہوئی۔ زبان کے مسئلہ میں جتنا جھگڑا ہے، اس کا سب سے بڑا حل یہی ہے کہ مروجہ زبان زیادہ سے زیادہ بولی جائے۔ اور نشر کی جائے۔

مجھے یقین ہے کہ "ایشیا" ایسا ماہنامہ اردو کے مستقبل کی بابت ہمارے سب شکوک دور کرے گا۔ میں حتی الوسع ہر قسم کے تعاون کا یقین دلاتا ہوں۔

نیاز مند
راجندر سنگھ بیدی
۵ر جنوری ۱۹۴۹ء

۱۳

رامانند ساگر بی۔ اے

"ایشیا" کے دوبارہ اجرا پر میری طرف سے مبارکباد قبول فرمائیے۔

خدا کرے کہ "ایشیا" موجودہ دور میں ایشیا کی آزادی کا علمبردار ثابت ہو۔ اور مستقبل میں اس کا محافظ۔

رامانند ساگر

سید شہاب الدین دسنوی

آزادیٔ ہند کے بعد بھی "ایشیا" میں حرکت پیدا نہ ہوتی تو تعجب ہوتا۔ اب "ایشیا" کے سامنے نئے زاویے اور نئے میدان ہیں۔ بادۂ اردو کے متوالے "ساغر" کی طرف آنکھ لگائے ہیں۔ ادبیات کے ایسے نچوڑ کی ضرورت ہے جو ہماری اخلاقی اور سماجی زندگی کے معیار

وصول کرچکی ہیں۔

ساغر صاحب ایک خوش الحان خوش گو شاعر کے علاوہ مشہور ادیب بھی ہیں۔ ان کی بیشتر تصانیف نے ہندوستان کے نوجوانوں کے دلوں میں آزادی کی ایک نئی روح پھونک دی۔

آج جب کہ ہندوستان آزاد ہے ہم لوگوں کو سب سے زیادہ ضرورت اس بات کی ہے کہ ملک کے سامنے ایک ایسا ترقی پسند و صحت مند ادب پیش کیا جائے، جو عوام میں اتحاد۔ ترقی۔ یگانگت و تعمیر کی روح پیدا کرے۔

مجھے امید ہے کہ "ایشیا" ساغر صاحب کی زیر نگرانی و ادارت ایسا ادب پیش کرے گا۔ ادبی دنیا میں یقیناً اس ماہنامہ کا خیر مقدم کیا جائے گا۔

میری دعا ہے کہ ساغر صاحب اپنے مقاصد میں کامیاب ہوں

نثار احمد شیروانی

پنڈت سندر لال جی (الہ آباد)

پیارے بھائی ساغر صاحب

آپ کا ۱۱ر دسمبر کا خط مجھے اب ملا۔ آپ اپنے ماہنامہ "ایشیا" کو پھر سے نکالنے جا رہے ہیں۔ مبارک!

میری دلی خواہش ہے کہ آپ اس ماہنامہ کے ذریعہ سب مذہب کے لوگوں، خاص کر اس ملک کے ہندو اور مسلمانوں کے دل ایک دوسرے کے زیادہ نزدیک لے آویں، فرقہ پرستی بلکہ فرقہ وارانہ نقطۂ نگاہ دماغوں سے ہٹے، ہم سب کے قدم ایک مشترکہ قومیت، مشترکہ کلچر اور مشترکہ سماجی زندگی کی طرف تیزی کے ساتھ بڑھیں میری یہ بھی خواہش ہے اور درخواست ہے کہ "ایشیا" کی زبان آسان بول چال کی اور ہندوستانی ہو۔ مثال کے طور پر ہندوستانی میں وکیل کی جمع وکلا نہیں وکیل یا وکیلوں ہونی چاہئے۔ ایسے ہی مقصد کی جمع مقاصد نہیں مقصد یا مقصدوں۔ اردو کو بھی اگر اس ملک میں زندہ رہنا ہے تو یہی شکل اختیار کرنی ہوگی یعنی ہندوستانی بننا ہوگا ہندی اور اردو کی الگ الگ جانبداریوں سے ہٹ کر ایک نئی چلی، پیاری قومی زبان کو روپ دینا اور بڑھانا ہی ہوگا۔

آپ کا بھائی

سندر لال

کو بدل سکے، بیمار دل و دماغ کی اصلاح کر سکے اور مرجھائی ہوئی روح میں بالیدگی پیدا کر سکے۔

مجھے امید ہے کہ "ایشیا" یہ خدمت انجام دے سکے گا

سید شہاب الدین دسنوی

بمبئی

۶ر جنوری ۱۹۴۹ء

اختر الایمان

رکن ادارۂ ماہنامہ "خیال" بمبئی

"ایشیا" اُن پرچوں میں سے ہے۔ جن پہ اردو کے ماہناموں کو ناز ہے۔ ساغر صاحب سمجھ رہے ہیں کہ وہ پرچہ نکال رہے ہیں میں سمجھ رہا ہوں کہ یعنی آگئے چلیں گے۔ دم لے کر دالی بات ہے۔

ایشیا نے پہلے بھی اردو کی خدمت کی ہے۔ آج بھی اس کی وہی نیت ہے۔ معیار کے بارے میں کچھ کہنا لاحاصل ہے۔

اختر الایمان

۷ر جنوری ۱۹۴۹ء

قاضی بدر الحسن بدر جلالی بی۔ اے

(علیگ)

برادر عزیز حضرت ساغر نظامی نے یہ خبر خوش عنایت فرمائی ہے کہ رسالۂ ایشیا اپنے نئے جنم اور نئے روپ میں پھر زیب نظر و فکر ہونے والا ہے۔ اگرچہ انتظار کی گھڑیاں ابھی ختم نہیں ہوئی ہیں اور آنکھیں دیدار کے لئے مضطرب ہیں۔ پھر بھی خبر نیک ہے جو مسرت قلبی ہوئی ہے۔ وہی اپنے عزیز بھائی کی نذر کرتا ہوں۔ ع

بریں مژدہ گر جاں فشانم رواست

ہم ہندیوں کی تمنائے سیاست کا ایک روشن اور دلفریب پہلو اتحادِ ایشیا کے حسین خوابوں کی واقعی تعبیر میں پنہاں ہے، اس لئے حضرت ساغر کے ایشیا کی نشاۃ ثانیہ اُن آرزوؤں کی تکمیل کا ایک عنوان معلوم ہوتا ہے جو اتحادِ ایشیا کی آفرینش سے وابستہ ہیں۔ ایشیا یقیناً ہمارے ذوق ادب کی ایک رنگین پناہ گاہ ثابت ہوگا: دریں عالمگیر

شیخ محمد عبداللہ وزیر اعظم حکومت جموں و کشمیر

محترمی ساغر صاحب

تسلیم۔ آپ کے دونوں خطوط ملے، یاد آوری کا بہت بہت شکریہ۔ آپ نے جس کام کا بیڑا اٹھایا ہے۔ موجودہ حالات میں وہ بہت ہی اہم ہے ہندوستان کے باشندوں میں صحیح ذہنی شعور پیدا کرنا وقت کا سب سے اہم تقاضا ہے۔ جسمانی غلامی سے ذہنی غلامی زیادہ مہلک ہوا کرتی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ہندوستان نے سال ہا سال کی انتھک کوششوں اور قربانیوں کے بعد جسمانی غلامی سے آزادی تو حاصل کر لی ہے۔ لیکن انگریزی سامراجی طاقت نے ہندوستان کو نہ صرف جسمانی طور پر غلام بنایا تھا بلکہ ہندوستانیوں کے ذہن کو بھی غلامی کے سانچے میں ڈھال دیا تھا۔ اور جب تک ہندوستانیوں کے سوچنے سمجھنے کے طریقے وہی رہیں گے۔ جو کہ ڈیڑھ سو سال کے عرصہ میں انگریزوں نے ان کو سکھلائے تھے تب تک یہ خیال کہ ہمارا دیش سامراجی غلامی سے آزاد ہو گیا ہے بہت بڑا دھوکا ہے۔ ہندوستانیوں کو یہ امر پورے طور پر ذہن نشین کر لینا چاہئے کہ جن کمزوریوں کی وجہ سے ہندوستان انگریزی سامراج کے چنگل میں پھنسا تھا اور جن کی وجہ سے ہندوستان کے دو ٹکڑے ہوگئے۔ جب تک وہ کمزوریاں موجود رہیں گی ہندوستان کی آزادی ہر وقت خطرے میں ہے۔ اس لئے وقت آگیا ہے کہ ہندوستان کے ادیب اس اہم فریضہ کی طرف اپنی ساری توجہ مرکوز کریں۔ کیونکہ ذہنی طور پر آزاد کرانا ایک ادیب ہی کا کام ہے۔ آپ نے اس فرض کو انجام دینے میں جو ابتداء کی ہے میں اس کے لئے آپ کو تہہ دل سے مبارکباد دیتا ہوں۔ اور آپ کی کامیابی کے لئے دعا کرتا ہوں۔

آپ کا مخلص

شیخ محمد عبداللہ

حسین شہید سہروردی

میں آپ کو مبارکباد دیتا ہوں کہ اردو ماہنامہ "ایشیا" کو اس مقصد سے زندہ کر رہے ہیں کہ اس سے بنی نوع انسان کی خدمت ہو سکے اور ہماری پُر آشوب زندگی کی گتھیاں سلجھ سکیں۔ لوگوں میں آپس کے اشتراک، بھائی چارہ اور رواداری کو ترقی دینا۔ ایک دوسرے کا لحاظ و احترام کرنا اور اس بات کو ترقی دینا کہ لوگ ایک دوسرے کو اچھی طرح سمجھ سکیں آج یہ چیزیں ایسی ہیں جن کے لئے کام کرنے کی ضرورت ہے اور میں آپ کی کوششوں میں ہر طرح کی کامیابی کی دعا کرتا ہوں

آپ کا مخلص

شہید سہروردی

قیادت کا سبق دے گا۔

"این دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد"

بدر جلالی

قاضی عبدالغفار مرادآبادی

ہماری بزم ادب میں "ایشیا" ایک ہمدم دیرینہ ہے جو پھر اس بزم میں واپس آرہا ہے اور ایسے وقت واپس آرہا ہے جبکہ اس کی بہت ضرورت تھی۔ تقسیم ہند نے وہ سب کچھ تقسیم کر ڈالا جو ہمیں عزیز تھا۔ ہماری شوریدہ سر سیاست نے۔ صرف ملک کو، خاندانوں کو اور دلوں کو ۔۔۔ تقسیم کر دیا بلکہ میں تو کہتا ہوں کہ ہندوستان کی انسانیت، کو تقسیم کر ڈالا اور ہماری بدبختی پر ایک ایسی مہر لگا دی جو سدا ہے ہماری سیاست کی رسوائی پر! اس بدبخت تقسیم نے ہماری ادبی محفلوں کو بھی اس قدر برہم کر دیا کہ "داماں باغباں و کف گلفروش" کی کوئی پرچھائیں بھی کہیں نظر نہیں آتی۔ اس محفل کو پھر از سر نو سنوارنا ہے اور اس ویرانے کو پھر آباد کرنا ہے۔ جس گوشہ میں بھی کوئی چراغ تہ داماں باقی ہو اسے جلد سے جلد منظر عام پر آنا چاہئے کیونکہ سیاست ملکوں اور قوموں کو تو تباہ کر سکتی ہے لیکن دلوں اور دماغوں کے آتش خانوں کو سرد نہیں کر سکتی۔

اردو ادب کے تمام حامیوں اور خادموں کی بہترین تمنائیں حضرت ساغر کے ساتھ ہیں۔ میرا پیام صرف اتنا ہی ہے۔ جو اقبال کے ایک مصرعہ میں سما جاتا ہے ؎

گلشن بہ گریبان کش اے بو بہ گلاب اندر!

محمد عبدالغفار

لکھنؤ ۱۴ر جنوری ۱۹۴۹ء

ڈاکٹر دوست محمد خاں

اگر آپ اب بھی میدان میں نہ آتے تو تاریخ آپ کے ادبی گناہ کو کبھی معاف نہ کرتی۔ میں دل و جان سے "ایشیا" کا خیر مقدم کرتا ہوں۔ اور اس کی کامیابی کی ہر ممکن کوشش کروں گا۔

دوست محمد

۱۸

۱۵

آنریبل ڈاکٹر سمپورنانند وزیر تعلیم و محنت

حکومت یو۔ پی

لکھنؤ ۲۲ر جنوری ۱۹۴۹ء

یہ ضروری ہے کہ ہندوستان کے کلچرل اتحاد پر وہ لوگ زور دیں جن کی رائے اس موضوع پر مستند ہے۔ ہمارا کلچرل ورثہ بہت شاندار ہے جس میں بیسیوں سوتے مختلف منبعوں سے نکل کر اس میں سموئے گئے ہیں اور جن سے وہ ورثہ سرسبز و نہال ہوا ہے۔ لیکن اب صورت یہ ہے کہ اس نے ایک مستحکم دھارے کی شکل اختیار کر لی ہے جس کے حیات بخش فرائض صرف ہندوستان تک ہی محدود نہیں ہیں، میری آرزو ہے کہ "ایشیا" کو اپنی کوششوں میں کامیابی حاصل ہو۔

سمپورنانند

مولانا حفظ الرحمٰن

ماہنامہ ایشیا ہندوستان ممتاز اور مؤقر جرائد میں ایک ماہنامہ ہے۔

عمدہ اور مفید ترین مضامین کی اشاعت، بہترین ترتیب اور طباعت کے اعتبار سے اس ماہنامہ کو اردو کے اخبارات میں نمایاں جگہ حاصل ہے۔

میں نے ایشیا کے بعض پرچے جستہ جستہ دیکھے ہیں اس میں شک نہیں کہ ایشیا نے اپنی زندگی میں جو بلند پایہ علمی، اخلاقی اور ادبی خدمات انجام دی ہیں وہ ہمیشہ علم و ادب کی دنیا میں قدر کی نگاہ سے دیکھی جائیں گی۔

میری آرزو ہے کہ ملک کے علمی حلقے ایشیا کی قدر پہچانیں اور آئندہ ماضی سے زیادہ مستقبل کی کامیابیاں نصیب ہوں۔

خادم ملک و ملت

محمد حفظ الرحمٰن

۸ر جنوری ۱۹۴۹ء

مخمور جالندھری

ساغر بھائی

آداب عرض۔ ایشیا کا نیا جنم مبارک! یہ جان کر خوشی ہوئی کہ ایشیا کو اب مضبوط بنیادوں پر کھڑا کیا جا رہا ہے اور آپ نے ایشیا کی جس پالیسی کا خط میں اظہار کیا ہے امید کہ آپ اسے برقرار رکھنے کی انتہائی کوشش کریں گے۔

آپکا

مخمور جالندھری

ادیب لکھنوی بی۔ اے

بلدری (ضلع مرادآباد)

ارمان تھے جو دل میں ان کی تائید ہوئی
زندہ پھر اہل دل کی امید ہوئی
پھر علم و ادب کی ہوگی سچی خدمت
صد شکر کہ "ایشیا" کی تجدید ہوئی

پروفیسر رشید احمد صدیقی

یونیورسٹی علی گڑھ۔ ۱۲ر جنوری ۱۹۴۹ء

ساغر صاحب محترم۔ آداب

گرامی نامہ صادر ہوا۔ یادفرمائی اور عزت افزائی کا شکرگزار ہوں۔ آپ نے خوب کیا کہ ایشیا کے احیا کا ارادہ کر لیا۔ ایشیا جب نکلتا تھا تو آپ کے لطف و کرم سے اس کے مطالعہ کا موقع ملتا تھا۔ میں اس کا جب بھی معترف تھا اور مجھے یقین ہے کہ آپ کی ادارت میں وہ اب بھی ...... اور مقبول رہے گا۔

کل میں لکھنؤ میں تھا، ایک دوست کے یہاں شام کی چائے پر بہت سے نامور اہل قلم مل گئے۔ آپ کے ایشیا کا بھی تذکرہ آگیا سب نے بڑی مسرت کا اظہار کیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ ایشیا کے حق میں یہ بڑی مبارک بات ہے۔ میرے نہ لکھنے پر میرے سب دوست مجھ سے خفا ہیں۔ کیا کروں شرمندہ ہوتا ہوں اور کچھ کر نہیں پاتا۔ آپ مجھے ہمیشہ معاف فرماتے آئے ہیں، جب میری خو نہ بدلتی ہو تو آپ اپنی وضع کیوں بدلیں۔ یعنی آپ برہم ہوتے رہیں میں بیچارگی پر اکتفا کروں۔ امید کہ آپ بخیر ہونگے۔

رشید احمد صدیقی

ساغر نظامی

طوفان سے پہلے طوفان کے بعد!

ابھی جب ۲۱ر نومبر کو بمبئی میں طوفان آیا تو میرے مکان کے پہلو میں جو تناور درخت تھے وہ بھی گر پڑے۔ مکان سے نیچے اُترا تو دیکھا دسیوں بوڑھے درخت سڑکوں پر گرے پڑے ہیں۔ یہ مجھے روز آتے جاتے بُرے معلوم ہوتے تھے۔ بے ہنگم، بدشکل، نفاست سے محروم، تہذیب کے دروازے سے دھتکارے ہوئے بے بس گندے انسانوں کی طرح وہ راستوں کی خوبصورتی کے دشمن تھے۔ کسی نے کہا سڑکیں گھنی چھاؤں سے محروم ہوگئیں کوئی بولا راستے سونے ہوگئے۔ تھکے ہارے ان درختوں کے سائے میں گھڑی بھر دم توڑ لیتے تھے۔ میں نے کہا ان کے سائے میں دم لے کر دیر میں راہ طے کرنے والوں کے سہارے مٹ ہی جانے چاہیے تھے۔ ہمیں ان جامد بوڑھے درختوں کا سایہ نہیں چاہیے۔ طوفان مُبارک ہے کہ اُس نے نئی تخلیق کی راہیں کھولیں ہیں — ہم جھکے اور پھیلے ہوئے عمر رسیدہ درخت نہیں چاہتے۔ ہم تازہ دم نئے پھوٹتے والے پودے چاہتے ہیں۔ جو نئی آب و ہوا میں پھلیں پھولیں اور راستوں پر نئی خوبصورتی بکھیریں۔ اگر سڑکیں بھی پھٹ جاتیں تو بڑی خوشی کی بات تھی۔ سیمنٹ کی سڑکیں بننے کی راہ کھلتی۔ یہ ڈامر کی کالی کلوٹی سڑکیں اب نگاہوں کو بالکل نہیں بھاتیں۔

میرے یہ فقرے سننے والوں کی سمجھ میں نہیں آئے اور وہ طوفان کی تباہ کاریوں کی داستان کہتے رہے۔ میں نے کہا تخریب و تعمیر لازم و ملزوم ہیں۔ گرے ہوئے درختوں۔ ڈھے ہوئے مکانوں اور بہتی ہوئی کشتیوں یا طوفان کی زد میں آئے ہوئے انسانوں کی شمار سے فائدہ؟ اب گزران حادثوں پر آنسو بہانے سے کیا حاصل، کہ طوفان کیا بہا لے گیا، کیا ڈبو گیا اور زندگی کو کس درجہ توڑ مروڑ کر رکھ گیا — !؟ کر سکتے ہو تو اپنی دنیا کی ناطاقتی، اپنی قوت مقابلہ کی خامی اور اپنی زندگی کی بے بسی کا اندازہ کرو۔ طوفان کی قہاری کا شکوہ کیوں ہے؟ قہر کے چشم و ابرو میں رافت اور محبت کی پوشیدہ کیفیت کو بھی تو دیکھو۔ طوفان ایک پیغام تھا۔ ایک ہدایت تھا، ایک اشارہ تھا، تمہارے ساحلوں، تمہاری کشتیوں، تمہارے مکانوں، تمہارے باغوں اور تمہاری کمزور و بے بس زندگی کے لئے! تمہاری دنیا اس لئے اُلٹ گئی کہ اس کی بنیادیں کمزور تھیں، ساحل کے پتھر اس لئے دور جا پڑے کہ اُن میں قوتِ مقابلہ باقی نہیں رہی تھی۔ کشتیاں اس لئے اُلٹ گئیں کہ ان کے بادبان فرسودہ ہو چکے تھے، مکان اس لئے گر گئے کہ اُن کی بنیادوں میں گھن لگ چکا تھا۔ پودوں سے پتیاں اور پتیوں سے پھول ٹوٹ کر خاک میں اس لئے مل گئے کہ ان کی نزاکت طوفان کی قوت سے ٹکر نہیں لے سکتی تھی۔ اور پیڑ اس لئے گر گئے کہ ان کی جڑیں زمین میں گہری نہیں تھیں۔

طوفان زندگی پر اِک انتقادی نظر ہے، تخریب کا پیغام تعمیر ہے، ایک ضابطہ ہے۔ یک نئی تحریک ہے تاکہ ہم اپنی زندگی کی خامیوں پر نظرِ ثانی کر سکیں — !؟

تقسیم ہند

جس طرح سمندروں میں طوفان آتے ہیں، خلا میں طوفان آتے ہیں، زمین زلزلوں سے شق ہوتی ہے۔ اسی طرح قوموں کی حیات میں بھی طوفان آتے ہیں۔ عام طوفانوں کی طرح "تقسیم" بھی ایک طوفان تھی، خوفناک، بھیانک اور خونیں، قدرت کے طوفان غیر شعوری ہوتے ہیں، یہ انسانوں کا شعوری اور اختیاری طوفان تھا جو ہماری زندگی کی خوشی بہا لے گیا۔ اس کی ہر موج بجائے خود ایک طوفان تھی جس کے تھپیڑوں میں تاریخ ابد تک ہچکولے کھاتی رہے گی۔ اس طوفان نے تہذیب و تمدن، سیاست و مذہب اور ہماری جملہ روحانی و اخلاقی قدروں کو بیقدر بنا دیا۔ اس کی موجوں نے ہماری زبان و ادب کی رہی سہی حرمتوں کو تہ و بالا کر دیا۔ یہ تو

وہ چیزیں ہیں جن کا ہم شمار کر سکتے ہیں۔ لیکن بے شمار متاع ایسی ہے جس کی بربادی کا ہمیں اندازہ نہیں۔

اس طوفان کے ایک نہیں، ہزار المناک پہلو ہیں۔ لیکن غور کرنے کے بعد تو اس کے کچھ اثباتی رُخ بھی ہمیں صاف نظر آسکتے ہیں۔

پہلی نظر میں جس پہلو پر نگاہ جمتی ہے وہ ہماری قومی جدوجہد کا پہلو ہے۔ اس طوفان نے ہماری قومی تحریک کی خامیوں اور ماضی کی اکثر فروگذاشتوں کو بے نقاب کر دیا ہے۔ جو لوگ اسلامی تہذیب و تمدن زبان و ادب اور ہمارے ماضی و حال کے تمام ورثہ کی حفاظت کے مدعی تھے۔ ان کے ہر دعویٰ کو باطل کر دیا ہے اور جو لوگ ایک ملی جلی تہذیب، متحدہ قومیت، ملکی وحدت اور مشترک وطنیت کے معمار تھے انھوں نے اپنی تعمیروں کو اپنے ہی ہاتھوں طوفان میں غرق کر دیا اور خود نہ جانے کن نامعلوم سمتوں میں بہہ گئے!؟

اُس پار کا ذکر نہیں۔ اس پار کے دو قومی نظریہ رکھنے والوں پر تقسیم کے سامنے آنے والے نتیجوں نے ثابت کر دیا کہ ان کی راہ غلط تھی انہیں معلوم ہو گیا کہ تقسیم کے بعد وہ اُن طریقوں سے اپنے کسی ثقافتی ورثہ کی حفاظت نہیں کر سکتے۔ جن طریقوں پر اُن کو یقین کامل تھا کہ وہ ان کی جداگانہ قومیت کے جملہ امتیازات کی پوری حفاظت کر سکتے ہیں۔

تقسیم کے واقعی نتیجے

تقسیم کا پہلا نتیجہ تبادلۂ آبادی کی تباہ کاریوں کی صورت میں رُونما ہوا۔ جس نے بالآخر یہ حقیقت واضح کر دی کہ ہمیشہ سے کہیں زیادہ اتحاد اور اشتراک کی ضرورت تھی اور انہیں دونوں میں ہندی انسانیت کی دائمی بہتری اور فراغت مضمر تھی نہ ہند سے پاکستان جانے والوں کو آسودگیٔ روح و قلب نصیب ہوئی اور نہ پاکستان سے ہند آنے والوں کو آتمک چین ملا۔

اِن طوفانوں سے ہٹ کر نئے حالات سے پیدا شدہ وہ اہم سیاسی مسائل تھے جو دونوں حکومتوں کی متحدہ کوششوں کے بغیر حل نہیں ہو سکے۔ جیسے جیسے زخم بھر رہے ہیں ہمیں اندازہ ہو رہا ہے کہ ہم نے اپنے ہی ناخنوں سے اپنا منہ نوچا ہے انسانیت کے رُخ پر جتنی خراشیں ہیں وہ ہمارے ہی پنجۂ جنون کی کارفرمائیاں ہیں لیکن ہم علیحدہ ہونے کے بعد کبھی ایک ہونے کی ضرورت سے انکار نہیں کر سکتے۔ ہم ایک خون، ایک جسم، ایک روح ہیں، تقسیم کے بعد جو سب سے عجیب حقیقت سامنے آئی ہے وہ لازمیت اتحاد ہی ہے جس سے انکار کا نتیجہ تقسیم کی صورت میں ظاہر ہوا ——!؟

متحدہ قومیت کا خواب

متحدہ قومیت کا خواب محض خواب نہیں تھا ایک حقیقت تھا جس کی اساس تاریخ میں بہت گہری ہے اس اساس کو ایشیائی فلسفے کے مابعد الطبیعاتی تصور کے تطابق نے مضبوط کیا ہے۔ مشرق کی اقوام مادہ پرست نہیں وہ روح کی الہیاتی گہرائیوں کی قائل ہیں یعنی ایشیائی ثقافتی اتحاد کی اصل بنیاد ایک الہیاتی تصور ہے جو تمام ایشیائی مذاہب میں کسی نہ کسی شکل میں موجود ہے اسی روحانی رشتے کے پیش نظر تمام مشرقی قومیں ایک ہی قوم متصور ہو سکتی ہیں کیونکہ وہ ایک ہی مذہب کو مانتی ہیں۔ اگر متحدہ قومیت کے داعی یہ کہتے تھے کہ ہندو اور مسلمان ایک ہی قوم ہیں تو ان کی دلیل کمزور نہیں تھی۔ دونوں قومیں روحانی علاقوں اور آسمانی قوتوں کی قائل ہیں اور دونوں ایک خدا کو مانتی ہیں۔

طوفان کیوں آیا؟ .... یہ ایک وسیع اور اہم سوال ہے۔ اسکا جواب دینے کے لئے تاریخ اور وقت کے پہلوؤں سے پھوٹنے والے قدرتی حالات و واقعات کا تجزیہ کرنا پڑیگا۔ یورپ کے تجارتی انقلاب کے بعد ہمارے ملک میں برطانوی سامراج کے منحوس قدم آئے۔ تاریخ کے ارتقائی عمل کے لحاظ سے صنعتی انقلاب نے زندگی میں کسی قدر تبدیلی پیدا کی اور انگریزی حکومت نے ہندوستان میں قدیم جاگیرداری کا خاتمہ کر دیا۔ ہم ایک زنداں سے نکالے اور دوسرے قیدخانے میں ڈال دیئے گئے۔ جس کا صحن قدرے .... کشادہ تھا۔ لیکن برطانوی سامراج کی غلامی کا ردِ عمل ہندو مسلمانوں پر اس شعور کے ساتھ نہیں ہوا کہ وہ ایک نظام سے آزاد ہو کر دوسرے نظام میں داخل ہو رہے ہیں، پہلا جال زیادہ سخت تھا جسے ارتقائی عمل نے توڑ دیا ہے اور نیا جال اس کے مقابلے میں کمزور ہے جسے وہ آسانی سے توڑ سکتے ہیں۔ بلکہ اس انقلاب کا اثر ہندو مسلمانوں پر رجعتی صورت میں ہوا۔ غلامی کی زنجیریں توڑنے کی جتنی کوششیں کی گئیں وہ پرانی زنجیروں کی یاد میں کی گئیں، جتنی تحریکیں اٹھیں وہ پیچھے واپس جانے کے لئے تھیں آگے بڑھنے کے لئے نہیں عوام کا ذہن جو ذہنی شعور اور بالغ نہیں تھا ہندومت کی نشاۃ الثانیہ اور احیائے اسلام کے دور رس نتائج تک

نہ پہنچ سکا اور ہمارے سیاسی مفکرین کے پاس (جو خود دراثشت کی دقیانوسی قیدوں سے آزاد نہیں تھے) لے دے کر صرف ایک نسخہ تھا کہ وہ عوام کو ماضی کے نام پر بیدار کریں اس نسخۂ کیمیا کے اجزائے ترکیبی میں سب سے بڑا جزو مذہب کا تھا۔ جس کا نام لے کر غلامی کے خلاف عوام کا مورچہ بنایا گیا ہمارے سیاسی و اخلاقی طبیبوں کی تشخیص ہی غلط تھی۔ انھوں نے مرض کی حقیقی علت کو معلوم نہیں کیا جو جاگیرداری سے لے کر سرمایہ دارانہ عہد تک عوام کی روح کیں تعفن لگاتی رہی تھی۔ عوام کے مذہبی احساس کو بیدار کیا گیا تاکہ برطانوی غلامی کی زنجیریں توڑی جاسکیں، برطانوی غلامی کو اسلامی تہذیب و تمدن اور مسلمانوں کے اخلاق و اعمال کے زوال کی بنیاد قرار دیا گیا۔ سیاست دانوں سے لے کر شاعر اور ادیبوں تک نے ایک ہی راگ گایا کہ ہماری نجات مسلمانوں کے قرونِ وسطیٰ کے واپس لانے میں مضمر ہے اور اس مقصد کے حاصل کرنے کے لئے برطانوی غلامی کی زنجیریں توڑ دینا ضروری ہے۔ اس طرح مسلم عوام کے ذہن پر یہ چھاپ پڑی کہ آزادی کے معنی اسلامی حکومت کے قیام اور ہندوستان میں مسلم اقتدار کے ہیں۔

اسی طرح ہندو رہنماؤں نے جن خطوط پر ہندو عوام کو جنگ کے لئے تیار کیا ان کے ڈانڈے بھی پراچین تہذیب، ہندو سنسکرتی اور ۲ ہزار سال قبل کی تمام ہندو روایات سے جا ملتے ہیں اور انہی کے احیاء کے وعدوں پر قوم کی ذہنی تربیت کی گئی اس طرح آہستہ آہستہ ہندو مسلمانوں کے فکر و عمل میں مسلسل تضاد پیدا ہوتا چلا گیا اور وہ اس وقت نمایاں ہوا جب آزادی کی منزل قریب آئی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اس تضاد کا پس منظر بہت وسیع ہے جس میں ہمیں دوسرے اسباب کی نشانیاں بھی ملتی ہیں جن کا تعلق ہمارے ملک میں سرمایہ دارانہ نظام کی خامی اور سماجی نقائص سے بھی ہے لیکن بہرحال یہ ہمارے سیاسی مفکرین کی ناپختگی تھی کہ انھوں نے قومیت کے واضح تخیل کی بنیاد پر ہندوستانی عوام کی تربیت نہیں کی۔ ان کے اعمال و افکار میں ترقی پسندی کا اتنا ہی جزو تھا کہ وہ "آزادی" چاہتے تھے باقی رجعت پسندی ہی رجعت پسندی تھی جیسے گرداب ہیں۔ وہ پھنس کر رہ گئے جن مسلمان اور ہندو عوام کو تقریباً ڈیڑھ سو سال آزادی کا یہ مفہوم بتایا گیا کہ "شاہی" پھر واپس آجائے گی اور آزادی کی تعبیر پر مسلم اقتدار قائم ہوگا یا قدیم آریہ ورت کا آریائی اقتدار ہندوؤں کو حاصل ہو جائے گا اور وہ رام راج کی برکتوں سے مالامال ہو جائیں گے ان کے ذہن آزادی کی یہ غیر منطقی توجیہ کیوں کر کر سکتے تھے کہ حقیقی آزادی کا مقصود ایک نئے آدرش پر موقوف ہے جو متحدہ قومیت کی بنیاد پر نئی قوم کی محکم تعمیر کے مترادف ہے۔

زہر سے زہر کا تریاق

ادھر ہندو اور مسلمان رہنما گزرے ہوئے دور کی غیر مرتقی مذہبی ثقافت کے نام پر عوام کو انگریز سے ٹکرا رہے تھے ادھر انگریز بھی ان زہریلے نسخوں سے غافل نہیں تھا جو ہمارے سیاسی و اخلاقی طبیب غلامی اور محکومی کے جراثیم کو ہلاک کرنے کے لئے تجویز کر چکے تھے نہ یہ کہ انگریز نے اس زہر کا تریاق انہیں کے زہر سے حاصل کیا اس نے اس اتحاد کو جو نیم مذہبی سیاسی شعوروں کی بنیاد پر پیدا کیا جا رہا تھا مذہب ہی کے نام پر ختم کرنے کا پلان بنایا۔ اور ان غداروں کو دہرے سے استعمال کیا جو قومی تحریک کے اجزائے ترکیبی میں موجود تھے۔ مذاہب کے جزوی اور فروعی اختلافات کے نام پر برطانوی سامراج اور ملک کے غداروں نے قومی تحریک کا ہر ممکن توڑ کیا اور اُسے نمایاں کامیابی اس لئے ہوئی کہ ہندو مسلم عوام میں آج تک جس جذبے کو ابھارا گیا تھا وہ دین دھرم کی غلط تعبیر پر مبنی تھا۔ اس جذبے کے دو دھارے ایک دوسرے کے تحت الشعور تخالف سے غافل ہو کر آزادی کے جنون میں غلامی کی آہنی دیواروں سے ٹکرا رہے تھے۔ انگریز نے پہلے ان دھاروں کا بند باندھا اور پھر انھیں دو مخالف سمتوں میں موڑ دیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے یہ دھارے بے پناہ سیلاب میں تبدیل ہو گئے اور ملک میں اختلاف و نفاق کا ایک تلاطم برپا ہو گیا۔

ہندو مت اور اسلام کے نام پر ملک میں جو آگ لگائی گئی وہ آگ کلائیو اور ہیسٹنگز کے عہد سے لے کر ماؤنٹ بیٹن کے عہد تک ہمارے اخلاق و انسانیت کو پھونکتی رہی۔

جیسے جیسے انگریز کو طوفانِ آزادی کی خشونت اور ہمہ گیری کا اندازہ ہوتا گیا نئے نئے بند باندھتا گیا اُس نے ہندوستان کی تاریخ میں ترمیم و تنسیخ کی، اُس نے مذہبی عصبیت کے نیم مردہ احساسات کو زندہ کیا اور مشترک قومیت کی داغ بیل کو مٹا دینے کی ہر ممکن کوشش کی۔ مادر سیاست کے بطن سے بالآخر فرقہ پرستی کی شریر نسل پیدا ہوئی۔ جس نے ہندوستان کو تمام عالم میں رسوا اور بدنام کر کے چھوڑا۔

غلامی کے خلاف لڑائی میں قوم پرستوں کو وہ تمام مظالم سہنا پڑے جو حکومت، بیوروکریسی، فرقہ پرستی اور دوسرے وطن دشمن

عناصر کی طرف سے اُن پر توڑے گئے اور وہ انگریزی ڈپلومیسی کی بھڑکائی ہوئی آگ نہ بجھا سکے۔ انھیں تسلیم کر لینا چاہئے کہ اتحاد شکن قوتوں کے مقابلے میں کوئی فوری اور مؤثر اقدام اُن کے بس کا نہیں تھا، وہ کوئی ایسی تحریک بر سرِ کار نہ لا سکے۔ جو سائنٹفک اصولوں پر مذہب زدہ عوام کی ذہنی تربیت کر سکتی یا اُن کو مذاہب کی مشترک حقیقتوں سے روشناس کرا دیتی۔

میرے خیال میں جنگِ آزادی کا وہ دَور جو برطانوی سامراج کے نئے نئے داؤ پیچ کی زدوں میں گزرا۔ ہماری زندگی کی پچھلی تہوں میں المناک آثار پیدا کرتا رہا۔ مذہب زدہ عوام غیر شعوری طور پر کچھ مدت کے لئے سامراج سے ٹکرائے لیکن ان کے ذہن صاف نہیں تھے، مقصد کی تصویر دھندلی تھی اور منزل کے آثار مبہم! اور اسکا اصل سبب یہ تھا کہ ہندو مسلم عوام باہمی محبت کی بنیاد پر نہیں بلکہ ایک مشترک غنیم کے مقابلے میں نفرت اور بغض کے ماتحت متحد ہوئے تھے۔ اس کمزور بندھن کو ہمارا حریف جب چاہتا کمزور کر دیتا تھا۔ جیسے ہی مُلک میں مذہبی تضادوں کے نام پر لایعنی تحریکیں اٹھیں یہ اتحاد ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ اور اس شکست کی گونج میں ۲۰ لوگ پہلی علاقوں اور رشتوں کی لذت کو بھی بھول گئے۔ یہاں تک کہ ہماری وطنی زندگی تلخی اور کڑواہٹ کا ماتم بن گئی۔ صد حیف کہ اس ماتم میں لیڈروں کا غیر ضروری جوش سب سے زیادہ نمایاں تھا۔

دیسی زبانوں کا ادب اور قومی تحریک

اس کے باوجود کہ قومی تحریک میں مثبت اور صحت مند عناصر کی کمی تھی لیکن اُس نے ایک نیم مذہبی سیاسی ماحول ضرور پیدا کر دیا جس سے کم و بیش دیسی زبانوں کا ادب متاثر ہوا۔ ہندی، بنگالی، گجراتی اور مرہٹی وغیرہ کے ساتھ متحدہ قومیت کی بنیادوں پر ستی نئی تخلیقات ہوئیں کچھ شعرا و افسانہ نگار اور ادیب بھی پیدا ہوئے جو تازہ انقلاب کے ساتھ چلنے کی کوشش کرتے تھے لیکن ان سب کے ادب کا خمیر صدیوں کی پرانی مٹی سے گوندھا گیا ہے اور ان کی تخلیقات سے پرانی اور تھکی ہوئی ذہنیت جھانکتی معلوم ہوتی ہے۔

اسی طرح اُردو زبان میں جو قومی ادب پیدا ہوا اس کے عناصر ترکیبی میں بھی ماضی کی روایات اور مذہبیت رچی ہوئی تھی اور یہ تصورات، نئی اور تازہ دَم قومیت کے مطابق نہیں تھے اکثر ادیبوں اور شاعروں کا آغاز قوم پرستی سے ہوا اور انجام پین اسلام ازم پر! ادب کی اس دو رنگی سے صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ زندگی کی ہر جہت میں دو دھارے بہتے رہے اور ان دھاروں کو ایک کرنے کی کوئی نمایاں کوشش قومی تحریک کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ صوبائی زبانوں کے ادب میں تخلیقی اختلاف موجود تھا۔ جسے کم از کم ۱۹۳۵ء تک ہمارے ادیبوں اور شاعروں نے مٹانے کی کوئی جد و جہد نہیں کی اور نہ کوئی خاص مفاہمت ہی پیدا کر سکے۔ جو ہماری کلچرل یگانگت کا موقف بن جاتی۔ بلکہ اس کے خلاف ہندی اُردو کی کشمکش کی ایک طویل داستان ملتی ہے جس پر قومی تحریک کے سر بر آوردہ افراد کے دستخط موجود ہیں۔ حالانکہ یہ طویل داستان ہندو اور مسلمان کے درمیان تہذیبی اور لسانی خلیج حائل کرنے کے لئے فورٹ ولیم کالج میں برطانوی حکمتِ عملی نے تصنیف کی تھی، دونوں قوموں کو اس حکمتِ عملی کے پیچھے چھپی ہوئی اس سازش کو آشکارا کرنا چاہئے تھا لیکن دونوں زبانوں کے ماننے والے اس سازش کا شکار ہو گئے اور بالآخر ادب و سیاست کی دوری نے زبان کے مسئلہ کو خطرناک صورت دے دی۔ ہر سیاسی حلقے سے اس سلسلہ میں جتنے قدم اٹھائے گئے وہ متحدہ قومیت کے بنیادی اصولوں کی تکذیب اور فرقہ پرستی کی تصدیق کرتے ہیں۔

قومی تحریک کے ناخداؤں نے ادب کو اپنے دائرۂ عمل سے بالکل خارج رکھا اور اس کی افادیت سے فائدہ اٹھانے سے حیرت انگیز طور پر احتراز کیا۔ اگر ادب کی پست سطح پر آنا ان کی شان کے منافی تھا تو وہ خود ہی کوئی ایسا ادارہ قائم کر سکتے تھے۔ جس کے ذریعہ عوام میں صحت مند سیاسی شعور پیدا کیا جا سکتا۔ لیکن انھوں نے یہ بھی نہیں کیا۔

عوامی انقلاب کی بنیاد

ادب سے قومی تحریک کے بانیوں کی روگردانی کوئی معمولی فروگذاشت نہیں ہے۔ یہ فروگذاشت ہمارے وطن کی بہت سی خرابیوں کی ذمہ دار ہے۔ ملکوں کا مستقبل یوں ہی نہیں بن جاتا، قومیں محض سیاسی داؤ پیچ سے نہیں بنا کرتیں۔ قوم خمیر کے مسلسل عمل کا نتیجہ ہوتی ہے۔ انقلاب کوئی ناگہانی تخلیق نہیں ہے۔ انقلاب کے لئے دنیا کے ہر ملک میں برسوں ادب کے ذریعہ جد و جہد کی گئی ہے۔ انقلابِ فرانس کوئی حادثہ نہیں تھا اور نہ انقلابِ روس کوئی وقتی سانحہ تھا۔ اس کے لئے عوامی اعصاب کو بہت پہلے سے

تیار کیا گیا تھا۔ ۱۹۱۷ء سے قبل اشتراکیت کے موضوع پر کروڑوں کتابیں عوام میں پھیل چکی تھیں، اشتراکیت کے متعلق روسی عوام میں جو مضبوط اعتقاد پیدا ہوا وہ اعتقاد سینکڑوں ادیبوں کی ذہنی کاوشوں کا نتیجہ تھا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو پہلا انقلاب ناکام بھی ہو سکتا تھا ——!؟

جس عہد میں ہماری قومی تحریک نے بال و پر نکالے انقلابِ روس اُسی عہد کا واقعہ ہے لیکن تاریخ کے اس عظیم انقلاب سے ہمارے رہنماؤں نے کچھ نہیں سیکھا کسی ایسی اجتماعی ادبی تحریک کا تصور ان کے ذہنوں میں نہ اُبھر سکا جو اس بات کی ذمہ دار قرار پاتی کہ وہ عوام کے ذہن کو ایک واضح مقصد کے سانچے میں ڈھال دے گی ——!؟

میرے خیال میں عوامی انقلاب کی کامیاب ابتدا اسلام نے کی، دنیا اس سے پہلے عوامی رجحان کی تربیت اور ترقی کی قائل نہ تھی اس کامیاب ابتدا کی اساس ادب اور فصاحت و بلاغتِ کلام پر رکھی گئی۔ سب سے پہلا انقلاب قرآن کریم کی فصاحت اور بلند ترین ادبیت کے ذریعہ برسرِ کار لایا گیا اور دنیا کے اس انمول ادبی ذخیرے نے عرب کی زندگی کے طومارِ بے تمیزی کی کایا پلٹ دی یہ عین قانونِ فطرت تھا، انسانوں کے شعوری زندگی میں انقلاب اور کامیاب انقلاب کے لئے ادبی و شعری ہچکولوں اور جھکولوں کی ضرورت ہمیشہ رہی ہے، قرآن نے فصحائے عرب کو خاموش کر دیا، کہانت کے سحر ساز نغمے ختم ہو گئے، شعراء کی عریاں نگاری دفن کر دی گئی، قصیدہ خوانوں کے غلو اور مخلوق پرستی کو معدوم کر دیا گیا۔ نئے ادب، نئے اندازِ بیان، نئے حُسنِ فصاحت اور جمالِ بلاغت کی آغوش میں انقلاب پسند اجتماع کو پروان چڑھایا گیا۔ قدرت کے اسی قانون کے ماتحت ہندوستان کے ادب کی روح انقلاب بیدار ہوئی اور اس کمی کو پورا کرنے کی ایک کوشش کی گئی جو ہندوستان کی سیاسی انقلابی تحریک میں نمایاں تھی یعنی یہاں کے متوقع انقلاب کی بنیاد ادب اور لٹریچر پر نہیں رکھی گئی تھی بلکہ غلامی اور محکومی کی مجبوریوں اور معذوریوں پر!

اردو ہندی کے شاعر نئے ماحول کی خود پیداوار ہیں جن کی شاعری نے تحریکِ آزادی کو کافی قوت بخشی لیکن سیاسی اداروں سے ان کا کوئی رابطہ نہیں رہا قومی سیاست کے خداؤں نے بندگانِ ادب سے کبھی واسطہ نہیں رکھا۔ ادب سے کوئی محکم سیاسی و ملکی افادیت پیدا ہوتی تو کیوں کر ہوتی ——!؟

انجمن ترقی پسند مصنّفین

۱۹۳۶ء میں نوجوانوں کے چھوٹے سے گروپ نے ایک انجمن بنائی اور اس کے مینفسٹو میں ادب کے نئے مقاصد کی تعین و تشریح کی میرے خیال میں ادیبوں اور شاعروں کا یہ نیا تصور قانونِ ہند مجریہ ۱۹۳۵ء کی لغویتوں نے پیدا کیا جس سے ہندوستانی عوام کی توقعات کے بالکل خلاف وہ سیاسی آئین ہندوستان کو دیا جو ہمارے مشترک ادب اور ہمارے ملے جلے کلچر کے لئے زہر ہلاہل بن گیا۔ یہیں سے اردو ہندی ادب میں سیاست و ادب کا ایک شفاف آمیزہ ترکیب پانے لگا جس نے ادب کی نئی قدروں کی داغ بیل ڈال دی اور عوام کے ذوق و معیار کو متاثر کرنا شروع کر دیا۔

ترقی پسند مصنفین کی انجمن نے صاف صاف اپنے مینفسٹو میں اعلان کیا:— "ان کا فرض ہے کہ وہ اس قسم کے اندازِ تنقید کو رواج دیں جس سے خاندان، مذہب، جنس، جنگ اور سماج کے بارے میں رجعت پسند اور ماضی پرستی کے خیالات کی روک تھام کی جا سکے"۔ اور اس طرح رجعت و فرقہ پرستی کے خلاف قومی محاذ سے ہٹ کر ایک نیا مورچہ قائم ہوا۔

چند ہی برسوں میں یہ تحریک نوجوانوں میں مقبول و کامیاب ہو گئی۔ انجمن نے نئے لکھنے اور پڑھنے والے پیدا کئے، ادب میں نئے موضوعات کا اضافہ ہوا۔ ادب کی تکنیک بدلی اور نئے تصور کو پروان چڑھانے کے لئے انجمن کو بہت کچھ بنیادی مرحلوں سے بھی گذرنا پڑا۔ پرانے سماجی تصورات پر نئی تحریک ایک ضرب تھی اس لئے اُسے مخالفت کے طوفانوں سے بھی ٹکرانا پڑا، چند ہی برسوں میں یہ سب کچھ ہوا لیکن وسیع پیمانے پر عوام کو متاثر کرنا اس کے بس کی بات نہ تھی۔ کیونکہ ظاہر ہے یہ تحریک قومی جدوجہد سے اُس موڑ پر معرض وجود میں آئی۔ جب ملک ذہنی طور پر دو حصوں میں بٹ چکا تھا اور عوام فرقہ پرستی کے غلط راستے پر

پڑ چکے تھے۔ اور اس صورتِ حال کا ردِ عمل مثبت نہیں منفی ہو رہا تھا۔

سیاست اپنے نت نئے تجربوں اور داؤ پیچ میں مصروف تھی، ادب کے بے نواؤں کی بات سننے والا کوئی نہ تھا۔ یہ درست ہے کہ بعض رہنماؤں نے انفرادی طور پر انجمن سے دلچسپی کا اظہار کیا اور اس کی افادیت کو بھی تسلیم کیا اس کے باوجود کسی کی سمجھ میں یہ نہ آیا کہ ادبی انقلاب، سیاسی انقلاب کی بنیاد ہے۔ اس لئے اس تحریک کی پشت پناہی صالح و مثبت نتائج پیدا کرے گی اور اس کے ذریعہ رجعت و فرقہ پرستی کو ختم کیا جا سکے گا۔

کچھ ہی برسوں میں نئے نظریوں، اور نئی سیاسی صورتِ حال نے انجمن اور قومی تحریک کے درمیان بھی خطِ فاصل کھینچ دیا۔ اور اس طرح قومی لیڈر شپ نے ادب کو اپنا ز کے اس موقع کو بھی کھو دیا۔

یہاں تک کہ دو متقابل قوتوں لیگ اور کانگریس کی سیاسی رقابتوں نے ایک نئے المیّہ کا آغاز کیا۔ میرے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ میں بارہ برس کی المناک سیاسی تاریخ دُہراؤں نہ میرا یہ مقصود ہے کہ میں اگلے پچھلے گناہوں کا شمار کروں۔ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ملک کا دردناک انجام کوئی حادثاتی واقعہ نہیں ہے۔ اس انجام کی نشوونما ہماری فحش غلطیوں اور سیاست کی بنیادی خامیوں کی گود میں ہوئی ہے۔ یہ انجام ہندو مسلمان اور سکھ ہر فرقہ کی ناعاقبت اندیش لیڈر شپ اور برطانوی سامراج کی سفاکانہ ریشہ دوانیوں کا نتیجہ ہے

تقسیم سے برسوں پہلے ذہنوں میں دو حکومتوں کا تصور گھر کر چکا تھا۔ ہندوؤں کے ذہن میں ہندو راج کا اور مسلمانوں کے ذہن میں حکومتِ الٰہیہ کا، یہ تصور اُس غلط تربیت کا نتیجہ تھا جو دونوں فرقوں کو دی گئی تھی۔ ہر چند کہ اس تربیت کی بنیاد کوئی بدنیتی نہیں تھی۔ لیکن یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ سیاسی ذہن کا عدمِ بلوغ اس کا اصل سبب تھا۔ عوام تو عوام رہنماؤں کے ذہن پُرانی روایتوں سے آزاد نہیں تھے۔ ان کے ذہن میں بھی قومیت کا تصور صاف نہیں تھا اگر صاف ہوتا تو تاریخ کی دوسری ہی شکل ہوتی۔

یہاں میں ہندو مسلم سکھ لیڈر شپ کے متعلق احترام اور بے باک گفتاری کے ساتھ دو لفظ کہہ دینا چاہتا ہوں کہ انھوں نے مصلحِ اعظم کا لباس تو پہن لیا لیکن اصلاح اور تربیتِ عام کے سلسلے میں وہ اپنے یقین اور اعتقاد پر اٹل رہنے کے بجائے عوامی جذبات کی رَو میں بہتے چلے گئے۔ انھوں نے مضبوط اور رواداری ذہنیت بنانے کا کبھی عزم نہیں کیا وہ تو صرف ووٹوں اور رائیوں کے حصول کے لئے عوام کے لاشعوری جذبات کو مطمئن کرنے میں لگے رہے۔ ہمیں رہنماؤں کی اس کہکشاں میں ایک ہی سب سے زیادہ روشن ستارہ ملا تھا اور اس طرح ملا تھا جس کی استقامت بالحق اور اصرار بالصداقت نے اُس سے آخری اور سب سے زیادہ قیمتی قربانی تو لے لی مگر اس کو عوامی رَو میں نہیں بہنے دیا۔ اس نے اپنی اور دوسروں کی شعاعوں کو غلط سمتوں میں پڑنے سے ممکن طور پر روکا لیکن تاریکی بڑھتی ہی چلی گئی۔

اگر تحریکِ آزادی میں مختلف سیاسی رجحان رکھنے والے قائدین کا رول حریفانہ نہ ہوتا اور تمام انقلابی حلقے اپنی متحدہ قوت سامراج سے مقابلے کے لئے استعمال کرتے تو انگریزی کی حکمتِ عملی ناکام بنائی جا سکتی تھی۔ یہ غلامی اور سیاسی ذہن کی ناپختگی تھی کہ اپنوں ہی سے ٹکراؤ کے لئے میدان تیار کیا گیا اور عوام کے ذہن ان کے حلقوں میں محدود کر دیئے گئے وہ اپنے دام سے آزاد ہو کر صیاد کو نہ دیکھ سکے جو کمین گاہ میں بیٹھا ہوا ایک دوسرے کے خلاف تیر چلانے کے لئے اکسا رہا تھا۔

سیاست میں عوام کا رول

یہ سادہ لوحی کچھ ہندوستانی عوام ہی میں نہیں، ہر ملک کے عوام کا رول سیاسیات میں ایک ہی رہا ہے۔ یعنی آنکھ بند کر کے وعدوں کے چکر میں آجانا جو بلند آواز سے تریاق کے نام پر زہر فروخت کرے اُسے مسیحا سمجھنا، جو راستوں کو زیادہ پُر پیچ بنائے اُسے اپنا رہبر خیال کرنا، جو ان کے جذبات کے خرمن میں چنگاریاں چھپا دے اُسی کو اپنا دوست سمجھنا۔ اور خود اپنی قوت کا احساس کبھی نہ کرنا۔ عوام بھولے ہیں۔ شریف ہیں۔ سادہ لوح ہیں، وہ اپنے دُکھ کی دوا چاہتے ہیں اور جو کبھی ان کے دُکھ کو دور کرنے کا وعدہ کرے اسی کے ہاتھ میں ہاتھ دے دیتے ہیں۔ ہندو مسلم عوام دونوں کی ایک ہی کیفیت ہے۔ اس سے بڑھ کر سادہ لوحی

اور کیا ہو سکتی ہے کہ سی۔پی کے ۹۰ فیصدی مسلمان اس خیال میں مگن رہے کہ تقسیم کے بعد ان کی کلچرل انفرادیت باقی رہے گی۔۔!؟

تقسیم اور اس کا ردِ عمل

اور جب یہ طوفان آکر اتر گیا تو بجائے آنکھیں کھلنے کے ہمیں اور کم نظر آنے لگا۔ نئی جغرافیائی حد بندیوں نے ہماری آنکھوں پر نئے پردے ڈال دیئے اور یہ غیر قدرتی نہ تھا۔ تقسیم نے ایشیائی سیاسیات میں ہند کو نقصان پہنچایا، تقسیم نے انسانیت کو تقسیم کردیا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ تقسیم ہمارے سر تھوپی گئی یا ہم نے اُسے رضامندی سے اختیار کیا ۔۔۔!؟

میں تفصیلات میں نہیں جانا چاہتا لیکن تقسیم تو اُس تربیت کا منطقی نتیجہ تھی جو ہر حلقے میں مذہب کا سہارا لے کر عوام کو دی گئی اور پھر جب ایک ایسا مرحلہ آگیا جہاں پہنچ کر کوئی راہ باقی نہیں رہ گئی تو ہمارے رہنماؤں نے رضامندی سے اُسے منظور کرلیا۔ ظاہر ہے کہ عوام الگ الگ خواب دیکھ رہے تھے اور اپنے خوابوں کی تعبیر اُن تصورات کی روشنی میں چاہتے تھے۔ جن کی انھیں تعلیم دی گئی تھی۔ مقاصد کے اختلاف نے ان کے خوابوں میں خوفناک تضاد پیدا کردیا تھا اس لئے اگر اُن پر تقسیم کا ردِ عمل ہوا تو غیر متوقع اور غلط نہیں تھا، ہندو عوام ایک متحدہ ملک کا سپنا دیکھ رہے تھے، اور مسلم عوام ایک ایسے پاکستان کا خواب دیکھ رہے تھے جس میں پورا بنگال اور پنجاب سمایا ہوا ہو اور جس کا خون ہند کے مسلم اقلیتی صوبوں کی شریانوں میں بھی پوری تازگی و روانی سے دوڑ رہا ہو۔ اُن غریبوں کا کیا قصور تھا اُن سے وعدہ ہی یہ کیا گیا تھا کہ علیحدگی کے معنیٰ تمام ہند میں ان کی جداگانہ وحدانیت کے قیام کے ہیں ۔۔۔!؟

لیکن عوام سے قطع نظر جن رہنماؤں نے تقسیم کو خوشی منظور کیا وہ بھی اِس کے ردِ عمل سے اپنے ذہن کو محفوظ نہ رکھ سکے۔ اتنے خوفناک طوفان کے بعد جس میں انسان اور انسانیت خس و خاشاک کے مانند بہہ گئی۔ دونوں طرف حقائق کو تسلیم کرلینا چاہئے تھا۔ اپنے غلط اقدامات اور غلطیوں پر کڑی نظر ڈالنی چاہئے تھی لیکن تقسیم کے بعد بھی خندقیں نہیں بھری گئیں، مورچے نہیں توڑے گئے۔ بلکہ اس قسم کا طرزِ عمل اختیار کیا گیا، گویا جنگ کا یہ اولین مرحلہ ہے! طوفان کے بعد بھی نئے نئے طوفان آتے رہے اور ہر طوفان ہماری رہی سہی متاعِ انسانیت کو بہالے جاتا رہا۔

مسلم عوام اور اُن کی بے بسی

اور ان طوفانوں میں ہندی مسلم عوام کی بے بسی، مایوسی اور ذہنی انتشار کی کوئی حد نہیں رہی ان کے لئے نئی نئی مشکلیں پیدا ہو گئیں۔ انھیں راہ بتانے والا تو درکنار کوئی بھٹکانے والا بھی موجود نہیں رہا۔ انھیں اپنے گناہ سادہ لوحی کی بہت بڑی قیمت ادا کرنی پڑی۔ یہاں رہ کر بھی اور یہاں سے ہٹ کر بھی، یہاں رہ کر وہ بہت دنوں اُن فاسد جذبات سے آزاد نہ ہو سکے جنھیں وہ بغیر کسی دلیل اور منطق کے دلوں میں باقی رکھے ہوئے تھے۔ اپنی تباہی، خانہ خرابی اور بربادی کے اسباب وہ اب بھی نہیں سمجھ سکے تھے۔ تقسیم کے نتائج کو وہ ہم وطنوں کے جبر و ظلم سے تعبیر کرتے رہے۔ لیکن اس حال کے حلقے زیادہ دنوں مضبوط نہ رہ سکے۔ حالات اور اس کے تدریجی ارتقاء نے اُن حلقوں کو جلد ہی پگھلا دیا، وہ آزاد ہوئے اور اس بوجھ سے سبکدوش ہو گئے جو ان کے احساس کی کمر توڑے دے رہا تھا۔ خارجی اور داخلی احساسات و تاثرات انسان کو کبھی آزاد نہیں چھوڑتے۔ جیسے ہی انھیں اس بار سے سبکدوشی حاصل ہوئی ایک نئی کیفیت نے انھیں آگھیرا وہ اپنی روح میں ایک خلا محسوس کرنے لگے۔ ان غریبوں نے کبھی اپنے دماغ سے نہیں سوچا تھا اور ماضی کی گہرائیوں نے اس تعلق کو ان کی نگاہوں سے مطلق پوشیدہ رکھا تھا جو انھیں اپنی مادرِ وطن سے ہونا چاہئے تھا۔

یہاں سے ہٹ کر مسلم عوام اُن تمام روحانی آسودگیوں کے رشتے سے کٹ گئے۔ جو صدیوں کے رہن سہن اور کلچرل مداومت کا نتیجہ تھیں۔ گناہ سادہ لوحی کی یہ قیمت کوئی معمولی قیمت نہیں تھی۔ روحانی آسودگی۔ خارجی ماحول اور داخلی مزاج کے مسلسل تعاون و ہم آہنگی کا نتیجہ ہوتی ہے اسے کوئی حادثاتی محبت یا ہنگامی نفرت پیدا نہیں کرسکتی۔ چنانچہ دونوں طرف تقسیم کے بعد کے احساسات اس کی کھلی ہوئی تصدیق ہیں۔ نہ جانے والوں کو چین ملا نہ یہاں آنے والوں کو۔

ہندی مسلمانوں کی نئی اجتماعی حیثیت

اور جو یہاں رہ گئے بالآخر اب ان کی آنکھیں کھلی ہیں اور انھوں نے محسوس کر لیا ہے کہ ہندو مسلمان بھائی بھائی ہیں۔ ایک ماں اور ایک خون نے انھیں جنم دیا ہے اور ہند کی خاک ہی سے ان کا ازلی و ابدی رشتہ ہے۔ ملک تقسیم ہو سکتا ہے مگر روحوں کو تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ وہ دوسرے ملکوں کے مسلمانوں سے کٹ جائینگے نہیں، وہ اُن سے اور قریب ہو جائیں گے۔ اپنے ہم وطنوں کے ساتھ ترقی کرنے کے بعد ان کی نئی اجتماعی حیثیت ہوگی اور وہ اس عظیم الشان قوم کا ایک صالح اور زندہ قوت حصہ ہوں گے جو ۳۵ کروڑ افراد پر مشتمل ہے۔

اس نئی اجتماعی حیثیت و قوت کا اندازہ کرنا ہندی مسلمانوں کا پہلا کام ہے، بعید از قیاس تصورات میں اگر کچھ اور وقت برباد کیا گیا تو رہی سہی قوت بھی ضائع ہو جائیگی۔ حالات کے جبر سے تبدیل ہونا یا تبدیل کرنا سب سے بڑی اخلاقی پستی ہے، مسلمان جن بلند اصولوں کے ماننے والے ہیں۔ اُن اصولوں کی توہین ہے۔ اگر وہ اپنے سینوں میں جھانکیں تو انھیں محسوس ہوگا کہ ایک نئے تزکیۂ نفس کی ضرورت انہیں پکار رہی ہے۔ یہ تزکیۂ نفس ان کے مرجھائے ہوئے یقین کو از سر نو شاداب کر دے سکتا ہے۔ ان کے لئے ایک ہی راستہ ہے کہ وہ ہر جنجال سے آزاد ہو جائیں اور پوری خود اعتمادی کے ساتھ ایک نئی زندگی کا آغاز کریں۔

اکثریت کی غلامی

تقسیم کا ردِ عمل گوناگوں بد مذاقیوں اور حماقتوں کا ایک سیلاب بھی اپنے ساتھ لایا، ان متعدد بد مذاقیوں میں سے ایک بد مذاقی ہندی مسلمانوں کا یہ احساس بھی ہے کہ وہ اکثریت کے غلام ہو گئے۔ یہ احساس ماضی کے احساسِ کم تری کا ہی ایک حصہ ہے۔ یہ نیا نہیں پرانا زخم ہے اور اس وقت تک نہیں بھر سکتا جب تک، ان میں روحانی تبدیلی نہ ہو۔ جب تک اس پر وطن سے محبت اور خود اعتمادی کا مرہم نہ رکھا جائے۔ یہ مرہم کسی طبیب کے پاس نہیں ہے، کسی رہنما کے پاس نہیں ہے۔ یہ ہندو مسلمان شعراء اور ادیبوں کے پاس ہے جنہوں نے ہر نازک موقع پر ٹوٹتے ہوئے اعصاب کو تازہ تر قوت بخشی ہے اور آج بھی اُنہیں کی ایک ایسی جماعت ہے جس کے افراد تعصب سے پاک ہیں، جس میں ہندو، مسلمان، اور سکھ ایک آواز ہو کر انسانیت کی صدا لگاتے ہیں اور مایوس عوام کی ٹوٹی ہوئی ہمت بندھا رہے ہیں، مسلم عوام کے اس زخم کو یہ لوگ ہی بھر سکیں گے جو مسلمانوں کے دلوں میں احساس کم تری نے ڈال دیا ہے۔
ملک ایک خطرناک طوفان کو عبور کرنے کے بعد جس دور میں داخل ہوا وہ کبھی آندھیوں کی آماجگاہ تھا۔ فضا یہاں بھی صاف نہ تھی یہ دور بھی تقسیم کے ردِ عمل کا تختۂ مشق تھا۔ جس کی پوری تصویر پیش کرنا اپنے رستے ہوئے ناسوروں سے خود پردہ اٹھانا ہے میں اس المناک تشریح کے لئے تیار نہیں۔ لیکن تقسیم کے اداکاروں کی عریانی بہرحال انسانوں کے لئے درسِ عبرت بنی رہے گی۔

اس پار کا تو کہنا ہی کیا۔ اس پار والوں نے تو شیشوں کو خود توڑا تھا اور اتحاد کی ہر شکل کے خلاف لڑے تھے لیکن اس پار کی بد مذاقیوں کی نہ جانے کتنی آندھیاں ہماری بلندیوں کو زمین بوس کر گئیں۔ وفاداری کے مطالبات زبان و تمدن کے رجعت پسندانہ انقلابات جداگانہ وحدانیت کے طعنے اور طبقاتی تصادم کے پیدا کرنے کے لئے خاموش ٹھوکے اور ایسے کتنے آوازے بلند ہوئے جن کی گونج آج تک باقی ہے۔

وفاداری کی روح

اصل میں یہ نفرت و غصہ کی آخری قسط تھی جو تقسیم کے کھاتوں سے بر آمد کی۔ یہ آوازے لگانے والے اگر ٹھنڈے دل سے غور کرتے تو آسانی سے اس نتیجے پر پہنچ جاتے کہ ہند کی مذہبی اور طبقاتی نیرنگیوں کے باوجود ایک قوم ایسی طبعًا موجود ہے۔ جسکے اندر تاریخی اور وطنی نیرنگی ہے جسکے بغیر نہ مسلمان وفادار شہری ہو سکتا ہے اور نہ ہندو اور نہ کوئی دین دھرم والا۔ انہی مختلف اجزاء کی نئی ترتیب و تنظیم پر ایک صحت مند ذہنیت رکھنے والی متحدہ قومیت کا انحصار تھا جو وطن عزیز کی صحیح اور وفادار اور محب ہو سکتی تھی لیکن وفاداری کی یہ روح کوئی بہ جبر پیدا ہونے والی کیفیت نہیں۔ وفاداری

اُس گداز طبعی کا نام ہے جسے خلوص و صداقت کا جذبہ انسانی روح میں پرورش کرتا ہے۔ خلوص و صداقت کی یہ کیفیت ہمسایوں کی بے ساختہ محبت اور حکومت کے حسن سلوک سے پیدا ہوتی ہے جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ وطن سے محبت محض ایک داخلی اور روایتی کیفیت ہے وہ لوگ انسان کے اس نفسیاتی راز ... [illegible] واقف ہیں کہ کوئی داخلی کیفیت خارج کے اثرات کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی۔

ایک چھوٹی سی مثال غالباً اس کو واضح کر دے گی۔

(۱) فرض کیجئے اگر کسی ملک میں زید کی دس نسلیں پیدا ہوئیں اور وقت و ماحول کی ہزار ناسازگاریوں کے بعد ان کی داخلی کیفیت (حب الوطن) کبھی عصری حالات سے متاثر نہ ہو سکی تو اس نتیجے کی ذمہ دار ان نسلوں کی قدامت پرستی اور کم شعوری تھی لیکن گیارہویں نسل کے لئے لازمی نہیں کہ وہ نیا شعور اپنے ساتھ نہ لائے۔ وہ محسوس کرتی ہے کہ جس ملک میں وہ بستی ہے جس سوسائٹی میں وہ سانس لیتی ہے اور اس کے افراد جس ملک کے شہری ہیں اُس ملک کے دوسرے بسنے والوں کی حقیقی محبت بھی اُنہیں حاصل ہے یا نہیں!؟ اور ان کا وہ بیگانہ وش تشخص جس کے کس بل پر وہ زندہ تھی وہ بھی محفوظ ہے یا نہیں!؟ اگر اس کا جواب نفی میں ہے تو وہ روحانی رشتہ جو ان کے اور مقدس وطن کے درمیان داخلیت کی بنیاد پر ہے ٹوٹ جائے گا اور اس کے بعد وہ گریز و فرار کے لئے مجبور ہو گی۔ جیسا کہ ہوا۔

ہندی مسلمان اور کلچرل وحدت کا مسئلہ

تقسیم کے بعد ہندی مسلمانوں کی جو پوزیشن ہو جاتی ہے اس پر زیادہ غور کرنے کی ضرورت نہیں، تقسیم کا سیلاب، جداگانہ انتخاب، جداگانہ حقوق اور دو قومی نظریہ اُسے ہر تعلق کو بہا لے گیا۔ اور اب ان کی واضح پوزیشن یہ ہے کہ وہ ہندوستانی قوم کا ایک موثر اور ذی قدر جزو ہیں۔ فرقہ پرستی اور مذہبی بنیادوں پر اب یہاں کسی کو تعمیر قومی کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ جو اس اجتماع میں شریک ہیں اور جو یہاں بستے ہیں، ان کا ایک ہی مقصود ہے اور ایک ہی منزل! ان حقائق کو جانتے ہوئے بھی اک شورِ قیامت بپا ہوا کہ

"مسلمانوں کو چاہیئے وہ خود کو الگ نہ دکھائیں اور کلچر میں ہندوؤں کے ساتھ شامل ہو جائیں"

ادھر یہ مطالبہ، ادھر صرف اک جذبۂ فرار! ـ صرف ایک خوف زدہ رمیدگی!؟ کلچر اور اس سے تعلق رکھنے والے مسائل قومی تعمیر کی ابتدائی منزلوں میں بڑی قیمت رکھتے ہیں۔ حاکمانہ جبر اور بزرگانہ استدلال سے یہ مسائل حل نہیں ہو سکتے۔ ان پر غور کرنے اور نتائج نکالنے کے لئے سکونِ فکر اور مخلصانہ جد و جہد کی ضرورت ہوا کرتی ہے۔ افسوس ان مسائل کو اضطراری حالات میں چھیڑا گیا۔ ایسا کیوں ہوا!؟ مجھے دہرانے کی ضرورت نہیں۔ وہ دماغ بھی جو تمام عمر متحدہ قومیت کا خواب دیکھتے رہے تھے دو قومی نظریہ میں اپنے خواب کی تعبیر ڈھونڈنے لگے یہ ہم میں سے بعض کے لاشعوری تقاضے تھے جنہیں تقسیم کے ردِ عمل نے ناسور کی طرح اُبھار دیا۔

آیئے ذرا اس مسئلہ پر اک نظر ڈالیں اور دیکھیں کہ لوگ کس قدر واقعیت پرست ہیں اور کس قدر جذباتی!؟

کلچر کی تعریف

سیاست کی بازی گرانہ تعبیروں نے "کلچر" جیسے وسیع المعانی لفظ کو مبہم و محدود کر دیا ہے۔ جس چیز کو کلچر کہا جاتا ہے اس کی حقیقت اس سے کہیں زیادہ وسیع ہے۔

جرمنی اور انگریزی زبان میں لفظ کلچر کے معنی "تربیت نفس" کے ہیں اور کلچر کا بنیادی اشاریہ ہے کہ نفس انسانی کو مہذب و بلند کرے۔ تاکہ انسان کا داخلی و خارجی نشو و نما اس طرح ہو سکے کہ کوئی ترکیبی عنصر غیر متوازن نہ رہ جائے۔ نفس انسانی ... کے تزکیہ و اصلاح اور خارجی اظہار کے جتنے ذرائع اور نظام ہو سکتے ہیں وہ تمام ذرائع و نظام "کلچر" سے وابستہ اور اس کی تعریف میں داخل ہیں۔

اس میں کسی قوم کے تمام انفرادی اور اجتماعی اعمال، رہن سہن کے طریق رسم و رواج، معاشی و سیاسی نظام تمام اخلاقی ادارے۔ ممتاز تخلیقی تقاضے۔ جنسی رجحانات، جمالیات نیز موروثی مافوق العادت روایات (مائی تھالوجی) اور نسلی امتیاز و عصبیت کے امتزاج سے مرتب ہونے والے زندگی کے اجتماعی طور طریق بھی شامل ہیں۔

ہندو و مسلم کلچر کی وجہ مشترک

اتنے گوناگوں رنگ اور خطوط ہیں۔ جن سے تمدن کی

کمسل تصویر بنتی ہے۔ ہر تمدن کا ایک محور ہوتا ہے جسکے گرد تمدن
کی قندیل گردش کرتی رہتی ہے۔ ایشیائی تمدن کا مرکزی نقطہ
جس کے چاروں طرف مشرقی کلچر گھومتا رہا اور آج بھی گردش
کر رہا ہے وہ موروثی منفیات ہیں جو "روح" اور اس کی نیرنگیوں
کی حامل ہیں۔ گویا ہندو اور مسلمانوں میں سب سے بڑی وجہِ
مشترک "روح سے تعلق ہے" اور یہ وجہِ مشترک تقسیم کے بعد بھی
فنا نہیں ہوئی ہے۔ نہ صرف ہند کے مسلمان بلکہ پاکستان کے
مسلمانوں اور ہندوؤں کا کلچر بھی ایک ہے۔

ملاحظہ فرمائیے "پاکستان کا کلچر" از عبدالواحد جادہ سماؔ

"ہم میں سے ۹۰ فیصدی ہندو آباؤ اجداد کی اولاد
ہیں! علامہ اقبال کو تو اپنے برہمن النسل ہونے پر فخر تھا۔
کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ ہم پاکستانیوں ہی کے آباؤ اجداد
ایرین کلچر کے جنم داتا تھے۔ ٹیکسلا دار العلوم کے راج تھے
انگکور پرشین امپائر کے معمار تھے۔ گندھارا مکتبِ فن
کے فنکار تھے اور اگر وہ نہیں تھے تو کیا عرب یا
جاپانی ان کے جنم داتا تھے؟"

یاد رہے کہ ہمارے کارناموں نے تاریخ عالم میں
شہرۂ آفاق امتیاز حاصل کیا ہے مگر ہم ہیں کہ آج تک
ان کے وارث بننے سے انکار کرتے رہے اور وہ صرف
اس لئے کہ یہ سب کچھ ہم نے زمانۂ ماقبلِ اسلام
میں حاصل کیا تھا لیکن مصریوں نے اہرام سے انکار
کیا ہے؟ نہ عراقیوں نے دجلہ و فرات کی قدیم تہذیب
کے ورثہ سے۔ ایرانیوں نے تو "اہرمن و یزدان" تک
کو اسلام کا "شیطان و خدا" بنا لیا ہے۔ اور خود عربوں
نے اسلام کے بعد بھی کعبہ کا نام کعبہ ہی رہنے دیا
اور غیر عرب کو عجمی کہنا بھی ترک نہ کیا۔ لیکن نہ معلوم
کیوں ہم ہی نے اپنے آپ کو اسلام کا "صدقہ" بنا
کر اپنی ہزار ہا سال کے مایۂ ناز ماضی اور تخلیقی ورثہ
کو دریا برد کر دیا ہے۔ اگر اسلام کا کلچری تقاضا یہی ہے
جو میں سمجھا ہوں کہ نہیں ہے۔ تو یقیناً "کلچری بین الاسلامیت"
کے معنی ہوں گے۔ ایسی بزم جہاں ہر کاسہ خالی ہو۔!؟
اب وقت آ گیا ہے کہ مقفلِ تاریخ کے اس مضحکہ خیز تعوذ
سے ہم چھٹکارا پائیں اور اپنی ٹھکرائی ہوئی تاریخ کو
جو دیگر اقوام کے لئے باعث ہزار رشک رہ چکی ہے اور
جن کے تخلیقی کارنامے آج بھی تاریخ عالم کا سنہری
باب ہیں پھر اپنے سینے سے لگا لیں۔

جو قوم اپنے قدیم ماضی کے تسلسل اور اس کے ساتھ
اپنے احساس فخر کو کھو بیٹھتی ہے وہ قوم اپنے مستقبل
کے تعین اور اس کے اعتماد کو بھی ضائع کر دیتی ہے۔

تو گویا کلچر کی ایک اور بنیادی قدر یہ ہوئی کہ قطع نظر اس سے کہ فلاں
یا فلاں تاریخی دور کے کارنامے کس مذہب کا کلمہ پڑھ کر سر انجام
دیئے گئے۔ ہر کلچری وحدت کے لئے ضروری ہے کہ اپنے قیام
ماضی سے ذہنی تسلسل قائم کرے اور جتنا آسے اپنائے ورنہ
کلچر میں تمکنت پیدا نہیں ہو سکتی اور اس کی ارتقائی نوعیت بھی
ختم ہو جاتی ہے"

مسلمانوں کی جداگانہ وحدت

اور اگر مسلمانوں کے کلچر کی ایک علیحدہ جزوی شکل بھی ہے
اور وہ اس سے روحانی طور پر وابستہ رہنا چاہتے ہیں تو ایک
لادینی جمہوری ریاست میں انہیں اس کی آزادی اسی طرح
ملنی چاہیئے جس طرح عیسائیوں، سکھوں، اور دوسری
ہندوستانی اقلیتوں کو مل سکتی ہے۔ ہر چند کہ میں اس کا
قائل نہیں ہوں کہ مسلمانوں کی کوئی الگ تہذیبی زندگی ہے
یا ہونی چاہیئے۔ اس مسئلہ پر میں آگے چل کر بتاؤں گا کہ وہ
کونسا آدرش ہے جس کے سانچے میں ہم ایک تازہ دم قومیت
ڈھال سکتے ہیں اور اس کے لئے کس قسم کے قدیم و جدید سر و سامان
کی ضرورت ہے۔

"کلچر" کی بحث اگر یہیں تک محدود رہتی تو درست تھا
لیکن بعض نے "زبان ......" کو کلچر کی بنیاد قرار دیدیا۔
ایک صاحب کا خیال ہے کہ "اردو زبان کی بنا پر مسلمان خود
کو جداگانہ وحدانیت سمجھنے لگے ہیں مسلمانوں کو پہلا کام یہ
کرنا ہوگا کہ وہ اردو سے الفت کرنی چھوڑ دیں"۔ (۱)
آگے چل کر انہیں صاحب نے فرمایا

(۲) "اردو زبان ہندو مسلمانوں میں رابطہ و خیال کے
تبادل میں ایک آہنی دیوار کی طرح حائل ہے" اسی ذیل میں
انھوں نے چین کی لسانی وحدت کا تذکرہ کیا تھا جس کا مقصود یہ

تھا کہ چین کے مسلمانوں کی زبان چینی ہے۔ اسی طرح ہندی مسلمانوں کی زبان اگر ہندی ہو تو غلط نہیں ہے۔ (۳)

آئیے اب ان تینوں باتوں کے ذیل میں اختصار کے ساتھ زبان کے مسئلہ پر اجتماعی نقطۂ نظر سے یہ غور کریں کہ اس باب میں عام رائے کیا ہے۔ مسلمان کیا چاہتے ہیں؟ اور اردو کی صحیح پوزیشن کیا ہے۔ ۶۲ برس سے کانگریس کا کیا موقف رہا ہے اور اب ہند کی جمہوری دستور ساز اسمبلی کو اس باب میں کیا فیصلہ کرنا چاہیے۔

(۱) جہاں تک مسلمانوں کی "جداگانہ وحدانیت" کا سوال ہے اس کا تصور ہی غلط ہے اور اگر یہ کوئی جداگانہ وحدانیت ہے تو اس میں صرف مسلمان ہی نہیں، ہندو، پارسی، سکھ، عیسائی اور دوسری قومیں بھی شامل ہیں جو اردو زبان بولتی اور لکھتی ہیں۔ اس میں ہر قوم کے جہازی اور مل مزدور بھی شریک ہیں اور مہاتما گاندھی اور سر تیج بہادر سپرو مرحوم بھی، اس میں تارا چند بھی شامل ہیں اور جواہر لال جی بھی۔ اور وہ تمام ہندو مسلم سکھ پارسی اور دوسری قوموں کے عوام بھی جو صوبہ جاتی زبانوں کے ساتھ اردو زبان بولتے ہیں۔

(۲) متحدہ قومیت کا تصور محض سیاست نے پیدا نہیں کیا۔ اس کی داغ بیل اسی وقت پڑ گئی تھی جب مسلمان ہند میں آئے اور ان کی نئی نسلوں کا خمیر یہاں کی مقدس مٹی سے گندھنے لگا۔ ایرانی اور ہندی فن تعمیر کے میل نے ایک نئے حسن کو اجاگر کیا۔ ایرانی مصوری اور موسیقی نے ہندی چتر کاری اور سنگیت کے گلے میں باہیں ڈالیں اور ایرانی گل بوٹے اجنٹا کی نقاشی سے بغلگیر ہوئے۔ اس ملن کا حسین و جمیل مظہر تاج محل ہے۔ یہ تمدنی ہم آہنگی کی سب سے بڑی مثال ہے۔ آریہ نسل ایرانیوں کو جو نسلی تعلق آریہ ورت اور اس کے کلچر سے تھا وہ ایک نئے حسن کی تخلیق کا سبب بنا۔

اور یہ گھلاؤ اور یہ ملاؤ بڑھتا ہی چلا گیا۔ یہاں تک کہ انھوں نے نسلی زبان بھی بھلا دی اور ایک نئی زبان کو قبول کر لیا جو نسلی اشتراک و اتحاد کے امتزاجی عمل سے پیدا ہوئی اور اردو اس عظیم الشان اجتماع کے قدرتی اتحاد کا نتیجہ ہے۔ تقریباً ساڑھے تین سو برس کے عرصہ میں اپنی فطری جاذبیت و قبولیت نے اسے ہندو مسلم عوام کی زبان بنا دیا ہے۔

لسانیات کے ماہر جانتے ہیں کہ اردو زبان میں ۸۰ فیصدی سنسکرت کے الفاظ کسی نہ کسی صورت میں موجود ہیں اور یہ تمام ہندوستان میں کسی نہ کسی شکل میں بولی جاتی ہے۔ آپ اسے اردو کہئے یا ہندی، ہندوستانی کہئے یا اور کوئی چوتھا نام رکھ لیجئے۔ لیکن یہی ایک ایسا رشتۂ اتحاد ہے جو ساری قوموں کو ملاتا ہے۔ اور جسے آپ ملک کی قومی زبان بنا سکتے ہیں۔

اردو صرف بولی نہیں ہے۔ جسے نظر انداز کیا جا سکے اردو کی بنیاد پر خود کو مسلمان "جداگانہ وحدانیت" تصور کرنے کا گناہ کبھی نہیں کر سکتے۔ اردو ادب کی قدیم و جدید تاریخ ہندو انشا پردازوں، افسانہ نگاروں اور شعرا کی ذہنی اور دماغی کاوش سے شاندار بنی ہے۔ رتن ناتھ سرشار نسیم اور چکبست جیسے عظیم الشان شاعر ...... اردو نے پیدا کئے اور عین اس وقت جب اس کی کشتی گرداب میں ہے، اس کے ناخدا رگھوپتی سہائے فراق آنند نرائن ملا۔ کرشن چندر وشوامتر عادل اوپندر ناتھ اشک راجندر سنگھ بیدی۔ رامانند ساگر اور ہزاروں ہندو سکھ مسلمان شعرا اور افسانہ نگار ہیں۔ اردو زبان کا ایک ترقی پسند اعلیٰ ادب ہے اقبال اور جوش جیسے عظیم المرتبت شاعر اور ابوالکلام آزاد جیسے حکیم و ادیب اس نے پیدا کئے ہیں۔

اس کی بزم میں سیاسی تنگدلی گناہ اور تہذیبی امتیاز پاپ ہے۔ اس کے آسمان پر جو ستارے چمک رہے ہیں ان سے انسانیت منور ہے۔ اور ان کے دل انسانی وحدت کی جوت سے روشن ہیں۔

اردو سے ترک محبت کا مطالبہ ایک تہذیبی جبر ہے۔ یہ ایسا ہی ہے کہ جیسے مہاراشٹر، گجرات اور بنگال کے ہندوؤں کو ان کے زبان و ادب کے ساتھ محبت کرنے سے روکا جائے۔ ان سے کہا جائے کہ وہ ٹیگور، نذرالاسلام، بنکم چٹرجی اور شیر خبردار اور مناذی جیسے شاعروں اور ادیبوں کو اپنے دل سے فراموش کر دیں!؟

(۳) اردو کو "آہنی دیوار" کہنا بھی تاریخی طور پر غلط ہے، ایک کھلا ہوا ظلم ہے، اردو زبان نے فرقہ پرستی کے پہاڑ کو کاٹ کر متحدہ قومیت کا ایک گنگا جمنی سنگم بنایا اور تمام صوبوں کے عوام کو ایک نئی بولی کی لڑیوں میں پرو دیا ہے۔ اردو نے مذہب اور فرقہ داری کے دبیز و دوزنی حجابات کو چاک کرنے میں نمایاں امداد کی ہے اس کی محبت سے دست بردار ہونے کی دستاویز لکھوانا

ہرگز وطن دوستی نہیں۔

لسانی وحدت اور قومیت متحدہ

(۳) چین کی لسانی وحدت کی مثال ہندوستان پر صادق نہیں آتی۔ ہندوستان ایک عظیم الشان ملک ہے، وہ کئی تہذیبوں اور متعدد مذاہب کا سرچشمہ ہے۔ وہ یک ساز ہزار پردہ ہے جس سے لاکھوں نغمے پھوٹتے ہیں۔ وہ ایک لازوال نغمہ ہے جس میں سینکڑوں لے باہم دگر مل کر ایک مخصوص رمنیئر زیر و بم پیدا کرتی ہیں۔

ملک کے مختلف حصوں میں مختلف بولیاں بولی جاتی ہیں مگر اردو ایک ایسی وسیع و مشترک زبان ہے جو ملک کے ہر قریب و بعید حصے میں عوام کے اظہار و بیان کا ذریعہ بنتی ہے۔ یہی دہلی میں بولی جاتی ہے یہی مشرقی پنجاب میں اور اسی زبان کا دائرۂ اثر مغربی و مشرقی پنجاب سندھ و سرحد، یوپی و بہار اور سی پی اور برار و دکن کو گھیرے ہوئے ہے۔

بنگال، مدراس اور بمبئی بھی اردو سے اثر لئے بغیر نہیں ہے بمبئی ایک بین الاقوامی شہر ہے لیکن دہلی اور لکھنؤ کے بعد آج اسے اردو کا مرکز کہا جاسکتا ہے۔

ان مقامات پر اردو صرف بولی ہی کی حیثیت نہیں رکھتی بلکہ ان مقامات پر اس نے اپنا تخلیقی پرتو ڈالا ہے ملک کے ان حصوں نے اردو زبان کے بہترین شاعر اور ادیب پیدا کئے ہیں۔ اور یہاں سے اردو کے سینکڑوں اخبارات و رسائل شائع ہوتے ہیں بمبئی اور ہندوستان کے دوسرے حصوں میں عظیم الشان پبلشنگ ہاؤس ہیں جہاں سے بڑی تعداد میں کتابیں شائع ہوتی ہیں اور جن کے مالک ہندو ہیں۔ اردو کی وسعت اور دلکشی و تاثیر کا زندہ ثبوت وہ مسلمان ہندو اور سکھ ادیب و شاعر ہیں جن کی ذہنی اور روحانی کاوشوں نے قومی تعمیر میں سیاست دانوں سے بڑھ کر حصہ لیا ہے۔ نہ صرف بمبئی شہر بلکہ گجرات کا وسیع علاقہ اردو شعراء اور ادباء کا میدانِ عمل رہا ہے اور آج بھی ہے۔

اردو کی قوتِ جاذبہ

اردو زبان میں پذیرائی اور جذب کرنے کی ایک طبعی قوت ہے یہ ہر اجنبی عنصر کو اپنے وجود میں سمو لیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس میں گھلے ملے ۸۰ فیصدی سنسکرت کے شبد بھی سنسکرت کے لفظ نہیں معلوم ہوتے۔ سامراج، سماج، مدرا، اندولن سنسکرتی کرانتی جاگرتی اور دسیوں نئے الفاظ آج اردو ہی کے الفاظ معلوم ہوتے ہیں۔ یہ وہ دلکش خصوصیات اور فطری اہلیتیں ہیں جن پر رتن ناتھ سرشار اور چکبست لوٹ ہوئے اور متاخر ہندو شعراء و ادباء کی ایک پوری نسل کے نام اس کی فہرست میں نظر آتے ہیں۔ معترضین کو دلائل کی روشنی میں یہ غور کرنا چاہئے کہ آج کل تمام ترقی پسند ہندو شعرا نے اردو ہی کو کیوں اپنے خیالات و محسوسات کے اظہار کا ذریعہ قرار دیا ہے۔؟

سیاسی جدوجہد کا منتہا "کلچر"

یہ یاد رکھنا چاہئے کہ تمام تر سیاسی جدوجہد (جس میں اقتصادی ماحول بھی شامل ہے) کا منتہا "کلچر" ہے سیاست تمدن کا ایک شعبہ ہے جس کی مساعی بھی تمدن کی حفاظت و ترقی پر منتج ہوتی ہیں۔ سیاسی مسائل کو کبھی تمدنی مسائل پر اہمیت نہیں دی جاتی۔

آزادی تو دنیا کے بعض حصوں میں غیر متمدن قبائل کو بھی حاصل ہے مگر آزادی ہی محض آزادی کا حاصل نہیں، آزادی کا مقصود کلچر اور کلچرل خودمختاری ہے۔ سیاسی جدوجہد کے پُر از مصائب میدانوں کو طے کرنے کے بعد اب ہم کلچر کی جنت لینے کے لئے بڑھ رہے ہیں۔ تہذیب کی اس نئی جنت کو ہندو جنت اور مسلم جنت بنانے کا گناہ ہمیں نہیں کرنا چاہئے۔ ہمارا ستارۂ اقبال اب تاریکی کے جال سے آزاد ہو رہا ہے۔ اس کی ابھرتی جوت سنسار پر پڑ رہی ہے۔ دنیا ہمارے ایک ایک فعل کو بغور دیکھ رہی ہے، اور ایشیا کی مایوس و مجبور نگاہیں ہماری طرف اٹھ رہی ہیں۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم اس آدرش کو پیش نظر رکھیں جو ثقافتی رواداری اور ترقی پسندی سے مرکب کیا گیا تھا۔ ماضی نے جو امانت ہمارے سپرد کی ہے ہمیں اسے زمانے کی حاسدانہ نگاہوں سے بھی بچانا ہے اور اپنی تنگ نظریوں سے بھی۔ اور کبھی نہ بھولنا چاہئے کہ آج کے ہندو مسلمانوں کا کلچر ایک ہے۔ زبان ایک ہے وطن ایک ہے اور وطن کے وقار کی منزل بھی ایک ہے۔ اگرچہ تاریخ نے مختلف تمدنوں کے دھارے ملا کر یہ ایک دھارا بنا لیا ہے۔ اس سے

جو شاخیں پھوٹتی ہیں اُن کے بہاؤ کے کچھ منفرد رُخ بھی ہیں۔ ان منفرد رخوں کے بند باندھنا ترقی اور تخلیق کو روکنا ہے۔ یعنی کسی قوم کی منفرد کلچرل خصوصیات کو بہ جبر ترک کرانے کا ظلم بھی اصل میں جابرانہ تبدیلیٔ مذہب ہی کے خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔

صوبہ جاتی زبانوں کی بقا اور ان کے ادب کی ترقی

میں تو ہمہ گیر اردو ہی نہیں، صوبہ جاتی زبانوں کی بقا اور ترقی کا بھی قائل ہوں۔ ہمارے ملک کی جتنی تہذیبی خصوصیات ہیں ان کے پنپنے کی پوری آزادی ہونی چاہئے۔ بنگالی، مرہٹی، گجراتی، تامل، تلیگو، ملیالم، کنیڑی وغیرہ اپنی مستقل شاعری و ادب رکھتی ہیں۔ اور انہیں نہیں مٹایا جا سکتا تو اردو زبان جو سنسکرت پر مبنی ہے اُسے کیوں کر مٹایا جا سکتا ہے

ایک نئی تحریک

ڈاکٹر کاٹجو گورنر مغربی بنگال نے اپنی ایک تازہ تقریر میں قومی زبان کے مسئلہ پر اظہار خیال کرتے ہوئے اپنے اس عقیدہ کو دہرایا ہے کہ قومی زبان سنسکرت ہونی چاہئے۔

"علاقوں کی تمام زبانوں کا سرچشمہ مختلف حد تک اور بعض کا بڑی حد تک سنسکرت ہی ہے میری رائے میں یونیورسٹیوں میں سنسکرت کی تعلیم سے نہ صرف علاقائی زبانوں کو بے حد ترقی اور وسعت حاصل ہوگی بلکہ ایک الجھے ہوئے مسئلہ کا ایک متفقہ حل بھی اچھی طرح مل جائے گا۔

مجھے کوئی شبہ نہیں ہے کہ اگر اسکولوں اور کالجوں میں سنسکرت کی تعلیم کو وسعت دینے کے لئے کل ہند پیمانے پر سنجیدگی سے کوشش کریں تو مختلف علاقائی زبانوں پر سنسکرت کا اثر اس قدر غالب ہو جائیگا کہ بطور خود ہی ایک قومی زبان پیدا ہو جائے گی جس پر سب متفق ہونگے

ہندی اور خاص کر اردو کی طرف اشارہ:—

مجھے معلوم ہوا ہے کہ جب ہر شعبے میں علاقائی زبانوں کے حق میں جذبات بھڑک رہے ہیں یہ اُمید موہوم ہے کہ کسی ایک علاقہ کی زبان کو ہندوستان کی قومی زبان کی حیثیت سے قبول کر لیا جائے گا۔

(خطبۂ صدارت جلسۂ تقسیم اسناد ناگپور یونیورسٹی، ۱۸ر جنوری سنہ ۶۹ء)

تاریخ ماضی کی طرف جست نہیں لگا سکتی

یہ ایک نئی صدا ہے اور واحد ہے لیکن اکثریت کے قدامت پرست حلقوں کے لاشعوری تقاضوں کو ضرور اُبھارتی ہے۔ یہ ایسی صدا ہے جو ان ترقی پذیر آدرشوں کی بلند نوائی سے ٹکراتی ہے جو صدیوں کی جاں فشانیوں کا نتیجہ ہیں یہ خیال ہمارے تمام متحدہ نظام ہائے عمل کو صفحۂ سادہ بنا دیتا اور تصورات کو اور بھی مبہم و پیچیدہ کر دیتا ہے جنہیں سمجھنے سے ذہن قاصر ہیں۔ یہ ماضی پرستی کا شاخسانہ ہے جس کی جگہ ہمارے ترقی پسند حال اور تیزی سے آنے والے مستقبل کے تصویر کدے میں نہیں ہے۔

سنسکرت جو علماء اور پیشواؤں کی زبان رہی کبھی پراچین ہند میں عوام کی زبان نہ بن سکی، آج اس کے قومی زبان بننے کے کیا امکانات ہو سکتے ہیں؟ علاقائی زبانوں میں اس کے جتنے عناصر ہیں ان کی ہیئت مختلف ہو چکی ہے اور تمام علاقائی زبانیں سنسکرت پر مبنی بھی نہیں ہیں۔ اس لئے وہ تعلیم کے بعد بھی خالص سنسکرت میں تبدیل نہیں ہو سکتیں۔ ہاں ان کو مٹا دینا مقصود ہے تو یہ ایک جداگانہ بات ہے۔

موجودہ ارتقائی دور میں جب سماج اپنے قومی دائرہ کو توڑ کر بین الاقوامی حدود تک وسیع ہو رہا ہے۔ پرانی تہذیب کے خول پگھل چکے ہیں اور ایک نئی عالمگیر تہذیب کے خوبصورت چہرے ڈھل رہے ہیں، ہندوستان کو رجعت کے اختیار کرنے میں نقصان رہے گا۔ اس کی پہلی ضرورت ارتقاء سے ہم دوش رہنا ہے۔ ماضی تو ماضی وہ اپنے پا بہ رکاب حال پر بھی قناعت نہیں کر سکتا۔

یہ ارتقائی تقاضوں کے خلاف ہوگا کہ ہزار سال کی قدیم یا چودہ سو برس کی پرانی تہذیبوں کا احیاء کیا جائے سچ پوچھئے تو یہ انداز فکر ہی غلط ہے اگر ہندوستان و پاکستان کے چالیس کروڑ ہندو اور مسلمان متحد ہو کر اپنی تمام کوششوں کو بروئے کار لے آئیں تب بھی جو تاریخ بننے والی ہے ماضی کی طرف جست نہیں لگا سکتی۔

ارتقا کا تدریجی عمل

ہمارا شاندار ملک بے گنتی تہذیبی خزانوں کا مالک ہے سینکڑوں فلسفے اس کی مٹی میں دبے ہوئے ہیں اور ہم ثقافتی حیثیت میں دنیا کی کسی مہذب اور ترقی یافتہ قوم سے پیچھے نہیں ہیں جتنے عظیم فلسفوں کی آغوش میں ہماری روح نے تربیت پائی ہے۔ ان کے تقاضے بھی عظیم ہیں۔ اگر ان تقاضوں کو ہمیں پورا کرنا ہے تو ہمیں نہایت وسیع تہذیبی زاویۂ نگاہ قائم کرنا ہوگا۔

کلچر کی ترتیب یا تمدن کا احیاء ایک دو دن کی انسانی کوششوں کا نتیجہ نہیں ہوا کرتا۔ ارتقا کا تدریجی عمل صدیوں میں کلچر کو ایک مستقل ترتیب دیتا ہے۔ اسی طرح کسی تمدن کا احیاء ترتیب سے بھی زیادہ مشکل فریضہ ہے۔ کسی قدیم تمدن کو از سر نو بحالہ زندہ کرنے میں ہم رجعت کے جال میں گرفتار ہو سکتے ہیں یا ندرتی پذیر فضاؤں میں پرواز سے محروم ہو کر حال و مستقبل کے رشتے سے کٹ جاتے ہیں۔ چونکہ ثقافتی ترتیب میں اقتصادی انقلاب بھی بہت کچھ کام کرتا ہے۔ اس لئے پرانے اقتصادی نظام کی قبول کی ہوئی ثقافت اس انقلابی اور اضطرابی دور میں جبکہ ہر قسم کی جاگیردارانہ اور سرمایہ دارانہ نظام تل پٹ ہو رہا ہے رائج کرنا اس زمانے کی قوتوں کو شکست دینا ہے

ہم ہندوستان والوں کو یہی زیبا ہے کہ کلچر اور ثقافت کی راہوں میں ہم جو بھی قدم اٹھائیں اپنی استطاعتوں کو دیکھ بھال کر اٹھائیں۔ ایسا نہ ہو کہ زمانے کی ترقی پذیر ضربیں قدم اٹھانے سے پہلے تاب رفتار کو ختم کر دیں۔

قانون کے ذریعہ کلچر کی ترتیب

لہٰذا کسی پرانے فرسودہ تمدن کا مطلق احیاء تو ممکن ہی نہیں زندگی کا ارتقائی عمل قدم قدم پر سد راہ بنے گا اور ہم دھندلے ماضی کا روشن حال سے پیوند نہیں لگا سکیں گے۔ میرے نزدیک کسی .... نئی ثقافت کی تخلیق یا قدیم کلچر کا احیاء حکمران قانون کے زور سے ممکن نہیں ہے۔ دفتریت اور اسکا خودساز قانون ہمیشہ سے ایک ایسا جال رہا ہے کہ بڑی سے بڑی خلاق، اور ضابطہ پسند شخصیت بھی بغیر پھنسے نہیں رہ سکتی اس لئے سرزمین ہند کی صوبہ جاتی اور مرکزی حکومتوں کا اس خیال میں مگن رہنا کہ وطن کے بہترین دماغوں سے بے پروا ہو کر محض حکمران نظام کے بل پر وہ کوئی معجزہ دکھا سکتی ہیں۔ خوش فہمی سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔

میرے خیال میں کلچر سے تعلق رکھنے والے نئے فعال، پرزے فٹ کئے بغیر وہ پرانی مشین کو نہیں چلا سکتے۔ جب تک انہیں ملک کے بہترین مفکر، شعراء، انشاء پرداز، سائنس داں، فلسفی، یعنی علوم و فنون کے ماہرین کا تعاون حاصل نہ ہو۔

غلامی کے ورثہ میں جو قانون ہمیں ملا ہے وہ قانون ہماری سماجی و تمدنی ضرورتوں کی کفالت نہیں کرتا۔ لیکن اس کے علاوہ بھی۔ اگر کوئی دوسرا قانون آیا تو ظاہر ہے کہ اول تو وہ الہامی نہیں ہو سکتا اور جمہوری قانون کی حیثیت میں قطعی تو ہو ہی نہیں سکتا۔ بہرحال قانون کی کوئی بھی نوعیت ہو۔ اس کے لئے عوام کی قبولیت شرط ہے۔

(میں اس مضمون کے تسلسل کو توڑ کر "قانون و اعتقاد" کے بیان پر پہلی قسط کو ختم کرتا ہوں)

قانون اور اعتقاد

انسانی سماج میں "قانون" اور "اعتقاد" ہی دو ایسے ذریعہ ہیں جن پر ضابطۂ تمدن کا دارومدار ہے۔ قانون کی ایک مادی اور اعتقاد کی ایک روحانی قدر ہے قانون کے ذریعہ عوام کی اجتماعی زندگی اور اس سے تعلق رکھنے والے مسئلوں کو حل کیا جاتا ہے ہر سچے شہری کا فرض ہے کہ قانون کا احترام کرے جو اس نے بنایا ہے اور اس کے لئے بنا ہے۔ لیکن یہ یاد رکھنا چاہئے کہ قانون روایتی طور پر ایک جبر کی کیفیت بھی اپنے اندر پوشیدہ رکھتا ہے۔ عوام قانون کا احترام کرتے ہیں۔ محبت نہیں کرتے۔ لاقانونیت سے اس لئے بچتے ہیں کہ وہ انہیں پیس دے گی۔ اس لئے نہیں بچتے کہ وہ قانون کو اپنی سوشل زندگی کی میزان خیر و شر سمجھتے ہیں!؟

قانون اور انسانی فطرت کے درمیانی خلا میں قانون شکن فطرت آسودہ رہتی ہے۔ جب تک یہ خلا مضبوط "اعتقاد" کے دارالامن میں تبدیل نہ ہو جائے۔ سماج امن و راحت سے محروم رہے گا۔ جب تک قانون پر عوام کا اعتقاد نہ ہو۔ قانون عوام کے دلوں میں پیوست نہ ہو جائے کوئی حکومتی ادارہ اپنے فرائض ادا نہیں کر سکتا اور ادا کرے گا تو ان کی تکمیل جبر کے بغیر نہ ہو سکے گی۔ اس قسم کی کامیابی قطعی عارضی ہوگی۔ لامحالہ

قانون کے نفاذ و اجراء پر نظرِ ثانی کرنی پڑے گی اور از سرِ نو تعمیر کی بنیادی اینٹ ہی کو درست کرنا ہوگا۔

تعمیر کی بنیادی اینٹ

تعمیرِ قانون کی بنیادی اینٹ یہ ہے کہ قانون پر عوام کا مضبوط اعتقاد ہو۔ اور یہ اعتقاد قانون کے ڈنڈے سے پیدا نہیں کیا جاسکتا۔ وہ قانون بنانے اور قانون کا نفاذ کرنے والے برسرِ اقتدار جمہوری اداروں کے اُس احساس سے پیدا ہوگا کہ عوام ان کے لئے نہیں، وہ عوام کے لئے ہیں، "قانون کے لئے عوام نہیں، عوام کیلئے قانون ہے۔ انہیں عوام میں اس طرح ممتاز نہیں ہونا چاہیئے کہ وہ حاکم ہیں، اس طرح نمایاں ہونا چاہیئے کہ وہ عوام کی خدمت، امن و راحت اور تعمیر و ترقی کے ذمہ دار ہیں۔ ان کی ذمہ داریوں کے لاتعداد شعبے ہوں گے اور ہر شعبے میں قانون کی حفاظت "قانون سے نہیں اس اعتقاد کے ذریعہ کرنی ہوگی جو عوام کے داخلی و خارجی جوہر قبول کا نتیجہ ہو۔ نتیجہ اُسی وقت برآمد ہوسکتا ہے جب کسی ملک کے جمہوری ادارے اخلاقی معلّم کے فرائض بھی ادا کریں۔ اور ان زنجیروں سے محفوظ رہیں جو انہیں دفتری اقتدار کے دام میں جکڑ سکتی ہیں۔

ایک ایک گوشہ میں انہیں بے شعوری اور جہل کے جراثیم ہلاک کرنے کے لئے علم کا آبِ حیات لے کر جانا پڑے گا۔ انسانیت، حب الوطنی، وفاداری، حقِ ہمسائگی۔ عوام و حکومت کے تعلقات۔ شہریت کے فرائض، مذہب، مختلف فرقوں کے باہمی ربط و تعلق، فرقہ پرستی، غلط مذہبیت ذہنی غلامی، رسوم پرستی، جہل و تاریکی، غداری تمدنی اقدار کا تعارف، تحفظ تبدّل اور تعیّن اور اسی قسم کے دوسرے مسائل کا حل محض قانون کی گرہ میں نہیں "اعتقاد" کی مٹھی میں ہے۔

شدید ہنگامی ضرورتوں سے قطعِ نظر میرے نزدیک فرقہ پرستی اور ایسی ہی خطرناک تحریکوں کو پولس اور فوج کے ذریعہ دبا نا بھی کامیابی کا ایک عارضی و سطحی طریقہ ہے۔ قانون کے ذریعہ سیاسی و سماجی بیماریاں جڑ سے دور نہیں ہوسکتیں جب تک ان کے مٹانے کی کوشش قانون کی حدود سے باہر بھی نہ کی جائے جب تک فرقہ پرستی کے خلاف عوام کو تعلیم نہ دی جائے تاریخ اور مذہب کا صحیح تجزیہ کرکے انہیں فرقہ پرستی کی سمیّت سے واقف نہ کرایا جائے۔ اُس کا زہر نہیں مر سکتا۔

قانون گمراہ عوام کو گرفتار کرکے جیل میں ڈال سکتا ہے لیکن ان کے غلط اور مجرمانہ افعال سے باز نہیں رکھ سکتا۔ قانون سزا دیتا ہے۔ اصلاح نہیں کرتا۔

سنگھی تحریک یا اسی قسم کی دوسری تخریبی تحریکات کو موثر اور پائیدار ادب کے ذریعہ عوام کے ذہنوں سے نکالنا ہوگا۔

اسی طرح میری آرزو ہے کہ ہندی مسلمانوں اور ان کی حکومت کے درمیان سے قانون کی ذات ہٹ جائے۔ اور اس کی جگہ اعتقاد لے لے!

اس حقیقت کو کبھی فراموش نہ کرنا چاہیئے کہ حاکمانہ غرور اور دفتری پندار، محکومیت اور بے چارگی سے پیدا ہوتا ہے۔ جمہوری ملک کے عوام نہ محکوم ہوتے ہیں اور نہ بے چارہ۔ یہ حکومت گر اور قانون ساز ہوتے ہیں۔ جبرِ قانون کا جادو ان پر نہ چلے گا ان کے تو قومی اور وطنی اعتقاد کو بیدار کرنا ہوگا۔ ورنہ پرانے اور نئے حاکموں میں کیا امتیاز رہے گا۔ اصل میں یہ تصور ہی غلط ہے کہ پرانے باغی بامِ عروج پر پہنچ گئے ہیں۔ یہ تصور زہرِ قاتل ہے اور ان کی عمر بھر کی قربانیوں کو ختم کر دیتا ہے۔

تاریخ میں باغی کی جاذبیت اسی وقت قائم رہ سکی ہے جب کہ باغی نے حاکم ہو کر تعمیری مسائل کے متعلق اپنا باغیانہ زاویۂ نگاہ باقی رکھا ہے۔ کیونکہ باغی محض حاکم بننے کے لئے باغی نہیں ہوتا، وہ تو پورے نظام سے بغاوت کرتا ہے اور جب تک پورا نظام نہ تبدیل ہو جائے وہ باغی ہی رہتا ہے۔ اور بلاشبہ جب تک فرسودہ و کہنہ نظام کی جگہ نیا اور توانا نظام نہ لے لے اُسے باغی ہی رہنا چاہیئے۔

اگر اُس نے نئی حیثیت سے پیدا شدہ تغافل کی جھونک میں اپنی باغیانہ جاذبیت کو خیرباد کہہ دیا تو پھر اُس کی ذات میں رہ کیا جائے گا — !؟ دفتر کے چلانے والے تو انسانوں کے انبوہ میں پیدا ہوتے ہی رہتے ہیں لیکن باغی کی تخریبی فطرت میں بناؤ کا جو جذبہ پوشیدہ ہے اصل دولت تو وہ تعمیری جذبہ ہے اور وہ صدیوں کے بعد کسی وجود میں اُبھرتا ہے۔

"عوام" جو ہمیشہ اس کا معمول رہے ہیں، جنہیں اُس نے بغاوت کے انداز سکھائے ہیں اُسے پہچانتے ہیں ان کے نفسیاتی عمل اور ردِّ عمل سے آنکھ بند کرنا باغیانہ دانشوری کے خلاف ہے۔ حاکمانہ تیور عوام اور حکّام کے درمیان ایک خطِ فاصل کھینچ دیتے ہیں اور ان کے مزاجوں میں خشونت

بے تعلقی پیدا کرتے ہیں۔

پھر ایک دوسری حقیقت بھی فراموش نہ کرنی چاہئے کہ گذشتہ نصف صدی سے زیادہ انھیں ہمیشہ اجنبی حکام کے خلاف تعلیم دی گئی ہے۔ اس تعلیم کے اثرات سے وہ ابھی آزاد نہیں ہوئے ہیں۔ یعنی اجنبی اور جانے پہچانے حکام میں اگر کوئی نمایاں وجہِ امتیاز ان کو دکھائی نہ دی تو وہ اور بھی ہاتھ سے نکل جائینگے۔

یہ ایک کمزور خیال ہے کہ حاکمانہ تیور شخصیت کے خال و خد میں نئی دلکشی پیدا کرنے کا سبب بنتے ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ اس نئی دلکشی کو بے رونق عوام کی عقیدت و محبت سے کیا تعلق!؟ غریب کے ہونٹوں کی موٹی موٹی پپڑیوں اور حاکمانہ تیوروں کے مابین کوئی نقشِ موانست نظر نہیں آتا۔!؟

البتہ اگر ہے تو ایک مضحکہ انگیز عدمِ توازن! ــــ ابنِ مسعود

خطوط سے کسی آزاد اور عظیم الشان قوم کا باجبروت اور حسین چہرہ ہرگز نہیں بن سکتا۔

اس چہرہ کو بنانے کیلئے فطری اور اکتسابی تمام تر قوتوں کو کام میں لانا ہوگا۔ تمام داخلی و خارجی توانائیاں خرچ کرنی ہوں گی۔ دل کے تازہ و شاداب خون سے اس میں رنگ بھرنے پڑیں گے۔ یعنی اپنی روح اس چہرہ کے خطوط میں حل کر دینی ہوگی ــــ !؟

معتوب کے چہرہ کی تمام رونق فنا کی سیاہی میں تبدیل ہوگی۔ تب جا کر اس چہرہ پر نور مسکرائیگا

(باقی)

ارتقاء

زندگی اس محبوبۂ ہزار شیوہ کے مانند ہے جو ہر نفس ایک نئے جمال میں جلوہ گر ہو، نئے روپ میں ظاہر ہو، نئے لباس میں مسکرائے۔

آج دُنیا تبدیل ہو رہی ہے، گویا زندگی، گویا وہ محبوبۂ ہزار شیوہ اُن ہولناک حادثوں کے غسل کدے سے نکل کر حال کی لطیف و نازک چادر اوڑھے تعمیرِ نو کے توشہ خانے میں جا رہی ہے۔

یہ لطیف و نازک چادر عبوری دَور کا عارضی لباس ہے، جب زندگی تعمیرِ نو کے توشہ خانے سے بن سنور کر نمودار ہوگی یہ حال کی حبابی چادر دیکھتے ہی دیکھتے تحلیل ہو جائے گی۔

جن خیالات کو کل بغاوت و سرکشی کا شاہکار سمجھا جاتا تھا آج رجعت پرستی کا اختراع فاتقہ ہیں، اور آج جن تصورات کو زندقہ و الحاد سے تعبیر کیا جا رہا ہے وہ حقیقت و بغاوت کے سرچشمے کا محض ملتبہ ہیں!

آنکھ اُس ما فوق البشر کو دیکھنا چاہتی ہے جو ارتقاء کی منزلِ مقصود معلوم کر سکے۔ کس کا جگر ہے جو اس کے بطن میں پوشیدہ معجزات کی ہمک بھی سُن سکے!؟

ساغر

ذکیہ سلطانہ ساغر

اَمر جُوت

(۱) اندھیرا ہر طرف چھایا ہوا ہے
اندھیرا ہی ازل ہے اور اندھیرا ہی اَبد کی جوت ہے شاید
اسی تاریک چادر کی تہوں میں
عدم کے خواب سے تاریخ جاگی
اسی تاریک چادر میں تمدّن مسکرایا کِھلکِھلایا جگمگایا
یہی تاریک چادر خاورِ تہذیب کا مشرق بنی آخر
یہی تاریک چادر اوڑھ کر حیوانیت نے روپ دھارن کر لئے لاکھوں
اسی تاریک چادر میں سمٹ کر گم ہوئی ہستی
یہی مشرق یہی مغرب
اندھیرا ہی ازل ہے اور اندھیرا ہی اَبد کی جوت ہے شاید

(۲) اندھیرے کی اسی دیوارِ چیں کو
کبھی سقراط کی حکمت نے ڈھایا
کبھی رِ عیسیٰ کے خونِ گرم و تازہ نے کیا رنگیں
کبھی گوتم کی موسیقی کے سایوں نے اسے گھیرا
کبھی ضربِ محمدؐ نے کیا ٹکڑے
حسین ابنِ علی کے خونِ ناحق کے تھپیڑوں سے کبھی کانپی کبھی لرزی
فضا میں ایک چنگاری سی تڑپی
اور اسکے بعد۔ اس کے بعد
چھائی پھر وہی منحوس تاریکی ۔ وہی منحوس تاریکی
اندھیرا ہی ازل ہے اور اندھیرا ہی اَبد کی جوت ہے شاید

(۳) اندھیرے کی جبینِ آہنی سے
یہ کیسی جوت پھوٹی مسکرائی جگمگائی
یہ کس کی مسکراہٹ سے بنی انسانیت گلشن
یہ کس نے ہند کی تاریک دُنیا کو کیا روشن
دکھی دُنیا ستاروں سے بنی دُلہن

ضمیرِ زندگی میں کروٹیں لینے لگی اک مستقل دھڑکن
ورق تاریخ نے تیزی سے اُلٹے
تغیّر لے کے سازو برگِ تعمیرِ جہاں آیا
بنی آدم کی دُنیا کو سجانے
دلِ سقراط و عیسیٰ جھوم اُٹھے
جبینِ بُدھ سے نکلی اک نئی جوت
اندھیرے ہی سے پھوٹا اک نیا سوت
اندھیرا اپنی ہستی کھو رہا ہے
اندھیرا نور میں حل ہو رہا ہے
(۴) نئے دیپک کی جوتی مسکرائی
جہاں کو کر دیا روشن
جہاں کو، مانوتا کو، زندگی کو، قلب وجاں کو کر دیا روشن
سیہ خانے میں اپنا جال لے آئے نئے خاکے
نئی دُنیا بنانے کی تمنّا کے نئے خاکے
کہ پھر ظالم اندھیرا جنگجو حاسد اندھیرا
لئے تاریکیوں کے جال آیا
نگارِ امن کے دیپک پہ ٹوٹا
کبھی کرنوں کبھی دیپک کو لوٹا
زمیں سے آسماں تک موجِ خوں ہے
ابھی تک آدمی صیدِ زبوں ہے
اندھیرا ہی ازل ہے اور اندھیرا ہی ابد کی جوت ہے شاید
(۵) اگر سقراط کا دیپک ہے روشن
سراجِ ابنِ مریم گر ابد تک بجھ نہیں سکتا
کوئی جھونکا اگر شمعِ شہیدِ کربلا کو چھو نہیں سکتا
تو اے تاریک دُنیا تو اے مایوس انساں!
بجھا سکتی نہیں ہے کوئی آندھی
یوں ہی روشن رہے گی شمعِ گاندھی

مترجم
پنڈت پیارے لال شرما

موسیو پال رچرڈ

ہمالیہ کا پیغام

موسیو پال رچرڈ فرانسیسی عالم و فلسفی مشرق کی روحانی اور اخلاقی قدروں سے کافی متاثر تھے ۔۔۔ ۔۔۔ ویدانتی کلچر نے انھیں اتنا موہ لیا تھا کہ وہ آربندو گھوش جیسی برگزیدہ ہستی کے ساتھ پانڈیچری میں کافی عرصہ تک رہے۔ اس کے بعد وہ ہمالیہ کے ایک برف آلود مقام پر کچھ مدت عزلت گزیں بھی رہے جہاں انھوں نے ایشیا اور ہند کے حال و مستقبل پر گہرا سوچ وچار کیا۔ ان کے یہ افکار "ہمالیہ کا پیغام مادرِ ہند کے نام" سے فرانسیسی زبان میں شائع ہوئے۔ جن کا ترجمہ انگریزی زبان میں کتابی صورت میں چھپ کر بیحد مقبول ہوا۔

ذیل میں ان کی کتاب کے اوّلین اوراق کا ترجمہ شائع کیا جاتا ہے، جس کے ترجمہ کرنے والے پنڈت پیارے لال شرما (مرحوم) وزیرِ تعلیم یو۔پی ہیں جن کی یاد آج بھی سینکڑوں دلوں میں باقی ہے۔

ویدانتی تصوّرات کی نفاست و انفعالیت سے متاثر ہونے کے باوجود موسیو پال کا فکر منفی اور فرار پسند نہیں ہے ان کے سوچ میں شاداب روحانیت اور فکر کی زندگی و تابندگی پائی جاتی ہے۔ اس میں کیا شک ہے کہ متحدہ ایشیا ہی آنے والے زمانے میں تمام دنیا کے امن کا ضامن ہو سکتا ہے۔ اس اتحاد میں ہمارے وطن کو بہت بڑا رول ادا کرنا ہے۔ ایشیا کے مستقبل سے ہندستان کا مستقبل وابستہ ہے۔

ہر چند کہ ان خیالات کا محور زیادہ واضح نہیں ہے پھر بھی اثباتی وارتقائی کیفیت موجود ہے۔ اس سے زیادہ ہم روحانی مفکرین سے اور کیا توقع کر سکتے ہیں!؟

میرے پاس شرما جی کی یہ یادگار محفوظ تھی جسے میں ناظرین تک پہونچاتا ہوں۔

ساغر

کوہ ہمالیہ کا سلسلہ جہاں تک نظر جاتی ہے ان پہاڑوں کے سمندر میں ایک مسرتِ نامتناہی ہے۔ اور یہ نور، یہ مسرت متحرک ہے جس طرح تیز نبض متحرک ہوتی ہے۔ یا جیسے اک زندہ لفظ، اور ایک زندگی بخشنے والی آواز سنو! ——— وہ آواز تجھ کہتی ہے وہ مادرِ ہند سے خطاب کرتی ہے۔ بھارت ماتا اس پیغام کو سن جو ان بلندیوں سے تیرے لئے آیا ہے۔ جو ہمالیہ کا پیغام ہے۔ یہ آواز تجھ سے کہہ رہی ہے

وہ ساعت قریب ہے۔ وہ پرعظمت گھڑی جب تو آزاد ہو گی قریب ہے کہ تیری آرزو بر آئے، مگر صرف وہی نہیں جو تو نے چاہا تیری آرزو سے بہت زیادہ، بہت ارفع، زیادہ بیّن، اور واضح، زیادہ متحرک وہ کسی سے مغلوب نہ ہونے والی آرزو حتیٰ کہ تو بھی اس کی طاقت سے مجبور ہو گی!

یورپ کی قدیم روح کے ساتھ ساتھ اس کا خاتمہ ہو رہا ہے

یورپ اور اس کے مقبوضات کے ساتھ ساتھ یہ رخصت ہو رہی ہے۔ جب جسم ہوتا ہے تو اس کا کوئی عضو کب بچ سکتا ہے تم اسے کسی سلطنت کا خاتمہ نہیں بلکہ یورپ کی سلطنت کا خاتمہ سمجھو اس پر لعنت نہ بھیج نہ اس کی تقلید کر البتہ اس سے اپنا ورثہ حاصل کر اس سے سیکھ کہ تجھے کیا کرنا چاہیئے (دنیا کے لئے) نور اور روشنی دے اور یہ بھی سیکھ کہ تجھے کیا نہ کرنا چاہیئے کہ تو اضمحلال و انحطاط سے محفوظ رہے۔

جو گذر گیا اسے خیر باد کہہ اور جو آئندہ سامنے آئے اسکی طرف رجوع ہو نا وہی سورج جو ایک جگہ ڈوبتی ہے تو ایشیا کی جانب اُٹھتی ہے گویا وہ ایشیا کو جگانے آ رہی ہے۔ وہی آفتاب جو گذرے ہوئے دن میں مشرق سے گذر کر مغرب کی طرف دورہ کر رہا تھا لیکن اب وہ یہاں نمودار ہوتا ہے اگر صبح صادق کا نظارہ دیکھنا ہے تو ایشیا کی طرف متوجہ ہو جاؤ۔

یہ زمانہ کی وہی حرکت جس نے یورپ سے اونچا ہوتے وقت ایشیا کو جھکایا تھا اب یورپ کو جھکا رہی ہے کہ ایشیا کو اٹھا دے۔

یورپ کا زوال، ایشیا کا عروج، ساوات کے یہ دو پہلو ہیں اور انہی کے ذریعہ اقوام عالم کی تقدیروں کا عقدہ حل ہوگا۔ دروازہ کے دو لنوں کو اٹھ کھُل رہے ہیں۔ یہ دروازہ تمھارے مستقبل کا باب آرزو ہے۔ ایک در تاریکی میں ہے دوسرا روشنی میں۔

"دختر ایشیا" (مادر ہند) تم اس لئے خودی کی عادت چھوڑ دو کہ کوئی قوم اور کوئی انسان تنہا اپنے لئے زندہ نہیں رہتا اور نہ کوئی انسان یا قوم زندہ رہ سکتی ہے جب تک کہ وہ اپنے سے اونچی بلندی کو نہ دیکھے۔ اقوام یورپ کی طاقت کا ایک سبب یہ تھا کہ زندہ یورپی جذبہ اُن سب پر حاوی اور اُن سب میں جاری تھا۔ اب ان کا خاتمہ اس لئے ہو رہا ہے کہ وہ اُس اجتماعی جذبہ اور اُس یورپی حب الوطنی میں قاصر رہیں۔

ایشیا کی قومیں زندہ رہیں گی وہ مضبوط اور آزاد ہو کر زندہ رہیں گی لیکن صرف اس وقت جب اُن سب میں یہی اجتماعی جذبہ اور ایشیائی حب الوطنی، کی روح زندہ ہوگی۔

ایشیا والے یعنی ہندوستان، چین، جاپان، فارس، مصر کے شہری تو مجھے اس وقت سب جگہ نظر آتے ہیں لیکن ایشیا کے شہری ایشیا کے فرزند کہاں ہیں؟

ایشیا کہاں ہے؟

میں ایشیا والے تو ہر جگہ دیکھتا ہوں لیکن ایشیائی کہاں ہیں؟

وہ کہاں ہیں جن کی نگاہ ایشیا کی طرف لگی ہو اور جنھیں کثرت میں وحدت کا احساس ہو، وہ ایشیا جو تین نسلوں کا گہوارہ پانچ مذہبوں کی عبادت گاہ اور سات سلطنتوں کی سرزمین ہے یہ نہی سات سلطنتیں ہیں جو کل بھائیوں کی طرح ملکر "ایک" ہونے والی ہیں۔

وہ کہاں ہیں جن کی نگاہ ایشیا کی طرف لگی ہو، وہ ایشیا جو تمام افکار عالیہ اعلیٰ خیالات کا ایک گلدستہ ہے۔ مسیحی ایشیا شمال میں اسلامی ایشیا مغرب میں، بودھ کی ایشیا جنوب میں کنفیوشس کی ایشیا مشرق میں، ویدوں کی ایشیا اسی جگہ رودحالی ایشیا سب جگہ

وہ کہاں ہیں جن کی نگاہ ایشیا کی طرف لگی ہوئی ہو وہ ایشیا جہاں نصف بنی نوع انسان آباد ہیں وہ ایشیا جو اس وقت غلام ہے مگر آئندہ آزاد ہوگی وہ ایشیا جس کا تعلق اقوام مغرب سے طاقت کے زور سے ہے اور وہ اس لئے آزاد ہوگی کہ محبت سے اُن کے سامنے جھکے۔

وہ کہاں ہیں جن کی نگاہ ایشیا کی طرف لگی ہوئی ہے؟ وہ جو صرف روح میں اس وقت ایک ہے اور جس کو اس وجہ سے متحد ہونا چاہئے کہ اس روح کا ظہور ہو اور اس ظہور سے دُنیا پُر نور ہو کیونکہ ایشیا کے اتحاد پر دنیا کے اتحاد کا انحصار ہے۔

وہ کہاں ہیں جن کی نگاہ ایشیا کی طرف لگی ہے؟ وہ ایشیا جسے قیامت نے "مادر عظیم" کا خطاب عطا کیا ہے۔

مادر ہند! تو ایشیا کا دل ہے چین اس کا دماغ اور جاپان تیرا مضبوط ہاتھ ہے، ان سب سے علیحدہ تم کس طرح زندہ رہو گے!؟

بالکل اسی طرح جس طرح یورپ کی کسی قوم کی تقدیر یورپ کی تقدیر سے علیحدہ نہیں ہو سکتی۔ تمھاری تقدیر بھی ایشیا کی تقدیر سے علیحدہ نہیں کی جا سکتی۔ تمھارا سوال صرف تمھارا سوال ہی نہیں ہے وہ ساری ایشیا کا سوال ہے۔

یورپ کے لئے ایشیا ایک تقسیم شدہ تنکا ہے اس غرض ہے کہ وہ یورپ کا شکار نہ بنے اسے چاہیئے کہ وہ یورپ کے مقابلے میں ایک ہو جائے آزادی اور اتحاد ایشیا کا سہارا ہے ایشیا کی نئی تہذیب ہمارا پروگرام ہے اور اقوام ایشیا کی انجمنیں ہمارا طریق کار مادر ہند اس معیار کی وسعت کے لحاظ سے اپنی روح کا موازنہ کر۔

اور اب تم ماضی کے معنی سمجھو، صدیوں تک تم مردہ صورت

۱

میں زندہ رہیں، غلامی کی تنگ، قبر میں زندہ رہیں لیکن وہ قبر تمھارے لئے نئی زندگی کا گہوارہ تھی، جب کبھی بھی وقت آیا تمھارے پیغام بر نمودار ہوئے۔ انھوں نے تم سے کہا، "قبر سے باہر آؤ، لیکن پہلے اُن رسیّوں کو جن سے تمھارے اعضا جکڑے ہوئے ہیں پھینک دو، اور اپنے پیکر کو ان کی نجاست سے پاک کر لو"۔

اُنہوں نے تم سے کہا "پہلے اندرونی آزادی حاصل کر لو، بیرونی آزادی حاصل ہو جائیگی۔ لیکن انکی آواز نے یا تو صدا بہ صحرا رہی یا قید خانوں کے ذریعہ اس آواز کا گلا گھونٹ دیا گیا۔ تاہم تمھاری روح اس آواز کو سُن سکتی ہے

دوسرے پیغامبر نمودار ہوتے ہیں، ان میں سے کچھ کہتے ہیں کہ اپنی زنجیروں کو بجائے توڑنے کے ڈھیلا کر لو، اور کچھ کہتے ہیں کہ "اپنا جوا سیدھا کر دو، اور اگر نہ کر سکو تو اس کا خاتمہ کر دو"۔ "اصلاح ہو نہیں تو خاتمہ" لیکن تمھاری روح اپنی خاموشی میں ایک اور آواز سُن رہی ہے اور یہ آواز کہتی ہے "جنہوں نے تمہیں پہلے جگایا وہ جھوٹے نہ تھے، کوئی مردہ جب تک کھڑا نہ ہو، قبر سے باہر نہیں نکل سکتا۔ اس دورِ جدید کے لئے جو تمھارے سامنے آرہا ہے۔ تیاریاں کرو"۔

جنھوں نے یہ کوشش کی کہ وہ زیادہ آزادی کی طرف تمھاری رہنمائی کریں وہ تمھاری زیادہ مصیبت اور بدنامی کا باعث ہے اور جنھوں نے تمھیں اس کا سبق پڑھایا انھوں نے بغیر جانے تمھیں بغاوت کی طرف پہنچایا لیکن وہ جو یہ خیال کرتے ہیں کہ بغاوت میں تمھاری رہنمائی کرینگے وہ بھی اپنی باری میں تمھیں ایسی جگہ لے جا رہے ہیں وہاں وہ تمھیں لے جانا نہیں چاہتے۔ سب ہی تمھیں ایک دوسری منزل کی طرف لے جا رہے ہیں جو منزل نہیں ہے تمھاری تقدیر کی حقیقی منزل ہے۔

وہ منزل تمھاری نئی زندگی کی منزل ہے نئی تعمیر کی منزل ہے، نئی زندگی میں نئی ساخت کی منزل ہے اور اس ساخت کے لئے اگر ضرورت ہوئی تو تمہیں پہلے کھٹائی میں پڑنا ہوگا۔ بھٹی میں تمھیں جلنا ہوگا۔ غرض تمھارے لئے انتشار کا زمانہ آئے گا ــــ وہ انتشار جس سے نئی، صاف اور آزاد دنیا پیدا ہوتی ہے

تم اپنے مستقبل میں خوشی سے داخل ہو جاؤ اگر یہ نہیں چاہتیں کہ زبردستی داخل کی جاؤ۔ تم اس میں داخل ہو جاؤ لیکن اس طرح نہیں کہ تمھاری حسرت بھری نگاہ ماضی کی طرف مڑ مڑ کر دیکھتی رہے۔

اس بات پر نازاں نہ ہو نا کہ تم کیا تھیں کیونکہ ایک شاندار ماضی سے زیادہ بوجھ اور کوئی نہیں ہوتا۔ تم اس میں پابند نہ ہو جانا زمانۂ حال کی کوئی چیز بھی اتنا خراب نہیں کرتی جتنا کہ مردہ ماضی کی بچی ہوئی خاک خراب کرتی ہے۔

تم کہتی ہو "میری تہذیب دنیا کی تہذیبوں میں سب سے زیادہ شاندار تھی" اس سے کیا حاصل؟ جب کہ وہ اب نہیں ہے اور جو آنے والی ہے وہ ابھی تک نہیں آئی۔ "جو تھا" اور "جو ہے" میں فرق ہے، صرف باقی رہ جانے کا نام زندہ ہونا نہیں ہوتا۔

تم کہتی ہو "میرے شاستر میرے راہ نما ہیں اور میرے وید میری بنیاد ہیں۔ دائمی وید ہر ایک زمانے میں کہے جاتے ہیں اور ان کے شاستروں کا خاتمہ کبھی نہیں ہوتا۔

اپنے رشیوں کو نئے سرے سے لکھنے کی اجازت دو۔
اپنے عارفوں کو نئے راگ گانے دو

تم "شیو" کی پرستش کرتی ہو۔ جو ہلاکت اور حیات تازہ کا دیوتا ہے جو ان تمام اشیا کو جن کی تجدید ناممکن ہو ضائع کر دیتا ہے۔ کیا تمھاری یہ خواہش نہیں ہوگی کہ وہ تمھاری تجدید کرے؟ یورپ کا "حال" تو گذر رہا ہے اور تم چاہتی ہو کہ تمھارا "ماضی" باقی رہے وہی طاقت جو ایک کو نکال رہی ہے دوسرے کو بھی خارج کرتی ہے۔ اور یہ مضبوط سے مضبوط ہاتھوں سے نکلا جا رہا ہے جسے

کوئی بچا نہیں سکتا۔

مستقبل کا عطیہ اس کو نہیں مل سکتا جو پیشتر اپنی قربانی نہیں دیتا۔ جتنی عظیم الشان قربانی ہوگی اتنا ہی بیش بہا عطیہ ہوگا اگر تم حیات تازہ چاہتی ہو تو اپنے کل ماضی کی قربانی ادا کرو۔

ایشیا کے ایک گم شدہ جزیرہ کی چھوٹی سی قوم نے اپنے سی صد سالہ ماضی کی مکمل قربانی مستقبل کے لئے پیش کی اور وہ آزاد و مضبوط ہو کر تاریخ کی تازہ صدیوں میں داخل ہوئی، اے عظیم الشان قوم! تو بھی اپنے ہزار ہا سالہ ماضی سے نکل!

اپنے غیر مروجہ طریقوں اپنی قدیم روایات اپنی روح کو مقید کرنے والی رسموں، اپنے ضابطوں اپنے بند فیصلوں والی ہندی خاتون اپنی آہنی زنجیروں اور اپنی ذاتوں سے باہر آ ـــ!

زمانۂ ماضی میں وہ سچی اور زندہ صورتیں تھیں، اور ان میں اتنی ہی لچک تھی جتنی کہ زندگی میں ہوتی ہے۔ لیکن آج وہ جھوٹی اور مردہ رکاوٹوں کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں، وہ ایسی اکڑ گئی ہیں جیسے نعش

اکثر جاتی ہے
تم کس طرح زندہ رہ سکتی ہو وہ تمہارے جسم کے بند نہیں ہیں بندشیں بن گئی ہیں، مختلف اعضا کی تمیز نہیں رہیں، ان کی تقسیم جدائی اور علیحدگی بن گئی ہے۔
اس طرح تقسیم شدہ جسم ہو کر تم کس طرح زندہ رہ سکتی ہو؟
جسم کو آزاد کر اس کے خون کو تمام رگوں میں آزادی اور خوشی سے دورہ کرنے دو، اپنی ذات پات کی بندشیں توڑ دو ایک دوسرے میں شامل ہونے دو، پھر تم یقیناً زندہ ہوگی جب موت سے وابستہ نہ ہوگی

ایک قوم کی حیثیت سے تم اس وقت زندہ رہو گی جب بنی نوع انسان کے خلاف گناہ کرنا ترک کردوگی۔ کیونکہ ایک انسان کی تذلیل بنی نوع انسان کی تذلیل ہے۔ تم نے انسانوں کو "ہریجن" بنالیا اس لئے دوسرے انسانوں نے تمہیں "ہریجن" بنالیا۔ قومی "خودی" کا خیال کافی نہ تھا، صوبہ کے لحاظ سے "خودی"، کا خیال بھی تمہارے لئے بے حد وسیع تھا۔ تم خودی کے انتہائی تنگ خیال، ذات کی "خودی" میں ڈوب گئیں!
محبت میں زندگی بسر کرو پھر تم یقیناً زندہ رہو گی۔
اتفاق سارے ایشیا ہی کا نعرہ نہیں ہے سارے ہندوستان کا بھی نعرہ ہے۔ یہی مکتی یا نجات، یہی ممکن مکتی یا نجات ہندوستان اور ایشیا کے لئے ہے۔
اقوام اور نسلوں میں تو مساوات کا دعویٰ کرتی ہو اور وہی مساوات خود ذاتوں میں روا نہیں رکھتیں تم قوم کی ہمشیرہ اس وقت بنو گی جب تمہارے فرزند آپس میں بھائی بن جائیں گے۔ اور تمہاری بیٹیاں ان کی بہن اور برابر کی حقدار!

تمہاری بیٹیاں اندر غلامی میں رکھی جاتی ہیں۔ تو تمہارے بیٹے باہر غلام بنا کر کیوں نہ رکھے جائیں؟ جب دنیا میں تمہاری عورتیں سب سے زیادہ مغلوبیت کی حالت میں ہوں تو تمہاری قوم کی تقدیر بھی وہی کیوں نہ ہو؟
مستورات اور ان کی قوم کے مابین ایک پوشیدہ اور قریبی تقدیری رشتہ ہوتا ہے۔ قوم کی حیثیت ماں کی سی حیثیت ہے۔ اور وہ مستورات میں شمار کی جاتی ہے۔ جس قوم میں عورتوں کے ساتھ غلاموں کا سا سلوک ہوتا ہے وہ قوم خود غلام بن جاتی ہے۔

احمد ریاض

تاثرات

اب بھی اک پرویز کا دینگے ساتھ یہ ظالم دنیا والے
میں بے ثروت تم بے ہمت کون پرائی بپتا ٹالے

وقت کہاں لے آیا مجھ کو کیا سوچا کیا دیکھ رہا ہوں
خرمن کو بجلی کا سہارا گلچیں کلیوں کے رکھوالے

طوفاں کے بے مہر تھپیڑے ساحل تک کیوں پہنچائینگے
جب خود ناؤ ڈبونے نکلے کشتی والے ساحل والے

دونوں ہی احساسِ نازک نازک چلمن نوچ رہے ہیں
کٹیاؤں کے گھور اندھیرے محلوں کے زرکار اجالے

آپ کا تاج و تخت سلامت آپ کو اوجِ بخت مبارک
راہوں میں دم توڑ رہے ہیں مائیں بہنیں بچے بالے

اختر ہوشیارپوری

ساقی

وہ ابر اُٹھا وہ بوندیں آئیں وہ دل ہوا نغمہ بار ساقی
ادھر بھی لا جام گھول کر ہم پئیں غمِ روزگار ساقی

یہ دورِ فصلِ بہار ساقی نہ آئیگا بار بار ساقی
جو ہو کے مایوس جا چکے ہیں انہیں خدارا پکار ساقی

کلی کلی مسکرا اٹھی ہے روش روش گدگدا اٹھی ہے
گلوں کو جھولا جھلاتی آئی ہے نو عروسِ بہار ساقی

مجھے خبر ہے گلوں کے پردے میں پل رہے ہیں ہزار کانٹے
تری نگاہوں کو جانتا ہوں نہ دے فریبِ بہار ساقی

یہ مانتا ہوں کہ تیرے ساغر سے زندگی خود چھلک رہی ہے
ترے لبوں کے مگر مقابل کہاں مئے غم شکار ساقی

جہاں کی رفتار کہہ رہی ہے پرانے شیشے نہ ساتھ دیں گے
بجائے مے کے اُفق سے پھوٹیگا خون کا آبشار ساقی

نظامِ عالم بدل چکا ہے اُلٹ چکی ہے بساطِ ہستی
اگر یہی رنگِ انجمن ہے تو کیا ترا اعتبار ساقی

نہ کیوں ستاروں کی ہم رگوں سے کشید کر لیں شراب خود ہی
کہ صبح تو ہو چلی ہے کون اب ترا کرے انتظار ساقی

نہ وہ ستاروں میں نور باقی نہ وہ گلستاں میں مستیاں ہیں
تری نگاہوں میں ڈھونڈتا ہوں جو کھو چکا ہے بہار ساقی

انہیں سے اختر بنیں گے اک دن انہیں سے غنچے کھلیں گے اک دن
وفا کے مارے جو تجھ کو پہنا رہے ہیں اشکوں کے ہار ساقی

کرشن چندر

کہانی کی کہانی

ایک روز میں نے کہانی کو بڑے خوبصورت کپڑے پہنائے، اسے پشمینے کا فرن پہنایا جس پر کشمیری کاریگروں نے رنگا رنگ نازک بیل بوٹے کاڑھے تھے۔ اُس کی گردن میں سرخ موتیوں کی سلکڑی پہنائی۔ اُس کی آنکھوں میں کاجل لگایا۔ اُس کے بال سنوارے، اُس کے ماتھے پر افشاں چُن دی۔ اُس کے پاؤں میں خلخال باندھ دیئے اور اُس کے ہاتھ میں ایک دَف دے کے اُسے اپنی وادی میں بھیج دیا۔

کہانی بہت جلد واپس چلی آئی پژمردہ۔ پریشان۔ حیران ۴۰ دل برداشتہ، اُس کا چہرہ زرد تھا۔ بال اُلجھے ہوئے فرن جگہ جگہ سے پھٹا ہوا۔ آنکھوں کا کاجل کافور تھا خلخال بے آواز تھے۔

میں نے گھبرا کے پوچھا۔ کیا ہوا۔ وہاں تو ایسا استقبال تمہارا کبھی نہ کیا گیا تھا۔ کبھی راہ میں آنکھیں بچھائے تمہارے منتظر رہتے تھے جو داہوں سے بادشاہوں تک سبھی تمہارے دلکش، رومانی، رنگین گیت سننے کے لئے بے قرار رہتے تھے، جلدی کہو۔ وہاں ایسا سلوک تمہارے ساتھ کس نے کیا۔

کہانی بولی۔ تمہاری وادی میں آج کوئی میرے میٹھے گیت سننے کو تیار نہیں ہے۔ ڈل کے کنارے چھوٹے چھوٹے بچے فوجی قواعد کا کھیل کھیل رہے ہیں۔ عورتیں چوک میں کھڑی ہو کر سنتریوں کی طرح پہرہ دے رہی ہیں۔ کاریگر گرگلوں پر نئے کشمیر کا تانا بانا بُن رہے تھے۔ کسی کو فرصت نہیں ہے کہ میرے خوبصورت مکھڑے کو دیکھے۔ میرے ہونٹوں سے پھولوں کی طرح کھلتے ہوئے گیتوں کو سُنے۔ میرے پاؤں کے نازک خلخالوں کی نقرئی جھنکار کو سُنے۔ مجھے وہاں سے واپس آنا پڑا۔

میں نے کہا۔ تو تم محاذِ جنگ پر گئی ہوتیں۔

کہانی بولی۔ میں وہاں بھی گئی تھی۔ ایک پہاڑی درّے پر پرویز مورچہ لگائے دبکے بیٹھا تھا۔ اُنکے سامنے دوسرے درّے پر رحمت خاں مورچہ جمائے بیٹھا تھا۔ دونوں ایک ہی ملک کے رہنے والے تھے۔ ایک بارہ مولے کا خوبرو تھا۔ دوسرا پونچھ کا شہری تھا۔ اور اب دونوں ایک دوسرے کی جان کے پیاسے ہو رہے تھے۔

پرویز بولا۔ مجھے تمہارے حسین گیت نہیں چاہئیں، میرے سامنے جلتا ہوا بارہ مولا ہے۔ میری چھوٹی بہن کی دریدہ عصمت ہے کھمبے پر لٹکی ہوئی مقبول شیروانی کی لاش ہے۔ میرے سامنے سے ہٹ جاؤ۔

دوسرے درّے سے رحمت خاں نے کہا۔ میں ریاست پونچھ کا شہری ہوں، پھلندری کا رہنے والا۔ پھلندری کا جسے میرے دشمنوں نے نمباری کر کے تباہ و برباد کر دیا ہے، جانتی ہو ہم لوگ تہذیبی کلچری ثقافتی اعتبار سے پنجابی مسلمانوں کا ایک حصّہ ہیں۔ پرویز سے میری کوئی یگانگت نہیں ہے۔ میرے سامنے سے ہٹ جاؤ۔

آر پار۔ پرویز اور رحمت خاں کے مورچے تھے۔ بیچ میں نیلم کے نگینے کی طرح چمکتی ہوئی ایک وادی تھی۔ میں نیچے وادی میں اُتر گئی لیکن واں کوئی نہ تھا۔ گھر اُجڑے اور ویران پڑے تھے۔ کھیتوں میں بیل ہل سے جُتے جُتے مر گئے تھے چشمو نیر پانی کے گھڑے بھرے ہوئے تھے۔ لیکن وہ چرواہیاں کہاں تھیں۔ جو انہیں اپنے سروں پر اٹھائے اپنی بھیگی پلکیں جھکائے گھومتی ہوئی پگڈنڈی کے موڑ پر مرغابیوں کی ڈار کی طرح اڑی اڑی چلی جائیں۔ میں اکیلی ہی کھڑی کھڑی واں ایک چشمے کے کنارے دَف بجانے لگی۔ اتنے میں دو آدمی رائفل لئے کہیں سے نکل آئے ایک نے میرا ہاتھ زور سے پکڑ لیا۔

میں نے کہا۔ مجھے چھوڑ دو۔ میں تمہیں بڑے خوبصورت گیت سُناؤں گی۔ دَف پر ناچوں گی۔

وہ ایک بڑی ظالمانہ ہنسی ہنس کے بولا۔ ہاں، ہاں گیت بھی

سنیں گے ۔ ابھی پہلے تیری چیخیں تو سُن لیں ۔

پھر دوسرے آدمی نے بھی مجھے پکڑ لیا اور وہ مجھے اپنی طرف گھسیٹنے لگا ۔ اور میان دونوں کے ہاتھوں میں یکایک کاغذ کے پرزے کی طرح ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی اور چرمرا کر زمین پر گر پڑی اور وہ مجھے یوں اپنی ہئیت تبدیل کرتے دیکھ کر بڑے گھبرائے اور وہاں سے بھاگ گئے ۔

اسی کشاکش میں میرا قرن پھٹ گیا ۔ اور خلخال ٹوٹ گئے اور میرے ماتھے کی افشاں نوچ ڈالی گئی ۔ یہ دیکھو ۔ میں اب تمھاری وادی میں کبھی نہیں جاؤں گی ۔" وہ سر جھکا کے رونے لگی ۔

میں بہت دیر تک پریشان رہا ۔ وہ بہت دیر تک سسکیاں لیتی رہی ۔ آخر میں نے اُسے دلاسا دیتے ہوئے کہا ۔ اچھا میں تمھیں وہاں نہیں بھیجتا ہوں ۔ آج ہمارے نیتا تاج محل ہوٹل میں آنے والے ہیں ۔ میں تمھیں ریلوے کا کلرک بنا کے وہاں بھیجتا ہوں ۔ ہاں مگر ہمارے نیتا کا ادب احترام ملحوظ رہے ۔ وہاں پر بھی شرفا کے طبقے سے ہوتے ہیں ۔ وہ لوگ مجلسی آداب کا بہت خیال رکھتے ہیں ۔ کہیں کوئی ایسی ویسی بات نہ ہو جائے جس سے میرا فن بدنام ہو جائے ۔

میں نے کہانی کو چالیس برس کا ریلوے کلرک بنا دیا ۔ نام مل وانکر ، جو وادر کیبن نمبر ایک میں کام کرتا ہے ۔ جس کے دانت کتھئی رنگ کے ہیں ۔ اور جو چونا اور تمباکو ملا کے کھاتا ہے ۔ جس کے پانچ بچے ہیں ۔ ایک بیوی ہے ۔ ایک بوڑھی ماں ہے ۔ دو جوان بہنیں ہیں جن کی ابھی شادی نہیں ہوئی ۔ بیوی کا ایک بھائی ہے ؟ دونوں آنکھوں سے اندھا ہے اور جو اُسے جہیز میں ملا تھا ۔ مل وانکر کا باپ بھی ریلوے میں کام کرتا تھا ۔ ہما لائن پر ۔ اور اب مل وانکر بھی کام کرتا ہے ۔ اُسے یہاں کام کرتے ہوئے پچیس سال ہو گئے ہیں ۔ لیکن وہ آج تک کبھی تاج محل ہوٹل نہیں گیا ۔ تاج محل ہوٹل تو در کنار وہ کبھی بمبئی سنٹرل کے ریلوے ریسٹوران میں بیٹھ کے کھانا نہیں کھا سکا ۔ اسی لئے میں آج اُسے تاج محل ہوٹل بھیج رہا تھا ، جہاں ہمارے نیتا آنے والے تھے ۔

پُرانا سال جا رہا تھا ۔ نیا سال پیدا ہو رہا تھا ۔ یہ رات بڑی سہانی تھی ۔ میں نے کوئی سات بجے کے قریب ہی مل وانکر کو تاج محل ہوٹل بھیج دیا ۔ اور خود سیر کرنے کے لئے سمندر کے کنارے چلا گیا ۔ وہاں بہت دیر تک ٹہلتا رہا اور سیپ اور گھونگھوں کو اکٹھا کر کے اُن کا مکان بناتا رہا ۔ اور پھر اس کے بھردے پر گرا یہ دادوں سے پگڑی وصول کرتا رہا اور

پھر سمندر کی اک بہت بڑی لہر آئی اور میرا گھروندا بہا کے لے گئی اور میرے کپڑے بھی گیلے کر گئی ۔ اور میں اُسی طرح مفلس و نادار ہو کر واپس اپنے گھر لوٹا ۔ رستے میں ساحل کے کنارے ماہی گیر اپنی کشتیوں میں لالٹین باندھے بادبان ٹھیک کر رہے تھے ، رات کو سمندر میں مچھلیاں پکڑنے جائیں گے ۔ ایک بڈھا اپنے کتے سے باتیں کئے جا رہا تھا ۔ ایک جوڑا ریت پر محو اختلاط تھا پولیس کا سپاہی سرے پر کھڑا اسگریٹ پی رہا تھا ۔ دور ناریل بیچنے والا پیٹھ موڑ کر اپنی صدا لگاتے ہوئے جا رہا تھا ۔ یکایک آسمان پر سارے ستارے کھل کھلا کر ہنس پڑے ۔ شریر بچوں کی طرح جیسے وہ میری ٹوٹی ہوئی چپل میرے پھٹے ہوئے پاجامے اور ریت میں سنی ہوئی پرانی قمیص کا مذاق اڑا رہے ہوں ۔ اور میں جلدی جلدی سے قدم اٹھاتا ہوا گھر چلا آیا ۔ اور میں نے دل میں سوچا ۔ کہ اب میں کبھی اتنا بُرا لباس پہن کر ساحل کے کنارے نہیں جاؤں گا ۔ آج نئے سال کا جنم دن ہے ۔ اور آج سب لوگ میرا لباس دیکھتے ہیں ۔ میرا دل نہیں دیکھتے ۔

میں نے دروازہ کھولا ۔ اور کپڑے تبدیل کئے اور کھانا کھا کے اور ایک عمدہ سی کتاب ہاتھ میں لے کر بستر پر دراز ہو گیا ۔ دیر تک اُسے پڑھتا رہا ۔ گیارہ بج گئے ۔ بارہ بج گئے ۔ لیکن مل وانکر واپس نہ آیا ۔ میں نے مسکرا کر دل ہی دل میں کہا ۔ آج پہلی بار تاج محل ہوٹل گیا ہے ۔ اتنی جلدی کاہے کو لوٹے گا ۔ اتنا سوچ کے میں نے کتاب کو بند کر دیا ۔ بتی بجھا دی ۔ اور بڑے مزے سے نرم نرم گدگدے بستر پر پاؤں پھیلا کے سو گیا ۔ پتہ نہیں کتنی دیر سوتا رہا ۔ یکایک ٹیلی فون کی گھنٹی بجی ۔ میں نے بتی لگا کے دیکھا ۔ گھڑی میں تین بج رہے تھے ۔ یہ اس وقت کون ٹیلی فون کر رہا تھا ۔ میں نے غصہ میں چونگا اٹھایا اور کرخت لہجے میں کہا ۔ کون ہے ؟

میں ہوں مل وانکر ۔

ارے ۔ کہاں ہو ابھی تک ۔ تاج محل سے بول رہے ہو ۔ میں نے پوچھا ۔

نہیں ! میں کولابے کے تھانے سے بول رہا ہوں ۔ مل وانکر نے بڑی گھبراہٹ میں جواب دیا ۔ پولیس نے مجھے گرفتار کر لیا ہے اور بلا ضمانت مجھے رہا نہیں کرتے ۔ آپ فوراً آ جائیے ۔

خیر صاحب میں رات کے تین بجے اٹھا اور بھاگا بھاگا تھانے گیا ۔ اور اُسے ضمانت پر چھڑا لیا ۔ اس کی نیکر پھٹی ہوئی تھی اور اُس کا منہ سوجا ہوا تھا اور اس کے چہرے پر خراشوں کے نشان تھے ۔

میں نے پوچھا ۔ تمھیں پولیس نے مارا ہے ۔

نہیں۔

پھر کیا بلیتوں سے پٹواتے رہے ہو۔

وہ بولا۔ ہاں بڑی شریف بلیاں تھیں۔ بڑی خوب صورت ساڑھیاں پہنے تھیں اور شراب میں دُھت تھیں۔

میں نے کہا۔ تم تھانے میں کیسے پہنچ گئے۔ میں نے تو تمہیں تاج محل ہوٹل بھیجا تھا۔

مل وانکر بولا۔ جی تو — آپ نے مجھے پہلے بتا دیا ہوتا۔ تو میں اپنے دو چار ایسے ساتھیوں کو لے جاتا۔ واں میں اکیلا تھا۔ پہلے تو وہ لوگ مجھے اندر گھسنے نہیں دیتے تھے۔ کیونکہ میرا لباس بہت شاندار تھا۔ یہ نیکر۔ یہ قمیص۔ یہ جوتا۔ وہاں کے تو بیرا لوگ بھی بہت اچھا لباس پہنتے ہیں، یہ آپ نے کیا کیا۔ اگر آپ کو مجھے وہاں بھیجنا ہی تھا تو کوئی سوٹ ہی دیا ہوتا یا کوئی عمدہ سا ہندوستانی لباس۔ یا کھدر کا سا براق کرتا۔ اور پاجامہ دھوتی۔ اور جواہر جیکٹ اور سر پر اک شفاف سی گاندھی ٹوپی۔ آج کل یہ ڈریس بھی خوب چلتا ہے واں۔ سُنا ہے کسی زمانے میں اس ڈریس کو واں گھسنے نہیں دیتے تھے۔ مگر آج رات کو تو واں اس لباس کی بہت عزت تھی۔

میں نے کہا۔ تم اپنی بات سناؤ۔

مل وانکر بولا۔ پہلے تو اُن لوگوں نے میری وضع قطع شکل شباہت پر اعتراض کیا۔ مگر چونکہ میری سیٹ بُک تھی۔ اور جب میں پہنچا عین اسی وقت نیتا جی سیڑھیاں چڑھتے آ رہے تھے اس لئے بٹلر نے مجھے اپنی پریشانی میں زیادہ دیر تک روکا نہیں۔ اُس کی نگاہ نیتاجی پر لگی تھی اور میں ہال کے اندر ہو لیا اور اپنی سیٹ پر جا بیٹھا۔ میرے میز پر دو جوڑے پہلے سے بیٹھے تھے۔ ایک پارسی جوڑا تھا۔ ایک گجراتی۔ دونوں شراب پی رہے تھے۔

ویٹر نے آکے مجھ سے پوچھا۔ آپ کیا پئیں گے۔

میں نے کہا۔ ٹھنڈا پانی۔

ویٹر ناک سکوڑ کے گردن اونچی کر کے اپنی کالی بو سنوارتا ہوا چلا گیا۔ وہ دونوں جوڑے میری طرف دیکھ کے بڑی حقارت سے مسکرائے۔ پھر انھوں نے گردن موڑ کے میک مین اینڈ بوائز کے بینڈ کی طرف دیکھا۔ جہاں سے اک نیا نغمہ بلند ہوا تھا اور جہاں سپید و سرخ لڑکیاں ہیولا ہیولا ہوائین رقص فرما رہی تھیں۔ یہ لڑکیاں دو اک جگہوں کے سوا بالکل ننگی تھیں۔ اور بار بار کولھے گھماتی پھرتی تھیں۔ ابھی ڈانس شروع ہی ہوا تھا کہ نیتاجی اندر داخل ہوئے اور یکایک ڈانس بند ہو گیا اور فضا میں بندے ماترم کا نعرہ گونج اٹھا۔

پھر نیتاجی کو ہار پہنائے گئے۔

تالیاں بجائی گئیں

ایڈریس پیش کیا گیا

تالیاں بجائی گئیں

ٹھہرو۔ ٹھہرو۔ میں نے مل وانکر کو ٹوک کے کہا۔ یہ تو تم نے بتایا ہی نہیں کہ ایڈریس میں کیا تھا۔ جواب کیا دیا گیا۔

مل وانکر نے بڑی حقارت سے کہا۔ ایڈریس میں وہی تھا جو ایسے ایڈریسوں میں ہوتا ہے۔ یعنی آپ بہت بڑے تیس مار خاں ہیں۔ اگر آپ نہ ہوں تو ملک ڈوب جائے۔ قیامت آ جائے۔ یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ ملک کی باگ ڈور آپ ایسے وغیرہ وغیرہ قسم کے دانش وروں کے ہاتھ میں ہے اور علیٰ ھذا القیاس۔ اور جواب بھی اسی قسم کا تھا۔ یعنی آپ لوگوں نے میری بڑی عزت افزائی کی ہے۔ میں در اصل بڑا آدمی نہیں ہوں۔ بڑے بڑے مسئلوں کا سایہ مجھ پر پڑ رہا ہے۔ ورنہ ابھی تو ملک کے سامنے بہت سے بڑے کام ہیں۔ ایسے بڑے کام ہیں جن کے متعلق بڑے سوچ بچار کی ضرورت ہے۔ اس وقت ملک کے سامنے بڑا ـــــ ـــــ ـــــ ہے اور اب میں نہیں جانتا کہ کیا ہوگا۔ آگے کیا ہونے والا ہے۔ کون اتنی بڑی ذمہ داری لے۔ اتنا کہہ سکتا ہوں۔ کہ آپ لوگوں کو میرے اوپر دشواش رکھنا چاہئے اور ملک میں بڑے امن سے رہنا چاہئے۔ اس کے لئے بہت ضروری ہے کہ آپ لوگ شراب نہ پئیں۔ سینما ہال میں سیگرٹ نہ پئیں اور بارہ بجے کے بعد کمبل اوڑھ کر سو جائیں۔ ورنہ ملک تباہ ہو جائے گا اور برلن کی طرح یہاں بھی کمیونزم پھیل جائے گا۔ اس لئے سرمایہ داروں کو چاہئے کہ وہ گورنمنٹ کا ساتھ دیں۔ اور میں مزدوروں کو متنبہ کرتا ہوں۔ کہ وہ ہڑتالیں نہ کریں۔ پیداوار کو بڑھائیں۔ اس موقع پر مجھ سے نہیں رہا گیا۔ میں نے اپنی سیٹ سے اچھل کر کہا: "میں آپ سے ایک سوال کرنا چاہتا ہوں"۔ سب لوگ میری طرف گھور گھور کر دیکھنے لگے۔ بیٹھ جاؤ۔ بیٹھ جاؤ۔ کی آوازیں آنے لگیں۔

میں نے کہا نیتاجی۔ میری تنخواہ چالیس روپیہ ہے۔

ایک آدمی بولا۔ چالیس روپے والے آدمی کا تاج میں کیا کام۔

" اسے باہر نکال دو۔ اسے باہر نکال دو۔ بہت سے روسا اک دم چیخے۔

میں نے کہا۔ نیتاجی۔ آپ مزدوروں کے بڑے حامی بنتے تھے آج آپ کو تاج محل میں آنے کی فرصت ہے۔ یونیورسٹیوں سے لایعنی ڈگریاں حاصل کرنے کی فراغت ہے۔ بے کار قسم کی کانفرنسوں میں شرکت

کرنے کے لئے وقت ہے۔ آپ کو ریلوے کے ایک غریب کلرک کی زندگی دیکھنے کی فرصت نہیں ہے۔ ذرا دو منٹ کے لئے میری کہانی سن لیجئے نا۔!؟

دیکھئے۔ میں ابھی آپ کو بتلائے دیتا ہوں۔ میرا نام مل وانکر ہے۔ میں نے اندکیبن نمبر ایک پر ....

"بیٹھ جاؤ۔ بیٹھ جاؤ۔ چپکے بیٹھے رہو" - دو ہمارے آدمیوں نے مجھے پکڑ لیا۔

میں نے چیخ کر کہا۔ نہیں میں نہیں بیٹھوں گا۔ میں اپنی کہانی سنا کے رہوں گا۔ میرے کپڑے پھٹے ہوئے ہیں۔ میرے گھر میں بچے بھوکے ہیں۔ میری دو بہنیں ہیں۔ جن کی مجھے شادی کرنی ہے اور میری تنحواہ چالیس روپے ہے۔ میں تو نیتا جی کو اپنی کہانی ضرور سناؤں گا وہ تو خود کہتے ہیں کہ وہ

اس پر بڑا غل ہوا۔ اور میری میز پر جو دو عورتیں بیٹھی تھیں۔ انھوں نے غصے میں آکے میرا منہ نوچ لیا۔ اور دو ایک خوش پوش آدمیوں نے مجھے مارا بھی۔ پولیس آگئی۔ اور اُس نے مجھے گرفتار کر لیا۔ اور کولابے کے تھانے میں لے گئے

میں سر ہلا کے ہنسنے لگا "تو تمھاری کہانی وہاں کبھی کسی نے نہیں سُنی"

مل وانکر نے غصے میں آکے مجھ سے کہا۔ آپ نے مجھے وہاں بھیجا ہی کیوں تھا۔ وہاں کسے فرصت ہے ان باتوں کی۔ آپ نے خواہ مخواہ مجھے ان کے عیش و آرام میں خلل ڈالنے کے لئے بھیج دیا۔ مگر اس سے کچھ ہوا تھوڑی ہی۔ تھوڑی دیر کے لئے بدمزگی پیدا ہوئی۔ پھر سب لوگ ہنسنے لگے۔ جب میں ہال سے باہر نکالا جا رہا تھا۔ سب لوگ مجھ پر ہنس رہے تھے۔ اور میک مین کے بنیڈ نے اک نیا ہوائین رقص شروع کیا تھا۔

مل وانکر نے سر ہلا کے کہا۔ اب میں وہاں کبھی نہ جاؤں گا اور وہ میری طرف پیٹھ موڑ کے الگ بیٹھ گیا۔ روٹھے ہوئے بچے کی طرح۔

میں بہت دیر تک سر کھجاتا رہا۔ کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ اب کیا کروں اسے کہاں بھیجوں۔ آخر سوچ سوچ کے میں نے مسخروں والا لباس تیار کیا۔ اور اُسے کہانی کو پہنایا۔ میں نے کہانی کی ستواں ناک کو موٹا کر دیا اس کے سرخ ہونٹوں کو سفید کر دیا۔ اُس کی بے داغ تیوری پر ایک بہت بڑا مسا لگایا۔ اور اُس کے سر پر ایک لمبے پھندنے والی تکونی ٹوپی پہنا کر اُس سے کہا۔ جاؤ۔ جہاں پر ننھے ننھے بچے کھیلتے ہیں اور بے فکر اور

معصوم روحیں مسکراتی ہیں۔ یہ تتلاتی ہوئی ننھی دنیا تمھاری پیاری پیاری کہانیاں سنیں گی۔ اور زندگی میں پھر سے پرستانوں کی بہار آجائے گی۔ جاؤ۔ مسخرے جاؤ۔ تم ریچھ کی طرح ناچو، مداری کی طرح ڈگڈگی بجاؤ۔ اور بندر کی طرح ناچ ننھے بچوں کی دنیا میں ہنسی کے فوارے اچھال دو۔

مسخرہ اپنا گدھے کی جھول سنبھالتا ہوا مجھ سے رخصت ہوا اور کوئی پانچ چھ دن تک واپس نہیں آیا۔ میں نے سوچا خلاف معمول اب کے کہانی لمبی ہو گئی۔ میں تو اتنی لمبی کہانیاں نہیں لکھتا ہوں اب کے کہانی کو کیا ہوا جو اس قدر لمبی ہو گئی۔ ابھی تک آئی نہیں۔ ہفتہ ہونے کو آیا۔ اتوار کے روز جب میں ترقی پسند مصنفین کے جلسے میں شرکت کے لئے جا رہا تھا کسی نے دروازے کی کنڈی کھٹکھٹائی۔ میں نے دیکھا مسخرہ ہے۔ لیکن تکونی ٹوپی غائب ہے۔ ناک موٹی نہیں ہے ٹھوڑی سے مسا غائب ہے گدھے کی جھول نہیں پہن رکھی ہے بلکہ سپاہیوں والا لباس پہنے دروازے پر کھڑا لفٹ رائٹ کر رہا ہے

میں نے ڈرتے ڈرتے دروازہ کھولا۔

کیا مجھے گرفتار کرنے آئے ہو۔ میں نے کہانی سے پوچھا۔

مسخرہ میرے سامنے نشست پر بیٹھ گیا۔ رائفل کو تھام کے بولا۔ ہاں کچھ ایسی ہی بات ہے۔

کیوں کیا ہوا۔

مسخرہ چپ رہا۔ بہت دیر کے بعد بولا۔

اب کے میں بہت خوش تھا سوچا تھا۔ خوب خوب لوگوں کو ہنساؤں گا۔ سٹیشن کے قریب ہی مجھے سات آٹھ سال کا بچہ مل گیا وہ میری طرف بڑی دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔ میں نے اُس کے پاس جا کے کہا کہانی سنو گے۔ بڑی اچھی کہانی ہے میرے پاس۔

وہ بولا۔ میرے پاس کہانی سننے کا وقت نہیں ہے۔ کیوں کہ میرے ماں باپ مر چکے ہیں۔ اور اب میں ریل میں سنترے کی گولیاں بیچتا ہوں۔ میری ایک چھوٹی سی بہن بھی ہے۔ اُسے دیکھو گے۔

وہ مجھے سٹیشن سے باہر لے گیا۔ ایک کونے میں ایک بچی پڑی تھی اور چپ چاپ ہاتھ پھیلائے بھیک مانگ رہی تھی۔

وہ بولا۔ جب ہم لوگ کراچی میں رہتے تھے تو رات کو بڑی اچھی اچھی کہانیاں سنتے تھے۔ اب ہمارے پاس کہانی سننے کے لئے وقت نہیں ہے۔ سنترے کی گولیاں لو گے۔ ایک آنے میں چھ۔ ایک آنے

۴۳

ہیں چھ - ایک آنے میں چھ - پھر وہ کڑک کے بولا - اگر تم اپنا لباس مجھے دیدو - تو میرا خیال ہے کہ بہت سے لوگ مجھ سے سنترے کی گولیاں خرید لینگے -

میں وہاں سے بھاگ نکلا

وہاں سے نکل کر میں ایک گلی میں گھس گیا - چند لونڈے پتنگ بنا رہے تھے - میں نے کہا میں تمہیں رنگا رنگ پتنگوں کو اونچا سب اونچا اڑانے کا طریقہ بتاتا ہوں - یہ طریقہ میں نے زعفران دیس کی پری سے سیکھا تھا - زعفران دیس کی پری -

میں یہاں تک کہنے پایا تھا کہ اُن میں سے ایک لڑکا بول اٹھا - بڑے میاں کیوں ہمارا وقت خراب کرتے ہو - ہم لوگ پتنگ بناتے ہیں، پتنگ اڑاتے نہیں ہیں - وہ دوسرے بچے ہوتے ہوں گے - ہم لوگ اگر شام تک پچاس پتنگ نہیں بنائیں گے تو بھوکے مرجائیں گے - تم یہاں سے نو دو گیارہ ہوجاؤ -

میں وہاں سے نو دو گیارہ ہوگیا - اور ایک گھر کے اندر گھس گیا - باہر دروازے پر تالا تھا - لیکن میرے لئے کیا روک ٹوک تھی - میں گھر کے اندر گھس گیا - کیوں کہ گھر کے اندر سے برابر چلانے کی آواز آرہی تھی - اندر جاکے میں نے دیکھا کہ ایک کانا بچہ ہے بمشکل سے چار سال کا ہوگا اور وہ ایک دودھ پیتی بچی کو پیٹ رہا ہے

میں نے اُسے کہا - بچے بچوں سے پیار کرتے ہیں، پیٹتے نہیں ہیں -

یہ روتی ہے - بچے نے جواب دیا -

یہ کیوں روتی ہے - میں نے پوچھا -

یہ بھوکی ہے -

اس کی ماں کہاں ہے

ماں کارخانے گئی ہے

باپ کہاں ہے -

باپ بھی کارخانے گیا ہے -

ماں اس کو کارخانے کیوں نہیں لے گئی -

ماں کام کرتی ہے - ماں کارخانے گئی ہے - یہ بھوکی ہے - میں بھی بھوکا ہوں - یہ روتی ہے - میں اس کو مارتا ہوں -

میں نے کہا - اسے مارو نہیں - دیکھو پھر ہم تمھیں بڑی اچھی کہانی سناتے ہیں - ایک تھا بادشاہ!

بادشاہ لوگ بہت بُرے ہوتے ہیں - لڑکے نے کہا

تم سے کس نے کہا - میں نے پوچھا -

باپو کہتے ہیں - بادشاہ اچھے نہیں ہوتے - وہ بھوکا رکھتے ہیں -

اچھا تو ہم تمھیں پریوں کی کہانی سناتے ہیں - واں بھوک نہیں ہوتی - پریوں کا دیس بڑا سندر ہے - وہاں بڑے سندر مکان ہوتے ہیں - واں پر شہد اور دودھ کی نہریں ہوتی ہیں -

آہاہا - دودھ - ہمیں دودھ ہی تو چاہئے - لڑکا اچھل پڑا - تم کہانی تو سنو -

نہیں - ہمیں دودھ دو - ہماری بہن دودھ مانگتی ہے یہ روتی ہے - ہم اسے مارتے ہیں -

اور اس پریوں کے دیس میں ایک دن پریم کا راجہ ......

ہمیں پریم کا راجہ نہیں - دودھ چاہئے - پریم کا راجہ نہیں سنتے ہم - دودھ - دودھ - دودھ -

لڑکا زور زور سے رونے لگا - اور اپنی ننھی بہن کو پیٹنے لگا

میں جلدی سے وہاں سے نکل آیا - پھر وہاں نکل کر میں بہت سی جگہوں پر گیا - بہت سی گلیوں میں - بازاروں میں - گلی کوچوں میں - کھیتوں میں، جنگلوں میں - شہروں میں - دیہاتوں میں - کسی بچے نے میری کہانی نہیں سنی، وہ سب پریشان ہوچکے ہیں - بوڑھے ہوتے جارہے ہیں اور اُن کی ہنسی کمھلائے پھول کی طرح مرجھا کر فرش خاک پر گرچکی ہے -

تو اب تم یہ سپاہی کا لباس پہن کے کیوں آئے ہو؟

وہ بولا - اس لئے کہ اب میں لڑنا چاہتا ہوں - اس ہنسی کے لئے لڑنا چاہتا ہوں - میں نے سنا ہے کہ چین میں ایک کسان ہے لی اس کا نام ہے - وہ اس ہنسی کے لئے لڑ رہا ہے - اور میں نے یہ سنا ہے کہ انڈونیشیا میں ایک نورالدین کسان کی ہے - اور وہ اس کے لئے لڑ رہا ہے اور میں نے سنا ہے کہ یونان میں ایک لوہار ہے مارکوس وہ اس کے لئے لڑ رہا ہے - اور میں نے سنا ہے کہ برما اور ملایا اور ہند چینی کے گھنے جنگلوں میں چھوٹے چھوٹے بچے بھی اس کے لئے لڑ رہے ہیں - میں بھی اس ہنسی کے لئے لڑوں گا - اب میں ایک خوبصورت رقاصہ نہیں بننا چاہتا - ہنسانے والا مسخرہ بھی نہیں بننا چاہتا - کمزور احتجاج کرنے والا - کلرک بھی نہیں بننا چاہتا - میں چاہتا ہوں کہ مجھے ایک معمولی سی کارتوس کی گولی بنادو - اور مجھے وہاں بھیج دو - جہاں انسان، انسان پر ظلم کے خلاف لڑ رہا ہے -

عابد حشری

سویرے سویرے

کبھی تو میری زندگی کے اُفق سے چھٹینگے یہ پُر ہول، خونیں اندھیرے
شبِ تار کے مُلگجے آنچلوں سے کہاں تک نہ برسیں گے نوری سویرے
غریبوں کی کٹیا ہو یا قصرِ شاہی یہاں بھی دُھندلکے وہاں بھی اندھیرے
یہ دُنیا ہے یاں چین لینے نہ دینگے سماجی درندے رواجی لٹیرے
گذرنے بھی دے یہ غبارِ منظم نکلنے بھی دیں یہ مسلسل اندھیرے
بڑی دیر سے منتظر ہیں ہمارے گلابی اُجالے شہابی سویرے
چل اپنے لئے اب نئی راہ ڈھونڈیں کریں کیوں لحاظِ رواجِ زمانہ
یہ دُنیا کی رسمیں نہ تجھ سے نہ مجھ سے یہ دُنیا کے بندھن نہ تیرے نہ میرے
مجھے اپنے دامن کی پہنائیوں میں جگہ دے بھی دو اب روپہلی اُجالو
میری جستجو میں ہے ظلمت جہاں کی مجھے ڈھونڈتے پھر رہے ہیں اندھیرے
وہ یوں روح میں ڈوبتے جا رہے ہیں وہ یوں میرے احساس پہ چھا رہے ہیں
فضا میں دبے پاؤں سورج کی کرنیں بکھر جائیں جیسے سویرے سویرے
زمانے نے لی کیسی کروٹ یہ حشری یہ کیا ہو گیا مسکراتے دلوں کو
جو انساں کبھی تھے امینِ محبت وہ انسان اب بن گئے ہیں لٹیرے

مضطر اکبر آبادی

غمِ زمانہ

خیالِ امروز، فکرِ فردا، غمِ محبت، غمِ زمانہ
عجب تماشا سا بن گیا ہے چمن میں تعمیرِ آشیانہ
گزر گیا دورِ بند شوں کا سمٹ گئی گردشِ زمانہ
جمالِ ساحل نظر سے اوجھل ادھر بھی طوفاں ادھر بھی طوفاں
حقیقتِ مرگ و زیست پر کیوں اُلجھ رہے ہو اُلجھنے والو
نہ اب ہے وہ دورِ بیقراری نہ اشکباری نہ آہ و زاری
اگرچہ میں خوش دلی سے سہتا رہا زمانہ کے ناز بیجا

یہی مری مختصر حقیقت یہی مرا مختصر فسانہ
کبھی فسانہ نما حقیقت کبھی حقیقت نما فسانہ
جو آشیانہ کبھی قفس تھا وہی قفس اب ہے آشیانہ
ہوا مخالف بھنور میں کشتی یہیں مناسب ہے ڈوب جانا
حقیقتِ مرگ بھی فسانہ حقیقتِ زیست بھی فسانہ
یہ کس کا نام آگیا زباں پر کہ تھم گئی گردشِ زمانہ
مگر مجھے ہر قدم پہ مضطر فریب دیتا رہا زمانہ

خواجہ غلام السیدین

مشیر تعلیم حکومت بمبئی

مغرب کا اثر اخلاق و عادات پر!

ہندستان پر مغرب کے اثر کا اندازہ کرنے کے لئے یہ ایک مناسب موقع ہے کیونکہ ابھی ہم حال ہی میں مغرب کی سیاسی غلامی سے آزاد ہوئے ہیں۔ اس عرصے میں باوجود اس سیاسی کش مکش کے جو ہندستان اور برطانیہ میں ہوتی رہی، مغرب نے ہماری تہذیب اور تمدن، ہمارے رہنے، ہماری زبان اور ادب، ہماری ذاتی اور قومی سیرت پر بہت گہرا اثر ڈالا ہے۔ تقریروں کے اس سلسلے میں اس اثر کے مخالف پہلو آپ کے سامنے پیش کئے جائیں گے۔ میرا کام آج یہ ہے کہ مغرب نے ہمارے اخلاق و عادات پر جو اثر ڈالا ہے اس کا تجزیہ کروں۔ زندگی کو بنانے اور عمدگی کے ساتھ چلانے کا ایک سنہرا اصول یہ ہے کہ ہم اچھی چیزوں کو اختیار کریں اور بُری چیزوں کی طرف سے منہ موڑ لیں۔ اب جب کہ آزادی نے ہمارے سامنے ترقی کے راستے کھول دیئے ہیں اور ہم ایک نئے تمدن اور نئے سماج کو بنانے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔ ہمیں چاہئے کہ بے لاگ طریقہ پر مغربی میراث کی جانچ کریں اور اس میں جو اچھی چیزیں ہیں انہیں کھلے دل سے اپنا لیں۔ ہماری ہندستانی تہذیب کو اس بات پر ناز ہے کہ اس کا دامن مختلف اثروں کو قبول کرنے کے لئے کھلا رہا ہے۔ اور اس نے ہمیشہ ان کو ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس نے مختلف مذہبوں، تہذیبوں اور قوموں سے اچھی چیزیں لیں اور ان کو سمو کر وہ حسین ہم آہنگی پیدا کی جو کہیں تاج محل کی شکل میں نظر آتی ہے۔ کہیں تان سین کی موسیقی میں جھلکتی ہے کہیں کبیر اور نانک کی بھگتی میں جلوہ دکھلاتی ہے۔ کہیں اکبر کی گنگا جمنی تہذیب کا رنگ اختیار کرتی ہے۔ کہیں ٹیگور اور اقبال کی شاعری میں دل کے تار ہلاتی ہے۔ کہیں حکیم نابینا کی انگریزی نظموں پر جواہرلال کی بین الاقوامی سیاست میں ظاہر ہوتی ہے اور کہیں مہاتما گاندھی کی انسان دوستی میں زمان اور مکان کی حدوں کو توڑ کر ایک عالمگیر قوت بن جاتی ہے۔ یہ سچ ہے کہ آج بہت سے لوگ اس طرح کی باتیں کرتے ہیں۔ گویا ہندستان کی تہذیب کسی خاص قوم، کسی خاص نسل، جماعت یا مذہبی گروہ کی خاص ملکیت ہے۔ جس میں بعض نامناسب چیزیں زبردستی شامل ہو گئی ہیں۔ لیکن یہ خیال غلط ہے۔ تہذیب کے ٹکڑے نہیں کئے جا سکتے۔ اگر آپ انسانی خون کو اس کے اجزا میں تقسیم کر سکیں نغمے میں سے اس کے زیر و بم کو جدا کر سکیں۔ خوب صورت ریشم کے ٹکڑے کا تانا بانا الگ کر کے دکھا سکیں، ادب کی شیرینی، اثر اور قوت میں سے مختلف جماعتوں کا حصہ الگ الگ نکال کر رکھ دیں، اگر آپ یہ سب کچھ کر سکیں اور خون، خون رہے، نغمہ، نغمہ رہے۔ ریشم، ریشم رہے۔ ادب، ادب رہے، اس وقت آپ ہندستانی تہذیب کے بھی حصے بخرے کر سکتے ہیں۔ اور اس کو خاص ورثہ قرار دینے کے خواب دیکھ سکتے ہیں۔

خیر، کہنا یہ تھا کہ جس تہذیب کی genius (جینس) اور تاریخ اس قسم کی ہو، اس کے لئے یہ کیسے ممکن ہو سکتا تھا کہ وہ مغرب کا اثر قبول نہ کرتی خصوصاً جب مغرب کی تہذیب ایک حاکم قوم کی تہذیب بن کر آئی تھی۔ عربی کا ایک مشہور قول ہے کہ لوگ اپنے حاکموں کے راستے پر چلتے ہیں۔ ہندستانیوں نے بھی ایسا ہی کیا۔

لیکن یہ ایک دم نہیں ہو گیا بلکہ اس کی ایک دلچسپ تاریخ ہے جس کی تفصیل کا موقع نہیں۔ ابتدا میں انگریز تاجروں اور مشنریوں کی حیثیت سے آئے تھے۔ ہندستانی اس وقت اپنی تہذیب کو بہت بلند سمجھتے تھے۔ اور مغرب سے آئے ہوئے یہ لوگ، جن کی

چوڑی گودری تھی، اور جن کا لباس، کھانا پینا، رہنا سہنا، بول چال سب ہم سے الگ تھی۔ انھیں کچھ عجیب اور مضحک سے معلوم ہوتے تھے۔ اگر آپ اٹھارہویں اور انیسویں صدی کی لکھی ہوئی چیزیں پڑھیں تو آپ دیکھیں گے کہ ہمارے لکھنے والے اور شاعر ان کا مذاق اڑاتے تھے، لیکن رفتہ رفتہ ان کے ہاتھ میں سیاسی قوت آنے لگی، اور ملک کے حالات سے فائدہ اٹھا کر انھوں نے یہاں اپنی حکومت قائم کر لی۔ اس تبدیلی سے ساری صورت حال ہی بدل گئی۔ ان کا لباس جو بے ڈھنگا سمجھا جاتا تھا، اب تہذیب اور شان کی علامت بن گئی، ان کی زبان، حکومت کی زبان بنی، اور اس کی نقل کرنا کمال سمجھا جانے لگا۔ چھری کانٹے سے کھانا، جسے ہمارے بزرگ برا سمجھتے تھے، اب فیشن میں داخل ہو گیا۔ چال ڈھال، نشست و برخاست، رہنے سہنے کے ڈھنگ نئے سانچے میں ڈھلنے شروع ہوئے۔ اور شعبۂ زندگی میں انگریزی تعلیم یافتہ لوگوں نے انگریزی تہذیب کی نقل شروع کر دی۔ وہ اس کی ظاہری چمک دمک سے اس قدر چکا چوند ہوئے کہ انھیں اس کے مقابلے میں اپنی چیزیں گھٹیا اور نقلی معلوم ہونے لگیں۔ ان میں سے بعض کی سب سے بڑی آرزو یہ تھی کہ زبان کو مروڑ کر انگریزی اس طرح بولیں کہ ناواقف آدمی انھیں تازہ ولایت اور آکسفورڈ کی پیداوار سمجھے، ان کے پتلون کی کریز اور اپنے بزرگوں کی تلوار سے زیادہ تیز ہو، کپڑے لندن کے سلے ہوئے اور پیرس کے ڈھلے ہوئے معلوم ہوں۔ اپنے میل جول کے طریقوں اور آداب نشست و برخاست میں بھی انھوں نے اپنی تہذیب کی روایات کو چھوڑ کر، مغربی طریقے جو ایک دوسرے ماحول کی پیداوار تھے، بغیر سوچے سمجھے، بغیر تنقید کے اختیار کر لیے جس وقت انیسویں صدی اپنے آخری سال گزار رہی تھی۔ ہندستان کی تعلیم یافتہ نوکری پیشہ جماعت مغربی تہذیب کے سامنے ہتھیار ڈال چکی تھی۔

لیکن اس دور کی بڑی خرابی یہ نہ تھی کہ انھوں نے اپنا لباس اور وضع قطع بدل لی بلکہ وہ اپنی قومی خصوصیتوں کو، اپنی قومی خودداری کو، اپنی عزت نفس کو بھلا بیٹھے، اپنی ہر چیز کو حقیر اور مغرب کی ہر چیز کو برتر سمجھنے لگے۔ دراصل غلامی کا اثر کسی قوم کی سیرت اور اخلاق و عادات پر ہمیشہ بہت خطرناک ہوتا ہے۔ ایک آزاد خود مختار ملک میں وہ لوگ عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں جو ملک کی خدمت اور سماج کی سیوا کرتے ہیں۔ سائنس، ادب، فلسفہ، آرٹ وغیرہ میں نام پیدا کرتے ہیں۔ انھیں کو بڑے اعزاز اور عہدے ملتے ہیں۔ لیکن ایک غلام ملک میں ان چیزوں کی کوئی خاص پوچھ نہیں ہوتی۔ وہاں بڑائی ناموری اور سرداری ان لوگوں کے لئے ہے جو حاکم قوم کا آلۂ کار بنتے ہیں۔ ان کے مفاد اور اغراض کی خدمت کرتے ہیں، محکوم قوم کو دبا کر رکھنے میں اس کی مدد کرتے ہیں اور خوشامد، جھوٹ اور ناحق کا ساتھ دے کر اپنا مطلب نکالتے ہیں۔ حکومت ایسے لوگوں کی دل سے عزت نہیں کرتی۔ لیکن اپنی غرض سے انھیں آگے بڑھاتی ہے یہی وجہ ہے کہ جس حکومت نے مدتوں گاندھی جواہر لال، موتی لال اور لاجپت رائے، سی۔ آر داس، ابوالکلام اجمل خاں، ڈاکٹر انصاری اور محمد علی کو جیل میں بند رکھا اور ان کے ساتھ سیاسی اچھوتوں کا سا سلوک کیا اس نے بہت سے ایسے لوگوں کو عہدے اور اعزاز دئے جو لیاقت، دیانت داری اور فرض شناسی قوم پرستی اور سیاسی سوجھ بوجھ میں ان کے پاسنگ بھی نہ تھے نتیجہ یہ ہوا کہ وہ لوگ جن میں نہایت سخت اصول پرستی، دلبستگی اور ایثار کی صلاحیت نہ تھی۔ ذلت کے آسان اور آرام دہ راستے کی طرف پھسل پڑے اور اس زمانے میں ہمارے تعلیم یافتہ انگریزی خواں طبقے میں محب وطن اور بااصول لوگ کم اور ابن الوقت زیادہ پیدا ہوئے۔ ان میں قومی خودداری کے بجائے خوشامد، سچائی کے بجائے مصلحت پرستی، بہادری کے بجائے خوف، قومی ضرورت کی لگن کے بجائے خود غرضی کی جڑیں پکڑ گئیں۔ ان کو عوام کے ساتھ یک جہتی کا احساس نہیں رہا اور خود کو ایک الگ ذات سمجھنے لگے اور بجائے جنتا کا دکھ درد بٹانے اور ان کا بوجھ ہلکا کرنے کے خود اپنے حلوے مانڈے کی فکر میں پڑ گئے۔ یہ مغرب کے اثر کا تاریک ترین پہلو ہے۔

لیکن شروع سے ہی اس تحریک کی مخالفت بھی ملک میں موجود تھی۔ جو مختلف شکلوں اور مختلف وجوہ سے ظاہر ہوتی رہی۔ انیسویں صدی میں بھی بعض گروہ ایسے تھے جو کسی دام اپنی تہذیب اور اپنی روایتوں کو ہاتھ سے دینے کے لئے تیار نہیں۔ ان میں خاص طور پر قابل ذکر مسلمانوں کی ایک مذہبی جماعت تھی جو مغربی تہذیب اور عیسائی مذہب کے پرچار کو ایک دوسرے سے وابستہ سمجھ کر چاہتے تھے کہ

مسلمان انگریزی تعلیم، انگریزی زبان اور انگریزی نوکریوں سے بالکل الگ ہیں۔ اکبر الہ آبادی نے اپنی شاعری میں ان لوگوں کا پُرتکلف خاکہ، اڑایا ہے۔ جو مغرب کی اندھی تقلید میں گرفتار تھے۔ اور نذیر احمد نے اپنے ناول ابن الوقت میں اس تحریک پر سنجیدگی کے ساتھ بحث کی ہے۔ لیکن اس کے خلاف جو زیادہ گہرا اور بااثر ردِعمل شروع ہوا وہ ہماری سیاسی بیداری کا ایک پہلو تھا، اور اس نئی تحریک کی قیادت، جس کا مقصد ہندستانیوں میں سچی خودداری پیدا کرنا تھا، گاندھی، ٹیگور اور اقبال نے کی۔

ان تینوں رہبروں میں کوئی بھی مغرب کا مخالف اور اس کی ہر چیز سے بیزار نہ تھا۔ انھوں نے خود بہت کچھ مغرب سے حاصل کیا تھا، اور وہ اس کی اچھی اور بنیادی چیزوں کی قدر کرتے تھے لیکن انھیں اس کا احساس تھا کہ کوئی قوم ذہنی اور تہذیبی غلامی کی حالت میں ترقی نہیں کر سکتی۔ اپنی خودی کا، اپنی صلاحیتوں کا اظہار نہیں کر سکتی۔ اس لئے اس کو جرأت اور روشن خیالی کے ساتھ مغرب کی تنقید کرنی چاہئے۔ اس میں جو ناقص عناصر ہیں ان کو نکالنا چاہئے جو اچھی چیزیں ہیں ان کو اپنی تہذیب میں شامل کر لینا چاہئے۔ ٹیگور نے ہندستان کو، اس کی تہذیب اور آرٹ کے خزانوں کی طرف متوجہ کیا۔ اس کے اخلاقی اور روحانی اصولوں کی یاد دلائی اور مغرب کو انسانیت اور محبت کا اپدیش سنا کر ہندستانیوں میں از سرِ نو عزتِ نفس کا احساس پیدا کیا۔ گاندھی جی نے ان تمام اثروں کے خلاف جہاد کیا جنھوں نے ہندستانی سیرت کو کمزور اور ان کی قوتِ عمل کو شل کر دیا تھا انھوں نے لوگوں کو عیش پرستی کے بجائے سادگی، الیکھ کے بجائے سماج سیوا کا سبق دیا۔ ان کی تحریک کا مقصد تھا کہ لوگوں میں ایسی سیرت پیدا ہو جائے کہ وہ آزادی حاصل کر سکیں اس کی فضا میں سانس لے سکیں، اور اس کی حفاظت کر سکیں۔

اقبال کا عقیدہ یہ تھا کہ جب تک کوئی فرد یا جماعت، اپنی خودی کی گہرائیوں میں ڈوب کر موتی کی سی آب اور سختی نہیں پیدا کرتی وہ کمزور اور بے اثر رہتی ہے۔ غلامی، تقلید اور سوال کی عادت نے ہندستانیوں کو بے بس بنا دیا تھا اقبال نے انھیں خود اعتمادی اور سربلندی کی تعلیم دی۔ انھیں اس بات کا گلہ ہے کہ ہندستان نے اپنی تہذیب اور اپنی آزادی کا موتی کھو کر گردن میں غلامی کی زنجیر ڈال لی ہے اور ان کو شکایت مغرب سے نہیں بلکہ خود ہندستان سے تھی۔

معلوم کسے ہند کی تقدیر کہ اب تک ✧ بے چارہ کسی تاج کا تابندہ نگیں ہے
جاں بھی گروِ غیر، بدن بھی گروِ غیر ✧ افسوس کہ باقی نہ مکاں ہے نہ مکیں ہے

یورپ کی غلامی پہ رضامند ہوا تو!
مجھ کو تو گلہ تجھ سے ہے، یورپ سے نہیں ہے

اس لئے ہم اب اس منزل پہ پہنچ گئے ہیں کہ جب اپنی خوشی اور عقل کے مطابق مغرب سے استفادہ کر سکتے ہیں۔ ہم نے ان سے بہت کچھ حاصل کیا ہے، انگریزی ادب اور انگریزی فکر کی دولت سیاسی اور سماجی زندگی کے نئے ڈھنگ، سائنس اور ڈاکٹری کے جدید آلات اور دریافتیں، مکان، لباس، خوراک، سیر و تفریح میں نئے راستے، سفر کے نئے طریقے، اور صنعت و حرفت کی نئی مشینیں، ان سب نے ہمارے خیالات اور عادات پر بہت گہرا اثر ڈالا ہے مغربی تہذیب کی ان جدید لوازم میں ایک طرف ریلیں، موٹریں، ہوائی جہاز، ڈاک، تار اور کارخانے چلانے والی مشینیں شامل ہیں۔ دوسری طرف علاج کے نئے نئے ڈھنگ اور سرجری کے نئے نئے آلات، تیسری طرف ملک کی پیداوار بڑھانے کے سائنٹفک طریقے اور چوتھی طرف اخبار، چھپی ہوئی کتابیں، گراموفون، ریڈیو اور سینما، جن کے ذریعہ لوگوں کی تعلیم اور تفریح کا انتظام کیا جاتا ہے یہ سب ہماری زندگی میں شامل ہو گئے ہیں، اور اس کا صرف اتنا ہی مطلب نہیں کہ وہ ہماری مادی معاشرت کا جزو بن گئی ہیں۔ بلکہ ان میں سے ہر ایک نے ہمارے خیالوں اور عادتوں پر اثر ڈالا ہے، اور ان کو نئے سانچے میں ڈھالا ہے۔ جو آدمی بیل گاڑی کو چھوڑ کر موٹر میں سفر کرتا ہے، وہ صرف فاصلہ کو ہی تیزی سے طے نہیں کرتا بلکہ دوسرے ملکوں اور قوموں کے متعلق اس کا نقطۂ نظر بھی بدل جاتا ہے، اخبار سے دنیا کے حالات بھی باخبر رکھتے ہیں اور اکثر اس کی ذہنی آزادی بھی چھین لیتے ہیں۔ ریڈیو اور سینما، اس کا دل بھی بہلاتے ہیں لیکن اکثر اس کی تخلیقی قوتوں کو کم کر کے اس کی تفریح کو مشینی بنا دیتے ہیں۔ یہ سب اثر ہم پر بھی ہوتے ہیں اچھے اور برے، لیکن، بدقسمتی سے اب تک ان چیزوں کے ساتھ غلامی کے رشتے کا زہر بھی ملا ہوا تھا۔

اب ہم اس اثر سے آزاد ہو کر ان کو اپنی تہذیب کی قوت اور دولت میں شامل کر سکتے ہیں اور مجھے امید ہے کہ ہم اس معاملے میں تنگ نظری سے کام نہیں لیں گے، ہندستان کی تہذیب ہمیشہ بڑھتی اور پھیلتی رہی ہے۔ اور اب اس زمانے میں جب بین الاقوامی میل جول بڑھ گیا ہے ہم اپنی پرانی روایات کو ترک نہیں کر سکتے ہمیں ان میں اور زیادہ جان ڈالنی ہوگی۔

(بہ اجازت آل انڈیا ریڈیو بمبئی)

اختر الایمان

ایک پرتو

قمر کی فرحت نواز کرنیں لئے ہیں آغوش میں وہ دنیا
جہاں ابھی محوِ خواب ہوں گی وہ سُرمگیں غم فروز آنکھیں
ہراک شجر سوگیا، زمیں پر لطیف کرنوں کے جال پھیلے
ہرایک شاخِ خزاں رسیدہ کی پھیل کر رہ گئی ہیں باہیں!
خدا کی مخلوق سوگئی ہے فریبِ صبحِ بہار کھا کر
سکوں کے دامن میں فکرِ امروز گر پڑی ہے نڈھال ہوکر
مرے تخیّل سے ایک پرتو اُبھر رہا ہے سوال ہوکر
یہ غم کی لہریں جو ہر تمنّا سے کھیلتی ہیں مآل ہوکر
یہ شب کی حسرت بہ دوشِ مستی جو چھوڑ دیتی ہے آزما کر؟
دیارِ محبوب کی خموشی کہیں تجھے سنگ ہی نہ کردے
حسین امیدوں کا یہ تلاطم ترے نفَس میں نہ زہر بھر دے

سلام مچھلی شہری

غزل

آجکل جس سے کچھ شکایت ہے — یاسمیں رُخ ہے، سرو قامت ہے
شادمانیٔ زندگی معلوم — پھر غمِ زندگی کی حسرت ہے
مجھ کو دیکھو، سجو، پھلو پھولو — آئینے کی بھی کیا ضرورت ہے
انہیں اُجڑی ہوئی نگاہوں سے — گلستانوں کی زیب و زینت ہے
یہ غزل کچھ نہیں سلام! مگر — ہم نئے شاعروں کی جرأت ہے

ممتاز حسین

کچھ فسانہ کچھ حقیقت!

افسانے کی تکنیک پر انگریزی زبان میں بہت سی کتابیں ہیں۔ اور ان تمام کتابوں نے افسانے کی ہیئت پر کافی زور دیا ہے۔ لیکن دشواری تو یہ ہے کہ افسانے کی تکنیک نئے مواد سے ہم آہنگ ہو کر ہمیشہ بدلتی رہی ہے۔ چنانچہ اگر آپ کلاسکی انداز میں افسانے کی تعریف اور اس کے قواعد و ضوابط متعین بھی کر دیں تو کچھ زیادہ فائدہ نہیں پہنچے گا۔ کیونکہ وہ تمام اصناف سخن جن کے قواعد اور ضوابط یونانیوں نے بنائے تھے آج کچھ اس طرح بدلے نظر آ رہے ہیں کہ اگر آپ اس کلاسکی معیار پر جانچنے کی کوشش کریں گے تو آپ کو بڑی مایوسی ہوگی۔ ڈرامے کو لیجئے، اس کی صورت یونان میں کچھ رہی تو کلیسا نے کچھ کر دیا۔ جب یورپ میں احیاء علوم کا زمانہ آیا تو نو کلاسکی تحریک کی ذہن میں یونانی ڈرامے کے بہت سے قواعد کو برتنے کی کوشش کی گئی لیکن رومانوی ادیبوں نے اس کی سخت مخالفت کی پھر تو ڈرامہ زمان و مکان اور عمل کی وحدت سے بھی آزاد ہو گیا۔ جب رومانیت سے حقیقت نگاری کا دور آیا تو ڈرامہ مسائلی مباحث کا ترجمان بن گیا۔ اکسن اور برناڈ شا پیدا ہوئے۔ بیسویں صدی میں یہ مختصر ہو کر مختلف تنوعات کا حامل بنا رہا لیکن ان تمام تغیرات میں کوئی نہ کوئی چیز ثابت اور پایندہ ضرور رہی ہے۔ آپ ڈرامے کو افسانہ نہیں کہتے ہیں خواہ وہ صرف پڑھنے ہی کے لئے کیوں نہ لکھا جائے آپ پانچ ایکٹ کے طویل ڈراموں کو ناول بھی نہیں کہتے ہیں۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ ڈرامے کی کوئی نہ کوئی خارجی ہیئت ایسی ضرور ہے جو باوجود تبدیلیوں کے ابھی تک اپنی جگہ پر قائم ہے اور آپ اسی ہیئت کی بنیاد پر اسے دوسری صنفوں سے ممتاز کر لیتے ہیں انھیں معنوں میں افسانے یا کہانی کی بھی ایک خارجی ہیئت ہے، اور اس خارجی ہیئت کو قائم رکھنا افسانے میں بہت ضروری ہے۔ وہ خارجی ہیئت کیا ہے؟ کہانی کی ابتدا اور انتہا؟ اگر بات اتنی ہی ہوتی تو بہت سے مضمون بھی افسانے ہوتے؟ لیکن افسانہ مضمون سے مختلف ہے۔ مضمون میں منطقی استدلال سے کام لیا جاتا ہے، جذباتی ارتقا کی جگہ فکری ارتقا ہوتا ہے۔ ترغیبی ہتھیار انشا پرداز بھی اختیار کرتا ہے لیکن اس کا افسوں مختلف ہے، وہ منطق اور علم کی کرامات دکھاتا ہے۔ کچھ انشا پرداز ایسے بھی ہیں جو شاعرانہ اظہار خیال سے جذباتی ترغیب کا بھی سہارا لیتے ہیں۔ لیکن اگر دیانتداری کو رہبر بنایا جائے تو یہ ماننا پڑے گا کہ یہ بددیانتی ہے چونکہ مضمون کا کام وقتی طور پر متاثر کرنا نہیں ہے۔ اس لئے پرجوش مضمون ایک قسم کی خطابت ہے جس کا تعلق تقریر اور شاعری سے ہے۔ مضمون وہی مضمون ہے جس کی عمارت کی تمام اینٹیں خرد اور معلومات سے تیار کی گئی ہیں اور جس کے گارے مٹی میں صرف منطق کا ہاتھ ہو۔ پھر بھی یہ چیزیں کسی مضمون کو اچھا نہیں بنا سکتی ہیں۔ تاوقتیکہ اچھا لکھنے والا صاحب اسلوب نہ ہو اور اس میں زبان کی اتنی قدرت نہ ہو کہ وہ اپنے خیالات کو وضاحتی تصویروں میں ڈھال سکے۔ دراصل یہ کام فنکار کا ہے اس لئے اچھا مضمون نگار وہ نہیں ہو سکتا جو فنکار نہ ہو۔ پھر بھی آپ مضمون کو افسانے سے پہچان لیتے ہیں۔ خواہ آپ میں جاننے کا یہ سلیقہ ہو یا نہ ہو کہ آیا مضمون نگار نے جذبات سے کھیلنے کی کوشش کی ہے یا واقعی اپنے ذہن کو دوسرے کے ذہن سے ٹکرایا ہے ان الفاظ کے علاوہ اگر آپ مضمون کی تعریف کرنا چاہیں تو صرف اتنا ہی کہہ سکتے ہیں کہ مضمون کا ایک بنیادی خیال ہوتا ہے۔ جس کی وضاحت اور تشکیل میں دوسرے بہت سے خیالات کی مدد لی جاتی ہے اور جب اس خیال کی تشکیل ہو جاتی ہے تو وہ مضمون ختم ہو جاتا ہے۔ برے مضمون کی پہچان صرف بے ڈھنگا طرز تحریر ہی نہیں ہے۔ بے ربط منطق، پر تضاد بیانات، منطقی تسلسل کی کمی، مرکزی خیال سے ہٹ کر دوسرے

خیالوں کو اہمیت دینا یہ تمام چیزیں ایک مضمون کو نا قابل قبول اور نہ پڑھے جانے کے لائق بنا دیتی ہیں، حالانکہ مضمون سب سے زیادہ آزاد صنعت ہے، آپ ایٹم پر مضمون لکھ سکتے ہیں۔ نظریۂ اضافیت کو سمجھا سکتے ہیں، شعر و شاعری سے بحث کر سکتے ہیں اور صفحات کے اسٹیج پر کھڑے ہو کر تقریر بھی کر سکتے ہیں۔ اگر ہم اچھے بُرے مضمون کو پہچان سکتے ہیں۔ تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم کہانی کو پہچان نہ سکیں۔

پہلا بیان۔

کہانی کسی مرکزی خیال کی ترجمان نہیں ہوا کرتی ہے بلکہ مرکزی موضوع (THEME) کے ارتقا کا نام ہے۔ اس بیان کے ماتحت کہانی کے لئے کسی بنے بنائے ہوئے پلاٹ کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ خیال بالکل صحیح معلوم ہوتا ہے کیونکہ پہلے سے مرتب کئے ہوئے پلاٹ میں ایک مصنوعیت پائی جاتی ہے۔ موضوع کا منطقی ارتقا اپنا پلاٹ خود بنا لیا کرتا ہے لیکن یہ ماننا پڑے گا کہ ذہنی تخلیق کے موقع پر کہانی کے آدھے تہائی حصے کا پلاٹ ضرور متعین ہو جاتا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ کاغذ پر آنے کے بعد اس پلاٹ کی ہیئت بدل جائے۔ اس سلسلے میں چند اور باتیں قابل غور ہیں۔ کہانی میں زندگی کا ایک ٹکڑا پیش کیا جاتا ہے اور زندگی کبھی بھی مرتب نہیں ہوتی ہے اور نہ اس کا اختتام ہمیشہ ڈرامائی انداز ہی میں ہوا کرتا ہے پھر کہانی کے اختتام پر کسی ڈرامائی کیفیت کو تلاش کرنے کے کیا معنی ہیں۔ اگر یہ ڈرامائی کیفیت خارجی ہے تو یقیناً یہ ایک عیب ہے لیکن اگر داخلی ہے تو اس سے کہانی کا لطف دوبالا ہو جاتا ہے۔ کیونکہ ادب بالعموم زندگی کی دو متضاد طاقتوں کو پیش کرتا ہے۔ یا پھر بہت سے متضاد عناصر میں کسی ایک عنصر یا جذبے کی سمت تلاش کرتا ہے متضاد عناصر کے ٹکراؤ سے زندگی کا احساس تیز ہو جاتا ہے۔ یہ ٹکراؤ خواہ آخر میں ہو یا کسی اور جگہ کہانی کو ڈرامے سے قریب لاتی ہے لیکن اس چیز کو کہانی کی بنیادی خشت نہیں بتائی جا سکتی ہے کیونکہ کہانیاں ہلکے ہلکے تاثرات کے ذخیرے سے بھی تخلیق کی جاتی ہیں اور بعض اوقات یہ تاثرات ایک ہی سمت کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

دوسرا بیان

کہانی کے لئے کسی کردار نگاری کی ضرورت نہیں ہے۔

اس بیان میں بھی حقیقت ہے کہ کہانی صرف فن کار کے ذاتی مشاہدے سے بھی بن سکتی ہے۔ وہ صرف کسی واقعے کی تصویر کھینچ سکتا ہے، یا کسی ہنگامے یا ہجوم کی غیر شخصی داستان بھی بیان کر سکتا ہے۔ مثال کے طور پر کرشن چندر کی "پشاور ایکسپریس" کو لیجئے۔ یہاں ریل گاڑی ہی سب کچھ بیان کرتی ہے۔ جس کے بیان میں کوئی خاص آدمی اور کوئی شخصیت نہیں ابھرتی ہے۔ صرف بربریت کا مظاہرہ جس کے پیچھے طنزیہ انداز میں فن کار کا داخلی ردعمل موجود ہے۔ آپ اسے کہانی ماننے پر مجبور ہیں لیکن اس قسم کی کہانیوں کی مثال ہماری بحث کے لئے مفید نہ ہوگی۔ اس موضوع پر بحث کرنے کے لئے کہانی کی مختلف قسموں کو پیش نظر رکھنا ہوگا۔ کچھ کہانیاں کسی واقعے سے متعلق لکھی جاتی ہیں چنانچہ ان کہانیوں میں کردار کی اہمیت بالکل ضمنی ہوتی ہے۔ کچھ کہانیوں میں صرف کردار نگاری ہوتی ہے لیکن ایسے موقع پر بھی کیریکٹر کے کسی ایک پہلو کو نمایاں کیا جاتا ہے۔ کیونکہ پورا کیریکٹر ایک کہانی کے کینوس پر نہیں آ سکتا ہے۔ پرانی کہانیاں اپنے اس موضوع کو کچھ اس طرح نباہتی ہیں۔ "عمر نیکی کی طرف کیوں کر مائل ہوا، زید اپنے کیفر کردار کو کیوں کر پہنچا" نئی کہانیاں اسی موضوع کو دوسری طرح نباہتی ہیں، وہ برے کردار میں خوبیوں کے لئے ڈھونڈھتی ہیں، برے کردار کے سماجی اسباب کو پیش کرتی ہیں۔ منٹو اور بیدی اسی ذیل میں آتے ہیں، عصمت نفسیاتی الجھنوں پر مبنی اسباب کو پیش کرتی ہیں۔ لیکن کرشن کے یہاں کردار کی اہمیت بالکل ضمنی رہتی ہے۔ کرشن کچھ اس طرح سوچتا ہے۔ شخصیت کی تکمیل مادی آسائش اور محبت کی گوناگوں کیفیات ہی کے بعد ممکن ہے۔ ایک وہ شخص جس نے نہ تو پیٹ بھر کر کھانا کھایا ہے اور نہ دل کھول کر محبت کی ہے اس کے کردار ہی کیا، کرشن اس طرح سے شخصیت کی تکمیل پر زور دیتا ہے۔ وہ موجودہ شخصیتوں سے کم بحث کرتا ہے بلکہ ان کے تخلیقی امکانات، اور شخصیت کی بھرپور تکمیل کا ایک خواب پیش کرتا ہے۔ وہ کالو بھنگی پر کہانی نہیں لکھ پاتا ہے کیونکہ کالو بھنگی نے نہ تو عشق ہی کیا ہے اور نہ پیٹ بھر کر کھانا کھایا ہے۔ یہ کرشن چندر کا بالکل اچھوتا انداز ہے جہاں وہ پرانی حقیقت نگاری سے اپنے کو الگ کر لیتا ہے۔ کرشن کو اپنے کردار کی منفرد خصوصیات نہیں ستاتی ہیں وہ اپنے کردار کے ان احساسات اور تخیلات کو پیش کرنے لگتا ہے۔ جو اظہار کی برکت سے محروم رہے ہیں کرشن اس شعری وجدان کو اچھی طرح نباہ لیتا ہے کیونکہ اس کے ..... اسلوب میں شعریت اور گداز ہے لیکن کہیں کہیں بد اخلاف کا موقع بھی دیتا ہے۔ "پھول سرخ ہیں" اس کہانی کو لیجئے۔ اندھے

کو پھول سے اتنی محبت ہو جاتی ہے کہ اس کا ڈانڈا شاعری سے جا ملتا ہے۔ پڑھنے والا پوچھ سکتا ہے کہ کیا ایسا ہو بھی سکتا ہے؟ شاعر جواب دے سکتا ہے لیکن افسانہ نگار کے لئے ذرا دقت پیدا ہو جاتی ہے۔ پھر یہ کہ کردار کے سماجی اور سیاسی شعور کی مصوری میں اس کا خیال رکھنا بہت ضروری ہے کہ ہم اس کی ذہنی سطح سے اوپر پرواز نہ کریں۔ ذہنی سطح پر رہ کر بھی ہم اپنی تاویلِ حقیقت پیش کر سکتے ہیں۔

تیسرا بیان

کہانی کے لئے کچھ بھی ضروری نہیں ہے یہ صرف ایک لاشعوری تصویر ہے جو غیر منطقی ہے، اس کے چوکھٹوں کا درست ہونا بھی ضروری نہیں ہے۔ اس دعوے کو اس بیان سے تقویت مل سکتی ہے کہ کردار، پلاٹ اور اسی قسم کی تمام چیزیں صرف موضوع کے ارتقا پر تصفیہ لیتی ہیں اس لئے ان کی حیثیت ضمنی ہے۔ لیکن چند چیزیں لاشعوری رو کے پیش کرتے ہیں کہ اُڑ سے آتی ہیں۔ ہر ادیب اپنے ہی لاشعوری رو کی نقل کرتا ہے وہ تخلیق بھی کرتا ہے تو اپنے ہی تخیل سے کام لیتا ہے ایسی کہانیوں میں مقصد کا ابھرنا بہت ضروری ہے۔ کیونکہ بے ترتیبی میں بھی ایک مقصد پنہاں ہوتا ہے لاشعوری رو کے لکھنے والے یہ بتاتے ہیں کہ لاشعور کی دنیا ایک پُراسرار بستی ہے جس کا نہ کوئی کنارا ہے اور نہ ساحل۔ یہ انتشار محض ہے اور جب انتشار کو ایک خارجی جسم دے دیا جاتا ہے تو وہ حیرت میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ انتشار کو قائم رکھنے کی اس سے بڑی اور کیا کوشش ہو سکتی ہے۔ صنعت ہی کو شاعری سمجھا جاتا تھا اُن مثنویوں کو بھی شاعری کا کارنامہ سمجھنے لگے۔ اس میں شبہ نہیں کہ ان مثنویوں میں شاعری کا کارنامہ موجود ہے لیکن بلاغت کے وہی مواقع بتائے جاتے ہیں جہاں قصّے کے مختلف پہلوؤں کو فطری انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ نہ صرف کلام کو موزوں کرنے کی صلاحیت ان قصوں کی خوبی کی حامل ہے بلکہ مطالعۂ نفسیات اس سے زیادہ اہم ہے اور یہ مطالعۂ نفس قصے والی مثنویوں میں سب سے زیادہ اہم ہے۔ میر کی مثنوی کے مقابلے میں میر حسن کی مثنوی کیوں اچھی ہے، اس کا جواب ہی مطالعہ نفس اور فطری انداز ہے۔ میر حسن نے واقعات اور نفسیات کی خارجیت پر زور دیا ہے۔ شہزادی اور کنیز کے کرداروں کو منفرد حیثیت سے پیش کیا ہے۔ میر نے اپنی داخلیت کو مثنویوں میں اس قدر اہم کر کے پیش کیا ہے کہ وہ قصّے کی خارجیت کو دھندلا دیتی ہے۔ کوئی بھی ڈرامہ، کوئی بھی ناول یا کہانی اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتی ہے جب تک کہ مصنف نے خود کو شعوری طور پر قصے سے الگ نہ کر لیا ہو۔ وہ کردار اور موضوع کی تخلیق ہی اس لئے کرتا ہے کہ اپنا مخصوص نقطۂ نظر اور اپنی مخصوص تاویلِ حقیقت کو دوسروں کے سامنے پیش کرے پھر اسے جا دبیجا کرداروں کے درمیان مداخلت کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ جب ایک شاعر کسی قصے کی تخلیق کرتا ہے تو اس کی پہلی توجہ موضوع کے ارتقا پر رہتی ہے اس نے قصے کو منظوم عبارت میں کیوں پیش کیا؟ اس کا جواب یہ نہیں ہے کہ وہ شاعری کرنا چاہتا ہے بلکہ یہ کہ وہ اپنے اندر اتنی صلاحیت محسوس کرتا ہے کہ نظم میں نثر کا مزا پیدا کر دے یا پھر وہ منظوم حیثیت سے پیش کرنے کو اپنے لئے زیادہ آسان سمجھتا ہے۔ کوئی منظوم ڈرامہ کوئی بھی منظوم قصہ، اسٹیج اور اسی قسم کی دوسری تخلیقی کوششیں صرف موضوع ہی کے مقتضیات پر جانچی جا سکتی ہیں۔ فصاحتِ بیان اور زبان تو بعد میں دیکھی جائے گی۔ اگر اس تخلیق میں دو چار ٹکڑے شاعری کے اچھے ہیں اور شاعر موضوع کو نہیں نباہ سکا ہے تو ہم اس کی پوری کوشش کو ناکامیاب سمجھیں گے۔ بہ مجبوریاں چنانچہ یہ انتشار ہیئت میں بھی قائم رہتا ہے۔ میں ایسی کہانیوں کو کہانی نہیں مانتا ہوں تاوقتیکہ انتشار میں کوئی (PATERN) نہ دکھایا جائے۔ اس کی کوئی مخصوص سمت نہ دریافت کی جائے۔ اور اگر (PATERN) اور سمت پیدا کیا جا سکتا ہے تو یہ ماننا پڑے گا کہ یہ ایک شعوری کوشش ہے۔ جس میں صرف تاویلِ حقیقت کی کوشش کی جاتی ہے اور جب یہ شعوری کوشش ٹھہری تو پھر کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ ہم ان کہانیوں میں کہانی پن کیوں نہ دریافت کریں کیونکہ ہر شعوری کوشش کا ایک منضبط ڈھانچہ بھی ہوتا ہے۔ اگر انتشار کو حقیقت سمجھ کر اس کی نقل اتارنے کی کوشش کی جاتی ہے تو پھر تو حقیقت بھی معرضِ بحث میں آ جاتی ہے۔ یہ انتشار کس کا ہے۔ مصنف کا یا کسی خاص طبقہ کا اگر صرف مصنف کا ہے تو وہ اپنے انتشار سے دوسروں کو کیوں متاثر کرنا چاہتا ہے۔ یہاں یہ چیز بھی نہ بھولنا چاہئے کہ وہ صرف اپنے انتشار کی تصویر ہی نہیں کھینچ رہا ہے۔ بلکہ وہ اپنے اس طرحِ نظر سے متاثر بھی کرنا چاہتا ہے جو اس انتشار کی تخلیق میں حصہ لے رہا ہے۔ ایسے ادیب موضوع اور فن دونوں ہی کو بگاڑنے کی کوشش کرتے ہیں۔

آخری بیان

کہانی کی ایک خارجی ہیئت ہے جس کے بغیر کوئی بھی کہانی کہانی نہیں کہی جا سکتی۔

یہ خارجی ہیئت کہانی کا (MEDIVM) نہیں ہے کیوں کہ کہانی نثر میں بھی لکھی جا سکتی ہے اور نظم میں بھی۔ شکسپیر کے بہت سے ڈرامے منظوم ہیں پھر بھی ہم انہیں ڈرامہ ہی کہتے ہیں۔ اردو اور فارسی کی بہت سی مثنویاں، داستان یا قصّے کے ضمن میں آتی ہیں .... اور یہی بات ان قصوں اور کہانیوں کے لئے صحیح ہے جنھیں نثر میں پیش کیا گیا ہے۔ پہلے موضوع کو جانچئے کہ آیا کہانی لکھنے والے نے اپنے موضوع کے ارتقا میں تمام جزئیات سے کام لیا ہے کہ نہیں۔ وہ اپنی شخصیت کو کردار کے پیچھے رکھتا ہے کہ نہیں، واقعات کے بیان کرنے میں خارجیت کو قائم رکھتا ہے کہ نہیں؟ اگر وہ اس کو پورا کر چکا ہے تو پھر انداز بیان کو جانچئے۔

آج کل بہت سی ایسی کہانیاں لکھی جا رہی ہیں جہاں کہانی کی خارجی ہیئت انداز بیان کی رنگینی میں کھو جاتی ہے آپ کبھی نثر کی تعریف کرتے ہیں تو کبھی شاعری کی۔ لیکن اس سے زیادہ اہم اس کہانی کا موضوع ہے جو صحیح معنوں میں فن کار کی تخلیق ہے۔ اگر ہم نے فن کی اس (OJECTIVITY) پر زور نہ دیا تو پھر ہر مبہم یا رنگین چیز بیک وقت افسانہ، مضمون، ڈرامہ نثر، منظوم اور منظوم نثر سب کچھ ہو جائے گی۔ اگر ہم لکھو کھا انسانوں سے ملنے کے بعد ہر ایک شخص کو ایک مخصوص شخصیت کا نام دے سکتے ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ ادب کی مختلف صنفوں کو ہم ان کی مخصوص خصوصیتوں کی بنا پر نہ پرکھ سکیں۔

ملک راج آنند کا زیر طبع ناول

دو پتّی اور ایک کلی

یہ ڈاکٹر ملک راج آنند کا وہ مشہور ناول ہے جو دنیا کی کئی زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ چھ سات برس تک انگلستان میں اس کی اشاعت ممنوع قرار دی گئی تھی جس کی وجہ یہ تھی کہ آسام کے چائے کے کھیتوں کے انگریز حاکموں نے انگلستان کی نام نہاد جمہوری حکومت پر اس لئے دباؤ ڈالا تھا کہ "کالے لوگوں" پر ان سفید چمڑی والوں کے مظالم کی ان گنت داستانیں مہذب دنیا کے کانوں تک نہ پہنچ سکیں۔ اور ان کے شراب میں ڈوبے ہوئے قہقہوں اور ان کے پُر ہوس شیطنت آمیز افعال اور ان کے چمڑے کے ہنٹروں کے قرّاٹے چائے کے کھیتوں میں کام کرنے والی مزدور دوشیزاؤں کی چیخ میں دب کر رہ جائے

اس ناول کو **وشوامتر عادل** نے اردو کا جامہ پہنایا ہے

بلراج کومل

قنوطی شاعر

سسکتی شب کی گھنی سیاہی میں کون آنسو بہا رہا ہے ؟
یہ کس کی دھڑکن ہے جس میں ارمان ہولے ہولے بلک رہے ہیں ؟
یہ گیت کیسا ہے جس میں آنسو ہیں، سرد آہیں ہیں ۔ موت کی سی فسردگی ہے ؟
یہ کیا ہوا ہے کہ اس کی پلکیں زمیں پہ ذرّوں کو گن رہی ہیں ؟
ہوائیں شاخوں میں سرسراتی ہیں دور تک تیرگی ہے تارے بجھے ہوئے ہیں
فضا کے سینے میں کیسی سی کھٹک رہی ہے ۔
سسک سسک کر پکارتی ہے :
میں اک اشارہ ہوں اپنے خالق کی زندگی کی سیاہیوں کا
میں آج تک ایک مُردہ دل کے لبوں پہ نوحہ کناں رہی ہوں
ہوائیں اک دوسری سے باہم یہ پوچھتی ہیں !
یہ کون ہے جو ...... ؟ ...... یہ کون ہے جو ...... ؟؟

کبھی وہ لمحے تھے جب یہ انسان
چلا تھا راہِ حیات پر مسکراتا، ہنستا سجیلے گیتوں کے پھول لے کر
اور اپنی پلکوں پہ آرزوؤں کے تارے تھامے یہ سوچتا تھا
گگن سے اُترے گی وہ پری جو حسین آنکھوں سے جگمگا دے گی اس کی ہستی
اسے مسرّت کی مسکراتی حسین کلیوں کے ہار پہنائے گی محبت کے گیت گا کر
جوان امنگوں کو گدگدا دے گی مسکرا کر

مگر وہ ہنسنا بکھر چکا ہے
کہ جیسے غم کی سیاہیوں نے جمیل تارے نگل لئے ہیں
اور اب یہ مغموم، نیم مردہ سلگتا انسان تڑپ رہا ہے
حیات کی سب سیاہیوں کو سمیٹ کر اپنے گھر کو تاریکیوں کا مسکن بنا رہا ہے

کوئی اسے کاش یہ بتا دے
کہ زندگی کی بپھرتی موجوں میں ننھے منّے کروڑوں تنکے بھٹک رہے ہیں۔
کروڑوں تنکے حسین سینوں کا خون پیتے ہیں، اپنی آہوں کے گیت سنتے ہیں، زندگانی گزارتے ہیں
کروڑوں تنکے زمیں کے سینے پہ بار بن کر تڑپ رہے ہیں
کوئی اسے کاش یہ بتا دے
دیا جلالو، غموں کے مسکن کو پھونک ڈالو،
اٹھاؤ پلکیں کہ زندگی میں تجلّیاں بھی ہیں، روشنی بھی ہے نکہتیں بھی،
افق کے ماتھے پہ جھلملاتی ہوئی شعاعیں بھی ناچتی ہیں

مگر وہ جھلا کے ہر گھڑی یہ پکارتا ہے،
مجھے نہ چھیڑو، مجھے نہ چھیڑو،
تمہیں مبارک ہوں زندگی کی مسرّتیں، مسکراہٹیں اور چاند تارے
میں اپنی امید کا دیا تک بجھا چکا ہوں
اور اب تو شاید میں زندگی کا دیا بھی اک دن بجھا کے رکھ دوں !!

ماہنامہ ایشیا فروری ۱۹۴۹ء

فلم لائن اور منشی پریم چند

(منشی پریم چند کے خطوط ہندی کے مشہور ناول نگار جنیندر کمار کے نام)

پیارے جنیندر!

تمہارا خط مین انتظار کی حالت میں ملا۔ تم سے صلاح کرنے کی ضرورت آپڑی ہے…… ……ابھی نہ بتاؤں گا۔ جب آؤگے تب ہی اس کے متعلق باتیں ہوں گی…… …… مگر تمہیں کیوں suspence کی حالت میں رکھوں؟

بمبئی کی ایک فلم کمپنی مجھے بلا رہی ہے۔ تنخواہ کی بات نہیں کنٹریکٹ (contract) کی بات ہے۔ ۸ ہزار روپیہ سال۔ میں اس اوستھا (حالت) کو پہنچ گیا ہوں جب میرے لئے اس کے سوائے کوئی چارہ نہیں رہ گیا ہے کہ یا تو وہاں چلا جاؤں یا اپنے ناول کو بازار میں بیچوں۔ میں اس معاملے میں تمہاری رائے ضروری سمجھتا ہوں۔ کمپنی والے حاضری کی کوئی قید نہیں رکھتے۔ میں جو چاہوں لکھوں جہاں چاہے لکھوں، ان کے لئے چار پانچ سو سینیوریو تیار کردوں۔ میں سوچتا ہوں کہ ایک سال کے لئے چلا جاؤں۔ وہاں سال بھر رہنے کے بعد کچھ ایسا کنٹریکٹ کرلوں گا کہ میں یہیں بیٹھے بیٹھے تین چار کہانیاں لکھ دیا کروں اور چار پانچ ہزار روپیہ مل جایا کریں۔ اس سے جاگرن اور ہنس دونوں مزے میں چلیں گے اور مہیندن کا سنگٹ کٹ جائے گا پھر ہماری دونوں کی چیزیں دھڑلے سے نکلیں گی۔ لیکن تم یہاں آجاؤگے تب کوئی رائے ہوگی۔ ابھی تو من دوڑا رہا ہوں…… !

اس کے کچھ دن بعد ایک دوسرے خط میں پریم چند جی نے جنیندر کمار کو لکھا:-

بھلے آدمی مکان چھوڑا تھا تو ڈاکیے سے اتنا تو کہہ دیا ہوتا کہ میری چٹھیاں فلاں پتہ پر بھیج دینا۔ بس بوریہ بکیا سنبھالا اور چل کھڑے ہوئے۔ میں نے تمہارے جواب میں ایک بڑا سا (DETAILED) مفصل خط لکھا تھا وہ شاید مردہ چٹھیوں کے دفتر میں پڑا ہوگا۔ (میں نے شاید تمہیں لکھا ہے کہ) مجھے بمبئی کی کمپنی بلا رہی ہے۔ کیا صلاح ہے؟ مجھے تو کوئی ہرج نہیں معلوم ہوتا اگر ویتن (تنخواہ) ۸۰۰۰ سالانہ ملے سال دو سال کرکے چلا آؤں گا مگر ابھی میں نے جواب نہیں دیا ہے۔ ان کے دو تار آچکے ہیں۔ پرساد جی[1] کی صلاح ہے "آپ بمبئی نہ جائیں" تمہاری بھی اگر یہی رائے ہے تو میں نہ جاؤں گا۔ جوہری جی[2] کہتے ہیں "ضرور جائیے" اور طویل مفلسی بھی کہتی ہے کہ ضرور چلو۔ زندگی کا یہ بھی ایک تجربہ ہے

آخر وہ فلم لائن میں گئے ہیں، وہاں سے انھوں نے لکھا:-

میں جن ارادوں سے آیا تھا اُن میں سے ایک بھی پورا ہوتا نظر نہیں آتا۔ یہ پروڈیوسر جس ڈھنگ کی کہانیاں بناتے آئے ہیں اُس راہ سے جَو بھر نہیں ہٹ سکتے ابتذال کو یہ تفریحی قدروں سے تعبیر کرتے ہیں۔ سنسنی ہی میں ان کا وشواس ہے راجہ رانی ان کی منتریوں کی سازش، نقلی لڑائی، بوسہ بازی، یہی ان کے خاص ڈھنگ ہیں۔ میں نے سماجک کہانیاں لکھیں جنھیں تعلیم یافتہ سماج بھی دیکھنا چاہے لیکن ان کو فلماتے ان لوگوں کو شبہ ہوتا ہے کہ چلے یا نہ چلے۔ یہ سال تو پورا کرنا ہے ہی یہی قرض دار ہو گیا تھا، قرض پٹا دوں گا۔ مگر اور کوئی فائدہ نہیں۔ گئودان ناول کے آخری صفحے باقی ہیں۔ ادھر من ہی نہیں جاتا (جی چاہتا ہے) یہاں سے چھٹی پاکر اپنے پرانے اڈے پر جا بیٹھوں۔ وہاں دھن نہیں مگر سکون ضرور ہے۔ یہاں

[1] جے شنکر پرشاد۔ ہندی کے مشہور شاعر [2] ہندی کے مشہور مصنف

ماہنامہ ایشیا فروری ۱۹۴۹ء

توجیاہی پڑتا ہے۔ زندگی برباد کررہا ہوں۔

ان کا ایک فلم نکلا تھا "مزدور" اس کا ذکر کرتے ہوئے ایک خط میں لکھا:۔

مزدور تمھیں پسند نہ آیا۔ یہ میں جانتا تھا۔ میں اسے اپنا کہہ سکتا ہوں۔ نہیں بھی کہہ سکتا۔ اس کے بعد ہی ایک رومانس جارہا ہے وہ بھی میرا نہیں ہے۔ میں اس میں بہت تھوڑا سا ہوں۔ مزدور میں بھی میں اتنا ذرا سا آیا ہوں کہ نہیں کے برابر۔ فلم میں ڈائرکٹر سب کچھ ہے۔ ٹیکنیک فلم کا بادشاہ ہی کیوں نہ ہو۔ یہاں ڈائرکٹر کی عملداری ہے اور اس کے راج میں اس کی حکومت نہیں چل سکتی حکومت مانے تبھی وہ رہ سکتا ہے وہ ٹیکنیک یہ کہنے کی جرأت نہیں رکھتا کہ "میں عوام کے رجحان کو جانتا ہوں۔ آپ نہیں جانتے" اس کے خلاف ڈائرکٹرز زور دے کر ٹیکنیک سے کہتا ہے میں جانتا ہوں۔

جنتا کیا چاہتی ہے۔ اور ہم یہاں جنتا کی اصلاح کرنے نہیں آئے ہیں ہم نے کاروبار کھولا ہے۔ دھن کمانا ہماری غرض ہے۔ جو کچھ جنتا مانگے گی وہ ہم دیں گے اس کا جواب یہی ہے۔ اچھا صاحب ہمارا سلام لیجئے۔ ہم گھر جاتے ہیں۔

وہی میں کررہا ہوں۔ مئی کے آخر میں کاشی میں بندہ نادل لکھ رہا ہوگا اور مجھ میں کچھ نئی کلا سیکھنے کی بھی صفت ہے۔ فلم میں میرے من کو سکون نہیں ملا۔ سکون ڈائرکٹروں کو بھی نہیں ملتا۔ لیکن وہ اور کچھ نہیں کرسکتے۔ جھک مار کر پڑے ہوئے ہیں میں اور کچھ کرسکتا ہوں چاہے وہ بیگار ہی کیوں نہ ہو اس لئے چلا آرہا ہوں۔ میں جو پلاٹ سوچتا ہوں اس میں آدرش واد (آئیڈل ازم تصور پسندی) گھس آتا ہے اور کہا جاتا ہے اس میں تفریحی صفت نہیں ہوتی۔ میں تسلیم کرتا ہوں۔ مجھے آدمی بھی ایسے ملے ہیں جو نہ ہندی جانیں نہ اردو۔ انگریزی میں ترجمہ کرکے انھیں کہانی کا خلاصہ سمجھانا پڑتا ہے اور کام کچھ نہیں بنتا۔ میرے لئے اپنی وہی پرانی لائن مزے کی ہے۔ جو چاہا لکھا۔

میرا جیون یہاں بھی ویسا ہی ہے جیسا کاشی میں تھا۔ کسی سے دوستی نہ کسی سے ملاقات۔ ملا کی دوڑ مسجد تک۔ اسٹیڈیو گئے گھر آئے ہندی کے دو چار پریمی کبھی کبھی آجاتے ہیں۔ بس۔ آخر میں فلمی دنیا کو استعفیٰ دے کر پریم چند جی کو لوٹ آنا پڑا اور اس کے بعد کچھ زیادہ دن وہ اس دنیا میں نہیں رہے۔

(ہنس سے ماخوذ)

جستِ غبار

باقر رضوی

نوعِ انساں کو تباہی سے بچا سکتے ہیں — ہم زمانے کو رہِ راست پہ لا سکتے ہیں

رہِ ہستی میں جو بے فیض ہیں مانندِ غبار — ابرِ رحمت کی طرح چرخ پہ چھا سکتے ہیں

گلشنِ دہر میں ہیں رنگِ پریدہ لیکن — رُخِ کونین پہ سونا سا چڑھا سکتے ہیں

دور کرنے کے لئے پست و بلندِ ہستی — ہم تہِ تیغ و سرِ دار بھی جا سکتے ہیں

آج جو مصلحتاً منہ کو سیئے بیٹھے ہیں — کل وہ آفاق میں اک دھوم مچا سکتے ہیں

جن کی نظروں میں ہے مستقبلِ روشن کا سرور — نقدِ جاں تک وہ مسرت سے لُٹا سکتے ہیں

بغض و نفرت سے یہ دنیا ہے جہنم بکنار — مہر و اُلفت اسے فردوس بنا سکتے ہیں

وشوامتر عادل

پوسٹ ماسٹر

الیگزینڈر پشکن (۱۷۹۹ء سے ۱۸۳۳ء تک)

روسی افسانہ نگاری کے ارتقائی دور میں پشکن کا نام ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ پشکن بنیادی طور پر ایک شاعر تھا اور اس کا شمار یورپ کے ممتاز ترین شعراء میں ہوتا ہے۔ لیکن وہ ڈرامہ نویسی اور افسانہ نگاری میں بھی کسی سے کم نہ تھا۔ سب سے پہلے پشکن نے اپنے ملک کی افسانہ نگاری میں ایک قسم کی پاکیزہ سادگی رائج کی جو بعد میں روسی حقیقت نگاری کی بنیاد بنی، وہ اپنے افسانوں میں "عام آدمی" سے بڑے پیار اور ہمدردی کے ساتھ پیش آیا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ پشکن انقلابی تھا لیکن وہ پہلا روسی افسانہ نگار تھا جس نے افسانہ نگاری میں نظریاتی عنصر کا ساتھ دیا۔ اور اس لحاظ سے وہ یقیناً ترقی پسند تھا۔ پشکن کے یہاں یہ نظریاتی عنصر دھندلا سا ہے جو رومانیت کے خوبصورت شفاف لباس میں جھلکتا ہے اور پڑھنے والوں کے دل میں "عام آدمی" کے لئے ہمدردی ضرور پیدا کر دیتا ہے۔

"پوسٹ ماسٹر" پشکن کا ایک بڑا مشہور افسانہ ہے۔ اس افسانے میں ایک بگڑی ہوئی لڑکی کو دکھایا گیا ہے جو اپنے عیش و عشرت کی خاطر اپنے عاشق کے ساتھ بھاگ جاتی ہے اسے کچھ پروا نہیں کہ اس کے اس فعل سے اس کے بوڑھے پیارے باپ ـــ ایک عام آدمی ـــ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے ہیں۔

عادل

پشکن کی اس کہانی سے روسی کہانیوں کے ترجمہ کا ایک سلسلہ شروع کیا جاتا ہے جو ترگنیف، ٹالسٹائی، داستوفسکی، گارشن، چیخوف اور گورکی کی کہانیوں پر ختم ہوگا۔ پشکن کے علاوہ روسی افسانہ نگاروں کی کہانیوں کا ترجمہ بھی وشوامتر عادل ہی نے کیا ہے! جہاں تک ترجمہ کی خوبصورتی اور دلکشی کا تعلق ہے۔ روسی سے انگریزی اور انگریزی سے اردو کے قالب میں آتے آتے کہانی کی حقیقی دلکشی میں قدرتی طور پر کمی آجانی چاہئے لیکن اس مجبوری کے باوجود عادل نے ان کہانیوں کی روح کو بچانے کی کوشش میں کامیابی حاصل کی ہے۔ اردو ادب کے تخلیقی جذبہ کو صحت و استحکام کے سانچے میں ڈھالنے کے لئے یہ نہایت ضروری ہے کہ ہم دوسری زبانوں کے ادب خاص کر روسی ادب کو زیادہ سے زیادہ اردو زبان میں منتقل کریں تاکہ ہمارے نو تخلیقی ادب میں صحت مند عناصر پیدا ہوسکیں۔

"ادارہ"

کون ہے بھلا جس نے ہماری ڈاک کی سڑکوں کے پوسٹ ماسٹروں کو کبھی نہ کوسا ہو، اور ان کے ساتھ تو تو میں میں نہ کی ہو؟ جس نے غصے کے یک لمحے میں وہ منحوس کتاب نہ مانگی ہو تاکہ اس کے ناواجب برتاؤ، گستاخی اور لاپروائی کی بابت اپنی بے اثر شکایات درج کرے؟ کون ہے جو انھیں نسلِ انسان کے اچھوت یا اتنا ذلیل نہ سمجھتا ہو۔ جتنے کہ آج کل کے مردہ حکومت کے منشی یا کم از کم جنگلات میورم کے لٹیرے؟ لیکن آؤ ذرا انصاف سے کام لیں۔ آؤ ذرا ہم خود ان کی جگہ لے کر دیکھیں شاید تب ہم ان کے بارے میں زیادہ احتیاط سے رائے قائم کرسکیں گے۔ پوسٹ ماسٹر کیا ہے؟ چودھویں درجے کے سرکاری ملازمین میں ایک شہید محض جسے صرف اس کا رتبہ مکوں سے بچائے رکھتا ہے۔ اور وہ بھی ہمیشہ نہیں، میں اپنے ناظرین سے خیر سے یہ پوچھتا ہوں کہ آخر اس "ڈکٹیٹر" کے جس نام سے کہ شہزادہ ویازیمسکی اسے زندہ دلی سے بلاتا ہے، فرائض کیا ہیں؟ کیا یہ فرائض کسی قیدخانہ میں سزائے قید کی ایک میعاد کے مترادف نہیں ہیں؟ نہ دن کو چین نہ رات کو۔ مسافر ایک تھکا دینے والے سفر کے دوران میں اپنی ساری جمع شدہ جھنجھلاہٹ اور کوفت کا نشانہ پوسٹ ماسٹر کو بنا دیتا ہے۔ کیا موسم ناقابل برداشت ہے۔ سڑکیں خوفناک ہیں۔ کوچوان گدھے کی مانند ڈھیٹ ہیں؟ ـــ ہر حرج کے لئے پوسٹ ماسٹر کو قصوروار ٹھہرایا جاتا ہے۔ جونہی سفر کرنے والا مسافر پوسٹ ماسٹر کی ننگی رہائش گاہ میں قدم رکھتا ہے وہ پوسٹ ماسٹر

کو اپنا دشمن سمجھنے لگتا ہے۔ اگر پوسٹ ماسٹر اپنے بن بلائے مہمان کو جلدی بھیجنے میں کامیاب ہو جائے تو وہ بڑا خوش قسمت ہے۔ لیکن اگر سوئے اتفاق سے گھوڑے نہ ہوں؟ — خانِ خدا! کیسی کیسی لعنتیں، کیسی کیسی دھمکیاں اس بیچارے پر برسائی جاتی ہیں۔! بارش اور کیچڑ میں آنے سے صحن میں بھاگ دوڑ کرنے پر مجبور کیا جاتا ہے۔ چیختے ہوئے طوفان اور کاٹتے ہوئے پالے میں وہ باہر ڈیوڑھی (ENTRANCE) میں چلا جاتا ہے۔ تاکہ ایک لمحہ کے لئے اپنے برہم مزاج ملاقاتی کی چیخ پکار اور گھس پٹھ سے بچ جائے۔ گاڑی میں بیٹھا ہوا ایک جرنیل آ پہنچا ہے۔ کانپتا ہوا پوسٹ ماسٹر گھوڑوں کی آخری دو جوڑیاں اس کے حوالے کر دیتا ہے۔ جن میں جوڑیاں بھی شامل ہیں جو سرکاری ہرکارے کے لئے مخصوص تھیں۔ جرنیل شکریہ کا ایک لفظ کہے بغیر گاڑی میں بیٹھ کر چل دیتا ہے۔ پانچ منٹ بعد ننھی ننھی گھنٹیوں کی جھنکار سنائی دیتی ہے اور ہرکارہ تازہ گھوڑوں کے لئے اپنا حکم نامہ میز پر پھینک دیتا ہے۔ ...... اگر ہم ان تمام باتوں پر غور کریں تو ہمارے دل غصّے سے نہیں بلکہ سچی ہمدردی سے بھر جائیں گے۔ چند ایک لفظ اور — میں نے بیس سال سے زائد عرصہ تک روس میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک سفر کیا ہے۔ میں قریب قریب سبھی ڈاک کی سڑکوں سے واقف ہوں۔ میں کوچوانوں کی کئی نسلوں سے اچھی طرح واقف ہوں۔ کوئی پوسٹ ماسٹر ایسا نہیں جنہیں میں پہچانتا نہیں۔ کوئی ایسا نہیں جس سے میرا واسطہ نہ پڑا ہو۔ مجھے امید ہے کہ میں عنقریب اپنے سفرناموں کے عجیب غریب مجموعے کو چھپوا دوں گا۔ اس وقت میں صرف یہی کہوں گا کہ مجموعی طور پر پوسٹ ماسٹر عوام کی نظروں میں اس قدر تلخ لہجے میں نہایت جھوٹے رنگوں میں پیش کئے گئے ہیں۔ یہ سرکاری ملازمین جن کی برائی کی جاتی ہے۔ عام طور پر صلح پسند لوگ ہیں۔ جو فطرتاً بامروت، ملنسار اور اپنی کارگزاریوں کا صلہ مانگنے میں معقول ہیں اور اپنے مفاد کی خاطر حد سے زیادہ لالچی ہیں۔ ان کی گفتگو سے، جنہیں سفر کرنے والے شرفا نظر انداز کرنے میں غلطی کرتے ہیں۔ بہت سی دلچسپ اور افادی باتیں معلوم ہو سکتی ہیں۔ جہاں تک میرا تعلق ہے۔ مجھے ماننا پڑتا ہے کہ جو کچھ یہ کہتے ہیں میں اسے سرکاری کام پر جانے والے چھٹے درجے کے سرکاری ملازم کی بکواس پر ترجیح دیتا ہوں۔

اس کا اندازہ تو آسانی سے ہو سکتا ہے کہ پوسٹ ماسٹروں کی معزز جماعت میں میرا شمار دوستوں میں ہوتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ان میں سے ایک کی یاد مجھے بڑی عزیز ہے۔ ایک دفعہ حالات نے ہم دونوں کو اکٹھا کر دیا۔ اور یہ اسی کی کہانی ہے۔ جو میں اپنے قابلِ الفت ناظرین کو اسی وقت سنانا چاہتا ہوں۔

"سنہ ۱۸۱۶ء" مئی کے مہینے میں مجھے —— کی حکومت کے دنوں میں ایک ڈاک کی سڑک پر سفر کرنے کا اتفاق ہوا۔ جو اب ناقابلِ سفر ہو چکی ہے۔ میرا رتبہ بہت چھوٹا تھا۔ میں ڈاک گاڑی سے سفر کر رہا تھا۔ اور دو گھوڑوں کا کرایہ ادا کر رہا تھا۔ اسی لئے پوسٹ ماسٹر میرے ساتھ تکلف سے پیش نہیں آتے تھے اور بسا اوقات جس چیز پر میں اپنا حق سمجھتا تھا وہ مجھے جھگڑا کرکے حاصل کرنا پڑتی تھی، جب کبھی پوسٹ ماسٹر میرے گھوڑوں کو کسی بلند مرتبہ شریف زادے کی گاڑی میں جوت دیتا تو میں نوجوان اور بدمزاج ہونے کی وجہ سے اس کی کمینگی اور دوں ہمتی پر غضب ناک ہو جاتا اسی طرح گورنر کے دستر خوان پر جب تیز فہم خدمت گزار مجھے نظر انداز کر دیتا تو اس کے رویے سے مانوس ہونے کے لئے بھی مجھے کافی دیر لگتی اب مجھے یہ بات زیادہ خطرات کے مطابق ہوتی ہوئی معلوم ہوتی ہے اور سچ تو یہ ہے کہ اگر مثال کے طور پر "رتبے کی قدر ہونی چاہئے" کے مروجہ قاعدے کی بجائے کوئی دوسرا قاعدہ مثلاً عقل کی قدر ہونی چاہیے رائج کر دیا جائے تو ہمارا کیا حشر ہو؟ کیسے کیسے جھگڑے آن کھڑے ہوں نوکروں کو کیسے معلوم ہو کہ پہلے کس کی خدمت کرنی چاہیئے؟ لیکن پہلے میں اپنی کہانی تو سنا لوں —

اس دن گرمی تھی۔ —— کی چوکی سے تین ورسٹ کے فاصلے پر بارش کی بوندیں پڑنے لگیں اور ایک منٹ بعد بارش کی بوچھار نے میری جلد تک بھگو دی۔ جب میں چوکی پر پہنچا تو میں نے پہلی احتیاط یہ کی کہ جلد از جلد اپنے کپڑے بدل لئے۔ اور دوسری یہ کہ چائے لانے کا حکم دیا۔ پوسٹ ماسٹر چلایا "دُونیا! سماوار اوپر رکھ دے اور کچھ کریم لے آ" یہ الفاظ سن کر ایک چودہ برس کی لڑکی اوٹ (PARTITION) کے پیچھے سے نمودار ہوئی اور بھاگ کر ڈیوڑھی میں داخل ہوئی۔ میں اس کے حسن کی تاب نہ لا سکا۔

"کیا یہ تمہاری بیٹی ہے؟" میں نے پوسٹ ماسٹر سے پوچھا۔

"میری ہی بیٹی ہے جناب"۔ اس نے پُر غرور سا انداز سے جواب دیا "اور کتنی چالاک لڑکی ہے یہ۔ کتنی تیز طرار چھوٹی سی چیز! ہو بہو اپنی غریب ماں جیسی" پھر وہ میرا پروانہ راہداری نقل کرنے بیٹھ گیا اور میں ان تصویروں کو غور سے دیکھنے لگا۔ جو اس کی حقیر لیکن بے داغ آرائش گاہ کی دیواروں کو آراستہ کر رہی تھیں۔ تصویریں ایک فضول خرچ بیٹے کی کہانی سنا رہی تھیں۔ پہلی تصویر میں ایک معزز بوڑھا آدمی، ایک شب خوابی کی ٹوپی اور ڈریسنگ گاؤن پہنے اپنے بے قرار

لخت جگر کو الوداع کہہ رہا تھا۔ جسے صرف یہی فکر تھی کہ جتنی جلدی ہو سکے۔ وہ اپنے باپ کی دعائیں اور اپنے پیسے کی تھیلی حاصل کرلے۔

دوسری تصویر شوخ رنگوں میں اس نوجوان آدمی کی بدچلن زندگی کی ترجمانی کر رہی تھی کہ وہ ایک میز کے پاس جھوٹے دوستوں اور بے شرم عورتوں سے گھرا ہوا بیٹھا ہے۔ اگلی تصویر اُس نوجوان کو جو اب تباہ ہو چکا تھا۔ ٹاٹ کے کپڑے اور سر پر ایک تکونی ٹوپی پہنے اور سوؤروں کو خوراک دیتے۔ اور اُن کی خوراک میں حصہ بٹاتے ہوئے دکھاتی تھی۔ اُس کے چہرے سے غم اور ندامت کا اظہار ہوتا ہے۔ آخری تصویر اس کے واپس گھر آنے کی نمائندگی کرتی تھی۔ بوڑھا آدمی پہلے کی طرح وہی ڈریسنگ گاؤن اور وہی شب خوابی کی ٹوپی پہنے ہوئے اُس سے ملنے کے لئے بھاگا چلا آ رہا ہے۔

فضول خرچ بیٹا گھٹنوں کے بل بیٹھا ہے۔ پس منظر میں باورچی ایک موٹا بچھڑا ذبح کر رہا ہے۔ ہر تصویر کے نیچے میں نے جرمن زبان میں اشعار پڑھے جو موضوع کے شایاں تھے۔ یہ سب کچھ آج بھی میرے ذہن میں اسی طرح باقی ہے جیسے کہ گل مہندی کے گملے اور رنگ برنگی جھالروں والا بستر اور دوسری چیزیں، جن سے میں اس وقت گھرا ہوا تھا۔ میں چشم تصور سے اب بھی اُس پوسٹ ماسٹر، اس پچاس برس سے اوپر، تازہ جلد والے اور طاقتور آدمی کو ایک لمبا سبز رنگ کا کوٹ پہنے ہوئے دیکھ سکتا ہوں۔ جس کے اوپر تین دھندلائے ہوئے فیتوں کے ساتھ تین تمغے ٹکے ہوئے تھے۔

میں نے ابھی اپنے پہلے کوچوان کا حساب چکایا ہی تھا کہ ڈونیا سماوار اٹھاتے ہوئے لوٹ آئی۔ وہ ننھی عشوہ گر مجھ پر دوسری بار ایک سرسری نظر ڈالتے ہی بھانپ گئی کہ اُس نے مجھ پر کیا اثر ڈالا ہے اُس نے اپنی بڑی بڑی نیلی آنکھیں جھکالیں۔ میں لڑکی سے باتیں کرنے لگا۔ اس کے جوابات جس میں کسی قسم کا حجاب نہیں تھا، ایک ایسی کمسن شخصیت کو بے نقاب کر رہے تھے۔ جسے زندگی کا تھوڑا سا تجربہ تھا۔ میں نے اُس کے باپ کو شراب کا ایک گلاس پیش کیا۔ ڈونیا کو میں نے چائے کا ایک پیالہ دیا۔ اور ہم تینوں تھوڑی ہی دیر میں اس طرح گپ شپ کرنے لگے۔ گویا ہم ایک دوسرے کو برسوں سے جانتے تھے

گھوڑے کافی دیر ہوئی جوتے جا چکے تھے۔ لیکن پھر بھی۔۔۔ میرا دل نہیں چاہتا تھا کہ میں پوسٹ ماسٹر اور اس کی بیٹی سے رخصت ہو جاؤں۔ آخر کار میں نے خیرباد کہی۔ اُس آدمی نے مجھے اچھے سفر کی دعا دی اور اُس کی بیٹی مجھے گاڑی تک چھوڑنے آئی۔ میں ڈیوڑھی میں رُک گیا۔ اور اس سے بوسے کی فرمائش کی۔ ڈونیا مان گئی۔ میں بہت سے بوسے گن سکتا ہوں۔

"اُس دن سے جب کہ میں پہلی بار اس شرارت میں طاق ہوا تھا لیکن اُن میں سے ایک بھی اتنی دیر پا اور اتنی خوش گوار یاد میرے دل میں نہیں چھوڑ گیا۔

کئی برس گذر گئے۔ اور حالات ایک بار پھر مجھے ڈاک کی سڑک پر اُنہیں مقامات پر لے گئے۔ مجھے پوسٹ ماسٹر کی بیٹی کی یاد آئی اور اُس سے دوبارہ ملاقات کرنے کے خیال سے مجھے خوشی محسوس ہوئی۔ میں نے سوچا، لیکن شاید پوسٹ ماسٹر بدل گیا ہو اور ڈونیا غالباً اب ایک شادی شدہ عورت ہوگی" یہ خیال بھی میرے ذہن میں پیدا ہوا کہ شاید اُن میں سے ایک مر چکا ہو اور میں دل میں مبہم اندیشے لئے ہوئے — چوکی کے قریب ہوتا گیا۔ گھوڑے ڈاک گھر کے پاس آکر رک گئے۔

میں نے کمرے میں داخل ہوتے ہی فوراً فضول خرچ بیٹے کی کہانی کی ترجمانی کرنے والی تصویروں کو پہچان لیا۔ میز اور بستر اپنی پرانی جگہوں پر پڑے تھے۔ لیکن اب کھڑکیوں میں پھول نہیں تھے۔ اور آس پاس کی ہر چیز تنزل اور لاپروائی کی داستان سنا رہی تھی۔ پوسٹ ماسٹر ایک بھیڑ کی کھال کا کوٹ اوڑھے سو رہا تھا۔

جب میں اندر داخل ہوا تو وہ جاگ پڑا اور اپنے بنچ سے اُٹھ بیٹھا۔ . . . .

وہ سیمیون وائرن ہی تھا۔ لیکن وہ کتنا بوڑھا ہو گیا تھا جب وہ میرا پروانہ راہداری نقل کرنے میں مشغول تھا۔ تو میں نے اس کے سفید بالوں، اس کے ایک عرصے سے بے حجامت چہرے کی جھریوں، اس کی جھکی ہوئی پشت — کو دیکھا — اور اس بات پر حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکا کہ کس طرح تین چار برس "ایک طاقتور انسان کو ایسا عمر رسیدہ شکستہ ڈھانچ بنانے کے لئے کافی ہیں۔

کیا تم مجھے پہچانتے ہو؟" میں نے پوچھا۔ ہم پرانے شناسا ہیں۔ بوڑھے آدمی نے روکھے پن سے جواب دیا۔ بے شک۔ یہ ایک چلتی ہوئی سڑک ہے۔ یہاں سے بے شمار مسافر گزرتے ہیں"

"تمہاری بیٹی تو اچھی ہے؟" میں نے سلسلہ جاری رکھا۔ بوڑھے آدمی نے تیوری چڑھائی۔ خدا جانے" اُس نے جواب دیا!

"شادی ہو گئی ہے میرے خیال میں؟" بوڑھے آدمی نے ایسا ظاہر کیا گویا اس نے میرا سوال سنا ہی نہیں۔ اور منہ ہی منہ میں میرا

پروانہ راہ داری پڑھتا گیا۔

میں نے اپنے سوالات بند کر دیئے اور کچھ چائے منگوائی۔ شوقِ تحقیق میرے دل میں چٹکیاں لینے لگا تھا۔ مجھے امید تھی کہ شراب کا ایک قطرہ میرے دوست کی زبان کھول دے گا۔

میں غلطی پر نہیں تھا۔ جو گلاس میں نے اسے پیش کیا بوڑھے آدمی نے اُسے لینے سے انکار نہ کیا۔ اور میں نے دیکھا کہ رم نے اُس کے روکھے پن کو دور کر دیا۔ دوسرے گلاس کے بعد وہ کھُل کر باتیں کرنے لگا۔ اس نے مجھے پہچان لیا یا یہ کہا کہ اس نے پہچان لیا ہے۔ اور میں نے اس سے ایک کہانی سنی۔ جو مجھے دلچسپ معلوم ہوئی۔ اور جس نے مجھ پر گہرا اثر ڈالا۔

"اچھا تو آپ میری دونیا کو جانتے ہیں؟ وہ کہنے لگا۔ آہ! دونیا۔ دونیا! ایسی لڑکی تھی وہ! جس کسی کو ادھر سے گذرنے کا اتفاق ہوتا وہ اُس کی تعریف کئے بغیر نہ رہ سکتا۔ اور کوئی بھی اس کے خلاف ایک سخت لفظ منہ سے نہیں نکالتا تھا۔ خواتین اسے تحفے دیا کرتی تھیں۔ کوئی اُسے لال رومال دیتی۔ کوئی کانوں کی بالیاں ادھر سے گذرنے والے (GENTLEMEN) شریف زادے اس بہانے سے کہ انھیں ڈنر یا سپر چاہیئے، جان بوجھ کر ٹھہر جاتے لیکن دراصل صرف اس لئے کہ اُسے تھوڑی دیر اور دیکھ لیں مسافر کتنا ہی ناراض ہوتا۔ اُسے دیکھتے ہی ٹھنڈا پڑ جاتا اور مجھ سے نرمی سے بات کرتا۔ ذرا سوچئے تو جناب؟ نامہ بر اور پیغام لے جانے والے سوار تک اس سے آدھ آدھ گھنٹہ بات کرتے سارے گھر کا بوجھ اس کے کاندھوں پر تھا۔

کیا صاف کرنا ہے؟ کیا تیار کرنا ہے؟ اُسے ہر چیز کا خیال رہتا۔ اور میں بوڑھا پاگل جو تھا، اس کی کافی قدر نہ کر سکا۔ اُس سے کافی مسرت حاصل نہ کر سکا۔ کیا میں اپنی دونیا سے پیار نہیں کرتا تھا۔ کیا میں اپنی بیٹی کو دل سے نہیں چاہتا تھا؟ کیا وہ میرے ساتھ خوش نہیں تھی؟ خیر۔ انسان اپنی قسمت سے نہیں بھاگ سکتا جو قسمت میں لکھا ہوتا ہے، ہو کر رہتا ہے:

یہاں پہنچ کر وہ مجھے اپنی بدقسمتی کی تفصیل سنانے لگا۔ تین برس پہلے سرما کی ایک شام کو جب پوسٹ ماسٹر ایک نئے روزنامے پر لکیریں کھینچ رہا تھا۔ اور اُس کی بیٹی اوٹ کے پیچھے اپنے لئے ایک نیا فراک سی رہی تھی، ایک گاڑی آ کر رکی اور ایک سرکاسین ٹوپی والا مسافر ایک بڑا فوجی کوٹ پہنے اور گلے کے گرد ایک گلوبند لپیٹے کمرے میں داخل ہوا اور اُس نے گھوڑوں کا مطالبہ کیا۔ تمام گھوڑے باہر سڑک پر جا چکے تھے۔ یہ سُن کر مسافر اپنی آواز اور اپنا کوڑا بلند کرنے ہی والا تھا کہ دونیا جو ایسے واقعات کی عادی تھی۔ اوٹ کے پیچھے سے بھاگ باہر نکل آئی اور اس نے بڑے تحمل سے پوچھا کہ کیا مسافر کچھ کھانا پسند نہیں کریگا دونیا کی آمد کا حسب معمول اثر ہوا۔ مسافر کا غصہ اتر گیا وہ گھوڑوں کا انتظار کرنے پر راضی ہو گیا اور اس نے کچھ سپر منگوایا جب اُس نے اپنی گیلی بالدار ٹوپی اُتار دی اور گلوبند کھول دیا اور اپنا بڑا کوٹ جھٹکا دے کر جسم سے الگ کر لیا تو وہ ایک چھریرے جسم اور چھوٹی چھوٹی مونچھوں والا کسی فوجی رسالے کا نوجوان ثابت ہوا وہ آرام سے ایک چھوٹی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اور پوسٹ ماسٹر... اور اُس کی بیٹی سے ہنسی خوشی باتیں کرنے لگا۔ سپر حسن دیا گیا اس اثنا میں گھوڑے بھی آ گئے تھے۔ اور پوسٹ ماسٹر نے حکم دیا کہ انھیں کچھ کھلائے بغیر فوراً مسافر کی گاڑی میں جوت دیا جائے لیکن جب وہ صحن سے واپس لوٹا تو اس نے نوجوان آدمی کو بیہوشی کی حالت میں بنچ پر لیٹے ہوا پایا۔ وہ بیمار پڑ گیا تھا۔ اس کا سر پھٹا جا رہا تھا۔ اس کے لئے سفر جاری رکھنا ممکن نہیں تھا...... کیا کیا جا سکتا تھا! پوسٹ ماسٹر نے اپنا بستر اُسے دے دیا اور یہ طے پایا کہ اگر بیمار آدمی کی حالت اگلی صبح تک بہتر نہ ہوئی تو ڈاکٹر کو لانے کے لئے کسی کو شہر بھیجا جائے گا۔

اگلے دن سوار کی حالت بدتر ہو گئی۔ اس کا نوکر گھوڑے پر سوار ہو کر ڈاکٹر کو لانے شہر گیا۔ دونیا نے سرکے میں بھگوئی ہوئی پٹی اس کے سر پر باندھی۔ اور اس کے بستر کے پاس بیٹھ کر سلائی کرنے لگی۔ جب تک پوسٹ ماسٹر وہاں رہا۔ بیمار آدمی کراہتا رہا اور اُس نے منہ سے ایک لفظ تک نہ نکالا۔ تاہم اُس نے قہوہ کے دو پیالے پی لئے۔ اور کراہتے کراہتے کچھ لنچ لانے کا حکم دیا۔ دونیا اُس کے پاس سے نہ اُٹھی۔ وہ بار بار کچھ پینے کو مانگتا اور دونیا اپنے ہاتھوں سے تیار کئے ہوئے لیموں کے رس کی ایک صراحی اس کے پاس لے جاتی۔ بیمار آدمی اپنے ہونٹوں کو تر کرتا اور جب کبھی وہ صراحی واپس دیتا۔ وہ اظہار تشکر کے لئے دونیا کا ہاتھ اپنی کمزور انگلیوں سے دبا دیتا۔ لنچ کے وقت ڈاکٹر آ گیا۔ اس نے مریض کی نبض دیکھی۔ جرمنی زبان میں اس سے باتیں کیں۔ اور روسی زبان میں اعلان کیا کہ مریض آدمی کو صرف آرام اور سکون کی ضرورت ہے۔ اور وہ چند ایک

دنوں میں اس قابل ہو جائے گا کہ اپنا سفر جاری رکھ سکے۔ فوجی نے اُسے اُس کی زحمت کے صلے میں بیس روپے کی موٹی رقم ادا کی۔ اور اسے لنچ کی دعوت دی۔ ڈاکٹر نے دعوت قبول کر لی۔ دونوں نے خوب پیٹ بھر کر کھایا، شراب کی ایک بوتل کھولی۔ اور ایک دوسرے سے بہت خوش ہو کر جدا ہوئے۔

ایک دن اور گزر گیا اور فوجی بالکل تندرست ہو گیا۔ وہ غیر معمولی طور پر خوش تھا۔ وہ بار بار پوسٹ ماسٹر اور اُس کی بیٹی سے مذاق کرتا۔ سیٹی بجا کر دُھنیں نکالتا۔ مسافروں سے گپیں ہانکتا اُن کے پاس نقل کرتا۔ معزز پوسٹ ماسٹر اُس سے اس قدر مانوس ہو گیا کہ اُسے تیسری صبح اپنے دلآویز مہمان سے جدا ہوتے وقت کافی افسوس ہوا۔ وہ اتوار کا دن تھا اور دونیا گرجا گھر جانے کی تیاری کر رہی تھی۔ فوجی کی گاڑی آ دھمکی۔ اس نے پوسٹ ماسٹر کو الوداع کہی اور اپنے قیام کے عوض دل کھول کر انعام دیتے ہوئے دونیا سے رخصت چاہی۔ اور اُسے گاڑی میں بٹھا کر گرجا گھر تک چھوڑنے کے لئے جو گاؤں کے سرے پر واقع تھا۔ اپنی خدمات پیش کیں، دونیا ہچکچائی۔۔۔۔۔ "تجھے ڈر کس بات کا ہے؟" اس کے باپ نے پوچھا۔ "یہ شریف زادہ بھیڑیا تو نہیں، یہ تجھے کھا تو نہیں جائے گا گاڑی میں بیٹھ کر گرجا گھر تک چلی جا!" دونیا فوجی کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ گئی۔ نوکر اچھل کر گاڑی کے بکس میں بیٹھ گیا۔ کوچوان نے سیٹی بجائی۔ اور گھوڑے سرپٹ روانہ ہوئے۔

بیچارہ پوسٹ ماسٹر سمجھ ہی نہ سکا کہ اُس نے دونیا کو فوجی کے ساتھ بیٹھنے کی اجازت کیسے دے دی، وہ اس قدر اندھا کیسے ہو سکتا تھا۔ اس کے ہوش و حواس کہاں ٹھیک تھے ابھی آدھ گھنٹہ بھی نہیں گزرا تھا کہ وہ فکر مند ہونے لگا اور آخر کار اُس پر بے چینی اس درجہ غالب آ گئی کہ وہ اپنے آپ کو گرجا گھر کی طرف جانے سے نہ روک سکا۔ جب وہ گرجا گھر کے قریب پہنچا تو اُس نے دیکھا کہ مجمع اس وقت منتشر ہو رہا تھا لیکن دونیا گرجا گھر کے باہر تھی نہ (PARCH) چھتے کے نیچے۔ وہ جلدی سے اندر گیا۔ پادری ممبر سے اتر رہا تھا۔ نگہبان بتیاں بجھا رہا تھا۔ دو بوڑھی عورتیں ابھی تک ایک کونے میں دعا مانگ رہی تھیں۔ لیکن دونیا کا کوئی نشان نہیں تھا۔ پوسٹ ماسٹر نے اپنی ہچکچاہٹ پر قابو پا کر نگہبان سے پوچھا کہ کیا اس کی بیٹی پرستش کے وقت موجود تھی نگہبان نے جواب دیا کہ وہ موجود نہیں تھی۔ پوسٹ ماسٹر آپے سے باہر ہو کر گھر لوٹا۔ ایک اُمید باقی رہ گئی تھی کہ شاید دونیا نے کم سنی سے کام لے کر جو اس کے سن کا خاصہ ہے۔ گاڑی میں بیٹھ کر اگلی چوکی تک جانے کا ارادہ کر لیا ہو۔ جہاں اُس کی دادی رہتی تھی۔ فکر میں جکڑا ہوا وہ اُس گاڑی کی واپسی کا انتظار کرنے لگا۔ جس سے اُس نے دونیا کو جانے دیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوچوان کبھی نہیں آئے گا۔ آخر کار وہ شام کے قریب اکیلا اور شراب کے نشے میں چور، یہ تباہ کن خبر لے کر نمودار ہوا کہ دونیا اگلی چوکی سے فوجی کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ کر چلی گئی ہے۔

بوڑھا آدمی اپنی بدقسمتی برداشت کرنے کے قابل نہیں تھا وہ جھٹ اُس بستر پر پڑ گیا۔ جس پر دو دن پہلے وہ نوجوان دھوکے باز لیٹا ہوا تھا۔ تمام حالات کا جائزہ لے کر اُس نے اندازہ لگایا کہ فوجی کی بیماری بناوٹی تھی۔ وہ بدنصیب شدید بخار سے بیمار پڑ گیا۔ اُسے شہر بھیج دیا گیا۔ اور اُس کی جگہ عارضی طور پر کسی دوسرے نے لے لی وہی ڈاکٹر جس نے فوجی کی تیمارداری کی تھی اس کی حالت دیکھنے کے لئے بلایا گیا۔ اس نے پوسٹ ماسٹر کو یقین دلایا کہ وہ نوجوان آدمی بالکل تندرست تھا۔ اور اُسے اُس کے بد ارادے کا شک اُسی وقت ہوا تھا لیکن وہ فوجی کے چابک کے ڈر کے مارے چپ ہو رہا تھا۔ جرمن سچ بول رہا تھا یا وہ محض اپنی ذہانت کا اظہار کرنا چاہتا تھا۔ جو کچھ اس نے کہا اُس سے غریب آدمی کو کسی طرح تسکین نہ پہنچی۔ ابھی وہ بیماری سے بمشکل روبصحت ہوا تھا کہ اُس نے سہر۔۔۔ کے پوسٹ ماسٹر سے دو مہینے غیر حاضر رہنے کی چھٹی لے لی۔ اور کسی کو اپنے ارادے کی خبر کئے بغیر اپنی بیٹی کی تلاش میں پیدل چل نکلا۔ نوجی کے بہ وانہ راہ داری کے اندراج سے اُسے معلوم تھا کہ کیپٹن مینسکی (MINSKY) سمولنسک سے سینٹ پیٹرسبرگ کی جانب سفر کر رہا تھا۔ جس شخص نے اُس کی گاڑی چلائی تھی اس نے بتایا کہ دونیا سارا راستہ روتی رہی تھی حالانکہ ظاہر یہ ہوتا تھا کہ وہ اپنی مرضی سے چلی گئی تھی۔ پوسٹ ماسٹر نے سوچا شاید میں اپنی کھوئی ہوئی بچی کو گھر واپس لے آؤں، یہ سوچتا ہوا وہ سینٹ پیٹرسبرگ پہنچا۔ وہ ازمیلوسکی کے بارکوں میں ایک غیر کمیشن یافتہ افسر کے یاں ٹھیرا جس کے ساتھ اُس نے فوج میں نوکری کی تھی اور اس نے تلاش شروع کر دی اُسے جلد ہی معلوم ہو گیا کہ کیپٹن منسکی سینٹ پیٹرسبرگ میں ہے اور ہوٹل میں ٹھیرا ہوا ہے۔ پوسٹ ماسٹر نے تہیہ کر لیا کہ وہ اس سے وہیں ملے گا صبح سویرے وہ کیپٹن کے پیشی کمرے میں داخل ہوا اور اس نے

درخواست کی کہ جناب والا کو اطلاع دی جائے کہ ایک بوڑھا فوجی اُن سے ملنے کی خواہش رکھتا ہے، سائیس نے، جو درخت پر ایک جوتا رکھ کر اُسے پالش کر رہا تھا۔ جواب دیا کہ اس کا مالک سو رہا ہے اور گیارہ بجے سے پہلے کسی سے نہیں ملتا۔ پوسٹ ماسٹر چلا گیا اور مقررہ وقت پر واپس آ گیا۔ منسکی شب خوابی کا لبادہ اور سر پر ایک سُرخ رنگ کی ٹوپی پہنے خود اُس سے ملنے کے لئے باہر آیا۔ "کیوں بے تجھے کیا چاہئے؟" بوڑھے آدمی کا دل کھول اٹھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور وہ کانپتی ہوئی آواز میں صرف اتنا کہہ سکا۔

"جناب والا۔ خدا کے لئے — مہربانی کر کے —"
منسکی نے اس پر ایک سرسری نظر ڈالی۔ منسکی کا چہرہ سُرخ ہو گیا۔ پوسٹ ماسٹر کا ہاتھ پکڑا۔ اُسے اپنی مطالعہ گاہ میں لے گیا اور پیچھے سے دروازہ بند کر دیا۔ جناب والا، بوڑھے نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا "جو چھکڑے سے گر گیا وہ کھو گیا وہ گم ہو گیا۔ کم از کم میری غریب دونیا کو تو مجھے واپس دے دیجئے، آپ اس لڑکی سے لطف اندوز ہو چکے ہیں۔ اُسے بلا وجہ تباہ تو نہ کیجئے"! اب پچھتائے کیا ہوت، جب چڑیاں چگ گئیں کھیت؛ نوجوان آدمی نے سراسیمہ ہو کر کہا، میں نے تمہارے حق میں برا کیا ہے۔ اور مجھے تم سے معافی ضرور مانگنی چاہئے۔ لیکن یہ خیال ایک منٹ کے لئے بھی دل میں لاؤ کہ میں دونیا کو چھوڑ دوں گا۔

میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ وہ خوش رہے گی، وہ تمہارے پاس واپس کیوں جائے؟ وہ مجھ سے محبت کرتی ہے۔ وہ اپنے گذشتہ حالات کو بھلا چکی ہے۔ جو کچھ ہو گیا ہے، اُسے وہ یا تم کبھی نہیں بھلا سکو گے! پھر اُس نے بوڑھے آدمی کی آستین میں چپکے سے کچھ ڈال کر دروازہ کھولا پوسٹ ماسٹر نہ جانے کس طرح پھر اپنے آپ کو گلی میں پایا۔

بڑی دیر تک وہ بے حس و حرکت کھڑا رہا۔ پھر اس کی نظر اپنی آستین میں ایک لپٹے ہوئے کاغذ پر پڑی۔ اس نے اُسے باہر کھینچا اور پچاس پچاس روبل کے چند .... مروڑے ہوئے۔ نوٹ کھولے۔ ایک بار پھر آنسو — غم و غصہ کے آنسو — اُس کی آنکھوں میں بھر آئے۔ اس نے نوٹوں کو توڑ مروڑ کر ایک گیند بنایا۔ انہیں زمین پر دے مارا۔ انھیں ایڑی تلے روندا۔ اور اپنا راستہ لیا۔ .... ذرا تھوڑی دور جانے کے بعد وہ رُکا۔ اس نے ایک لمحے کے لئے سوچا — اور

الٹے قدم واپس آیا۔ ...... لیکن اب نوٹ وہاں نہیں تھے، ایک خوش پوش جوان آدمی اُسے قریب آتے دیکھ کر ایک گاڑی کی طرف لپکا اچھل کر اندر چلا گیا۔ اور چلایا "لے چلو" پوسٹ ماسٹر نے اُسے پکڑنے کی کوشش نہ کی، اس نے پکا ارادہ کر لیا کہ وہ واپس جا کر دوبارہ نوکری کر لے گا۔ لیکن اُس کے جی میں آئی کہ ایسا کرنے سے پہلے اُسے اپنی غریب دونیا سے آخری مرتبہ ضرور مل لینا چاہئے، اس اُمید کو دل میں لے کر وہ دو دن کے بعد منسکی کی جائے رہائش پر پہنچا۔ لیکن سائیس نے تُنک کر اس سے کہا کہ اس کا مالک کسی سے ملنا نہیں چاہتا۔ اُسے نکال باہر کیا۔ اور اس کے پیچھے کھٹ سے دروازہ بند کر دیا۔ پوسٹ ماسٹر تھوڑی دیر وہاں کھڑا رہا۔ اور پھر اس نے اپنا راستہ لیا۔

اُسی دن شام کو وہ چرچ اوف آل آفلکٹڈ (CHURCH OF ALL AFFLICTED) کے گرجا گھر میں پرستش میں شریک ہونے کے بعد لٹینیا سٹریٹ پر چل رہا تھا کہ ایک خوبصورت گاڑی اُس کے قریب سے تیزی سے گزری۔ اور اُس نے اُس گاڑی میں منسکی کو پہچان لیا۔ گاڑی ایک سہ منزلہ مکان کے دروازے پر رُکی۔ اور فوجی دوڑ کر سیڑھیوں پر چڑھ گیا۔ پوسٹ ماسٹر کے ذہن میں ایک مسرت خیز خیال دوڑ گیا۔ وہ واپس مڑا۔ اور کوچوان کے پاس جا کر اس نے پوچھا۔ بھائی یہ گھوڑا کس کا ہے؟ کیا یہ کیپٹن منسکی کا تو نہیں؟ تو ٹھیک کہتا ہے۔ کوچوان نے جواب دیا" لیکن تجھے اس سے کیا؟ بات یہ ہے کہ تمہارے آقا نے مجھے ایک رقعہ اس کی دونیا تک پہنچانے کا حکم دیا ہے اور میں وہاں گیا بھی لیکن یہ بھول گیا کہ وہ رہتی کہاں ہے؟

"ارے ٹھیک یہیں۔ دوسری منزل پر" لیکن بھائی تو رقعہ لے کر دیر سے پہنچا ہے، وہ اُسی کے پاس خود پہنچ گیا ہے"

"کچھ پروا نہیں، پوسٹ ماسٹر نے جواب دیا۔ مہربانی، جو تم نے یہ بتا دیا لیکن مجھ سے جو کہا گیا ہے۔ مجھے ضرور کرنا چاہئے۔ اور یہ کہہ کر وہ مکان کے اندر داخل ہوا۔ اور سیڑھیوں پر چڑھ گیا۔

دروازہ بند تھا۔ اُس نے گھنٹی بجائی۔ چند سکینڈ تکلیف دہ انتظار میں گذرے۔ قفل میں ایک کنجی نے رگڑ کھائی اور دروازہ کھل گیا۔ اُس نے پوچھا "کیا اودوتیا سیمیونورنا، یہاں رہتی ہے؟" "ہاں یہیں رہتی ہے؛ نوخیز نوکرانی نے جواب دیا" تمہیں اس سے کیا کام ہے؟ پوسٹ ماسٹر جواب دیئے بغیر اندر چل دیا۔ "ٹھیرو، ٹھیرو"، لڑکی اس کے پیچھے سے چلائی اودوتیا سیمیونورنا کے پاس ملاقاتی ہیں۔

لیکن اس کی بات پر کوئی توجہ دیئے بغیر پوسٹ ماسٹر آگے بڑھتا گیا۔ پہلے تو

کمروں میں اندھیرا تھا۔ لیکن تیسرے کمرے میں روشنی تھی۔ وہ کھلے ہوئے دروازے تک پہنچا اور رُک گیا۔ خوبصورتی سے سجائے ہوئے کمرے میں ہینسکی سوچ میں کھویا ہوا بیٹھا تھا۔ دُونیا جدید ترین فیشن کے کپڑوں میں ملبوس، اُس کی کرسی کے بازو پر اس طرح بیٹھی تھی گویا ایک رُخی کاٹھی پر کوئی خاتون۔ وہ اپنی چمکتی ہوئی انگلیوں کے گرد اپنے بالوں کے کالے گھونگروں کو لپیٹتی ہوئی ہینسکی کو میٹھی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ اُسے اپنی بیٹی اس قدر حسین کبھی نہیں دکھائی دی تھی۔ وہ اُسے حیرت سے دیکھے بنا نہ رہ سکا۔

یہ کون ہے؟ اُس نے سر اوپر اٹھائے بغیر پوچھا۔ پوسٹ ماسٹر نے کچھ نہ کہا۔ کوئی جواب نہ پاکر اُس نے اوپر نظر اٹھا کر دیکھا — اور ایک چیخ مار کر قالین پر دھڑام سے گر پڑی۔ ہینسکی گھبرا کر اُسے اٹھانے کے لئے لپکا۔ پھر بوڑھے آدمی کو دروازے میں دیکھ کر اس نے دونیا کو چھوڑ دیا اور غصے سے کانپتے ہوئے اُس کی جانب بڑھا۔

"تجھے کیا چاہئے؟" اُس نے دانت پیس کر کہا، "تو ایک ڈاکو کی طرح میرے پیچھے پیچھے کیوں رینگتا پھرتا ہے؟ کیا تو میرا گلا کاٹنا چاہتا ہے؟ نکل جا، یہاں سے —" اور اُس نے بوڑھے آدمی کے کوٹ کا کالر اپنی طاقتور مٹھی میں پکڑ کر اُسے دھکا دے کر سیڑھیوں پر پھینک دیا۔

بوڑھا آدمی اپنی جائے رہائش کو لوٹ آیا۔ اُس کے دوست نے اُسے رپٹ لکھوانے کا مشورہ دیا۔ لیکن پوسٹ ماسٹر نے تھوڑی دیر سوچا، مایوس ہو کر اپنا ہاتھ ہوا میں ہلایا۔ اور کشمکش کو ختم کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ دو دن بعد وہ پیٹرسبرگ سے چلا آیا اور واپس اپنی چوکی کو لوٹ آیا۔ جہاں اُس نے اپنے فرائض دوبارہ سنبھال لئے۔

اُس نے بات ختم کرتے ہوئے کہا یہ تیسرا سال ہے جو میں دونیا کے بغیر گزار رہا ہوں۔ اور اُس کی طرف سے یا اس کی بابت ایک لفظ نہیں سنا۔ وہ زندہ ہے یا مر گئی ہے، صرف خدا ہی جانتا ہے۔ ہر قسم کی باتیں واقع ہوتی ہیں۔ وہ سب سے پہلی لڑکی نہیں اور نہ ہی وہ سب سے آخری لڑکی ہوگی، جسے ایک حرامزادے مسافر نے اغوا کیا۔ تھوڑا عرصہ اپنے ساتھ رکھا اور پھر اُسے رَد کر دیا۔ سینٹ پیٹرسبرگ میں اس قسم کی بے شمار نوجوان بیوقوف لڑکیاں ہیں۔ آج ریشم و کمخواب میں ملبوس اور کل تم اُنہیں سرائے کی (TAVERNSLUMS) گندی عورتوں کے ساتھ گلیوں کا کوڑا کرکٹ صاف کرتے ہوئے پاؤ گے۔ اگر تم تھوڑی دیر رُک کر سوچنے لگو کہ شاید دونیا کا انجام بھی ویسا ہی ہوگا۔ تو تم گناہ کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اور تمہیں یہ خواہش بھی ہوگی کہ کاش وہ مر گئی ہوتی۔

یہ کہانی تھی جو میں نے اپنے دوست بوڑھے ماسٹر کی زبانی سنی ایک ایسی کہانی جس کا سلسلہ کئی بار آنسوؤں نے توڑ دیا جنہیں اُس نے میتریف کی دلآویز چاربیت کے وفادار کردار تیسریبتیچ کی طرح اپنے کوٹ سے بڑے دلکش انداز سے پونچھ دیا۔ یہ آنسو کسی حد تک شراب کی وجہ سے بھی نکل آئے تھے۔ جس کے پانچ گلاس اُس نے کہانی سنانے کے دوران میں حلق سے نیچے اتار لئے تھے، لیکن کچھ بھی ہو مجھ پر اُن کا گہرا اثر پڑا۔ اُس سے رخصت ہونے کے بعد دیر تک میں بوڑھے پوسٹ ماسٹر کو بھول نہ سکا۔ بڑی دیر تک میں بیچاری دونیا کی بابت سوچتا رہا۔

بہت عرصہ نہیں گزرا تھا کہ جب میں ـــــ کے قصبے سے گزر رہا تھا کہ مجھے اپنا دوست یاد آ گیا۔ مجھے معلوم ہوا کہ وہ چوکی جو اُس کی نگرانی میں تھی، اب ہٹا دی گئی ہے لیکن جب میں نے یہ پوچھا کہ کیا پوسٹ ماسٹر ابھی تک زندہ ہے یا نہیں تو کسی نے کوئی تسلی بخش جواب نہ دیا۔ نتیجتاً اُسی جانی پہچانی جگہ جانے کا ارادہ کر لیا۔ چند گھوڑے کرائے پہ لئے اور ن کے گاؤں کی طرف چل دیا۔

خزاں کا موسم تھا۔ چھوٹے چھوٹے سپید بادل آسمان پر چھائے ہوئے تھے۔ جھنڈدار کھیتوں کی جانب سے خنک ہوا چل رہی تھی، درختوں سے ٹکراتی ہوئی اُن سے سرخ اور پیلے پتے چنتی ہوئی ـــ میں گاؤں میں اُس وقت پہنچا جب سورج ڈوب رہا تھا اور میں ڈاک کی چوکی کے سامنے رُک گیا۔ اُسی دروازے سے.... جہاں ایک بار دونیا نے مجھے چوما تھا۔ ایک موٹی دیہاتی عورت نکلی جس نے میرے سوالوں کا جواب ان الفاظ میں دیا کہ بوڑھے پوسٹ ماسٹر کو مرے ہوئے ایک سال ہو گیا ہے، اور اُس کے گھر میں ایک شراب کشید کرنے والا آ گیا ہے اور وہ خود اُس شراب کشید کرنے والے کی بیوی ہے۔ مجھے اپنے مصرف سفر اور اُن سات روبلوں پر جو میں نے بے کار خرچ کر دیئے تھے، افسوس ہونے لگا۔

"وہ کس چیز سے مرا؟" میں نے شراب کشید کرنے والے کی بیوی سے پوچھا۔

"شراب، جناب" اُس نے جواب دیا

"اور وہ دفنایا کہاں گیا ہے ـــ؟"

"گاؤں کے باہر، اپنی بیوی کے پاس،"

"کیا مجھے کوئی اُس کی قبر تک لے جا سکتا ہے؟"

"ہاں۔ کیوں نہیں اونیسکا! بلی کو کافی تنگ کر چکا ہے تو! ان صاحب کو قبرستان لے جا اور انہیں پوسٹ ماسٹر کی قبر دکھا دے!"

یہ الفاظ سن کر پھٹے پرانے کپڑوں میں ملبوس ایک کانا اور سُرخ بالوں والا لڑکا بھاگ کر گھر سے نکلا۔ اور مجھے گاؤں سے باہر لے گیا۔

"کیا تم پوسٹ ماسٹر کو جانتے تھے؟" میں نے چلتے چلتے پوچھا

"بے شک، میں جانتا تھا۔ خدا اُس کا بھلا کرے! اُس نے مجھے سرکنڈوں کو کاٹنا سکھایا۔ وہ سرائے سے باہر نکلتا اور ہم پیچھے سے اُسے پکارتے "دادا جان! دادا جان! ہمیں کچھ اخروٹ دو" اور وہ ہمیں اخروٹ بھی دیتا۔ وہ سارا وقت ہم سے کھیلتا رہتا تھا"

"کیا مسافر ابھی تک اس کی بابت باتیں کرتے ہیں؟"

"نہیں، ان دنوں زیادہ مسافر نہیں آتے۔ ثالث کبھی کبھی ادھر سے گزرتا ہے۔ لیکن اُس کے پاس مُردہ لوگوں کے لئے وقت نہیں ہوتا۔ پھر بھی اس بار گرمیوں کے موسم میں ایک خاتون اس طرف آئی تھی۔ اور اُس نے سچ مچ بوڑھے پوسٹ ماسٹر کے بارے میں پوچھا۔ اور وہ اس کی قبر پر گئی"

"وہ کس قسم کی خاتون تھی؟" میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

"وہ ایک خوبصورت خاتون تھی۔ لڑکے نے جواب دیا

"وہ تین ننھے بچوں اور ایک آیا اور ایک کالے رنگ کے کتے کو ساتھ لئے چھ گھوڑوں والی گاڑی میں آئی۔ اور جب اُسے بتایا گیا کہ بوڑھا پوسٹ ماسٹر مر چکا ہے تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اور بچوں سے کہنے لگی "تم آرام سے بیٹھو۔ میں قبرستان جاتی ہوں" میں اُسے لے چلنے کے لئے اپنے آپ کو پیش کرنے لگا تھا، کہ وہ خاتون کہنے لگی "میں خود راستہ جانتی ہوں" اور اُس نے مجھے چاندی کے پانچ ہوپک دیئے ——— ایسی مہربان خاتون تھی وہ؟

ہم قبرستان پہنچ گئے۔ محض زمین کا ایک ٹکڑا تھا باڑھوں سے خالی۔ جس پر لکڑی کی صلیبوں نے نکتے ڈال رکھے تھے۔ اور جس پر اور کسی درخت کا سایہ نہیں تھا۔ میں نے اپنی زندگی میں ایسا اجاڑ قبرستان کبھی نہیں دیکھا تھا۔

یہ رہی بوڑھے پوسٹ ماسٹر کی قبر، لڑکے نے ریت کے ایک ڈھیر پر کودتے ہوئے کہا۔ جس کے اوپر ایک پیتل کے فیتے والی کالے رنگ کی صلیب ابھری ہوئی تھی۔

"کیا وہ خاتون یہیں آئی تھی؟" میں نے پوچھا۔

"یہیں جناب" ونیکلے نے جواب دیا "میں اسے دور سے دیکھ رہا تھا۔ وہ یہاں لیٹ گئی اور بڑی دیر تک لیٹی رہی۔ پھر وہ واپس گاؤں چلی گئی، اس نے پادری کو بلوایا اور اُسے کچھ نقدی دی۔ اور گاڑی میں بیٹھ کر چل دی۔ لیکن مجھے اُس نے چاندی کے پانچ ہوپک دیئے ——— وہ ایک خوبصورت خاتون تھی۔

میں نے بھی اُس لڑکے کو پانچ ہوپک دیئے۔ اور مجھے اپنے سفر یا ان سات روبلوں پر جو میں نے خرچ کر دیئے ذرا بھی افسوس باقی نہ رہا۔

(مکتبہ پبلشرز لمیٹڈ بمبئی کے شکریے کے ساتھ زیرِ طبع کتاب "روسی ادب" کی ایک کہانی)

مولانا ابوالکلام آزاد

متوارث روایات

"انسان کی دماغی ترقی کی راہ میں سب سے بڑی روک اُس کے تقلیدی عقائد ہیں۔ اُسے کوئی طاقت اس طرح جکڑ بند نہیں کر سکتی ہے جس طرح تقلیدی عقائد کی زنجیریں کر دیا کرتی ہیں۔ وہ اُن زنجیروں کو توڑ نہیں سکتا اس لئے کہ توڑنا چاہتا ہی نہیں وہ انھیں زیور کی طرح محبوب رکھتا ہے۔ ہر عقیدہ، ہر عمل، ہر نقطۂ نگاہ جو اُسے خاندانی روایات اور ابتدائی تعلیم و صحبت کے ہاتھوں مل گیا ہے اس کے لئے ایک مقدس ورثہ ہے۔ وہ اس ورثہ کی حفاظت کرے گا۔ مگر اُسے چھونے کی جرأت نہیں کرے گا۔ بسا اوقات موروثی عقائد کی پکڑ اتنی سخت ہوتی ہے کہ تعلیم اور گرد و پیش کا اثر بھی اُسے ڈھیلا نہیں کر سکتا۔ تعلیم دماغ پر ایک نیا رنگ چڑھا دے گی لیکن اس کی بناوٹ کے اندر نہیں اُترے گی۔ بناوٹ کے اندر ہمیشہ نسل، خاندان، اور صدیوں کی متوارث روایات ہی کا ہاتھ کام کرتا رہے گا،

قمر ہاشمی

زاویے!

بھٹک رہے ہیں ابھی کارواں غریبی کے — لرز رہی ہے جبیں آسمان و انجم کی
ترس رہے ہیں خوشی کیلئے ہزاروں دل — ابھی لبوں...... کو اجازت نہیں تبسم کی

ابھی تو ظلمتیں چھائی ہوئی ہیں گلشن پر — ابھی تو خار بھی پھولوں پہ مسکراتے ہیں
ابھی چمن ہیں خرابِ جہانِ رنگ و بو — ابھی تو مہر کا ذرے بھی منہ چڑاتے ہیں

ابھی نظام قتیلِ تبسمِ زر ہے — ابھی ہوس کی نگاہوں میں ہے تنومندی
ابھی حکومتیں اخلاص پر نہیں قائم — نصیبِ طبقۂ عمال ہے برومندی

ابھی ہمارے شب و روز ہیں الم بردوش — ابھی غریب کی کٹیا میں ہے اندھیرا ہی
ابھی تو راج دلارے زمیں کے بے کل ہیں — ابھی عزیز ہے اُن کو یہ دکھ بسیرا ہی

ابھی ہمارے ارادے ہیں بر پائے شکست — نہ آسکے گی ہمیں راس ظلمتوں کی بہار
ابھی تو بھوک کی بستی میں اک ہلچل ہے — ابھی عوام کی دُنیا ہے درخورِ آزار

ابھی بہار اسیرِ خزاں رہے شاید
حیات اور جراحت نشاں رہے شاید

خلیل الرب۔ ایم۔ اے

فانی کے نظریۂ حیات کا اثر اُن کی شاعری پر

فانی اردو کے ایک باکمال مگر بدنصیب شاعر تھے انھیں فنِ شعر کا پختہ شعور تھا۔ ان کی شاعری میں وہ چمک دمک اور وہ خودگزاری و خود سپاری تو نہیں ملتی جو ان کے بعض ہم عصروں کے یہاں نظر آتی ہے، لیکن اس میں فنی خوبیوں کی کمی نہیں ہے ان کی طرزِ ادا میں پُرکاری اور اسالیب بیان میں تنوع ہے۔ ان کے یہاں گہرائی بھی ملتی ہے اور کسی قدر گیرائی بھی۔ گہرائی اس لئے کہ انھوں نے فکر اور جذبہ کا امتزاج پیدا کرنے کی کوشش کی اور گیرائی اس لئے کہ وہ خالص شاعری کے قائل تھے: اور اس خارجی آب و رنگ یا شعریت کو ضروری خیال کرتے تھے، جو شعر میں چستی، برجستگی اور رنگینی پیدا کرے، جس میں ایک تعمیری حسن ہو جو شعر سننے والے کو متاثر کرسکے۔ ان شاعرانہ محاسن کے باوجود فانی کی وہ قدر و منزلت نہ ہوئی اور انھیں وہ قبولیت عام میسر نہ آئی جس کا وہ اپنے کو مستحق سمجھتے رہے ہوں گے۔ فانی نے زندگی کو محض ایک دیوانہ کا خواب[1] سمجھا اور اس سے گریز کیا۔ زندگی نے ان سے انتقام لیا۔ مگر شاعری نے بھی ان سے دفا نہ کی، جس کا کہ فانی نے زندگی میں سہارا لیا تھا۔ فانی کی اس ناکامی کا راز کیا ہے؟ آپ اس سوال کو کسی عنوان سے اٹھائیے۔ جواب صرف ایک ہے۔

فانی کی اس ناکامیابی کا راز ان کے نظریۂ حیات میں مضمر ہے فن کار کا زاویۂ نگاہ اور نظریۂ حیات اس کے فن کا اساس ہوتا ہے اس نظریہ میں جتنی ہمہ گیری، جتنی وسعت اور بلندی ہوگی اسی قدر اس کی عظمت زیادہ ہوگی۔ اور اس میں عالمگیر قبولیت اور اثر آفرینی کے امکانات زیادہ ہوں گے۔ آرٹ کی دنیا میں وہی فنکار ایک بڑے فن کار کا درجہ پائے گا۔ جس نے زندگی کو پورے طور پر ہر ممکن رُخ سے دیکھنے کی کوشش کی ہو اور جس کی فنی تخلیق میں زندگی کی زیادہ سے زیادہ حقیقتوں کو زیادہ سے زیادہ لوگوں کے لئے بے نقاب کرنے کی کوشش کی گئی ہو۔ جس میں زندگی کا ہر سایہ، ہر حرکت اور ہر رنگ نظر آئے اور جس میں ایک دیکھنے والی اور محسوس کرنے والی مخلوق کے دل کی دھڑکن[1] ہمیشہ سنائی دے۔

آرٹ کے اس بنیادی اصول کو سامنے رکھ کر فانی کے کلام کا تجزیہ کرنے سے معلوم ہوگا کہ انھوں نے اپنے نظریۂ حیات کے اثر سے جن موضوعات کو اپنی شاعری کا محور بنایا وہ نہایت محدود تھے اور زندگی کا کوئی زندہ اور وسیع تخیل ہمارے سامنے پیش نہیں کرتے

فانی کے موضوعات شاعری کے سلسلے میں ہمارا ذہن سب سے پہلے ان کے محبوب ترین موضوع "غم" کی طرف منتقل ہوتا ہے۔ شاعری میں رنج و غم کا بیان ہمیشہ مقبول رہا ہے۔ انسان ان نغموں[2] میں حلاوت محسوس کرتا ہے جن میں گداز ہو، درد کی کسک ہو مگر غمگین نغمے کل زندگی نہیں ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ "دنیا میں انسان ہنستا کم اور روتا زیادہ ہے اگر کوئی قہقہوں اور آنسوؤں کو ایک ترازو میں تولے تو آنسوؤں کا پلڑا بھاری رہے گا۔" یہ بیان زندگی کا نہ صرف یک رُخا نظریہ پیش کرتا ہے بلکہ ناقص بھی ہے۔ یہ بیان حقیقت سے قریب تر ہو جائے گا۔ اگر ہم یہ سمجھ لیں

---

[1] اک معمہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا
زندگی کاہے کو ہے خواب ہے دیوانے کا

[1] یہ وہ دھڑکن ہے جسے فراق اپنے مخصوص انداز میں "سنسار گیت" کہا ہے
[2] انگریزی کے مشہور شاعر شیلے کا کہنا ہے کہ:۔
ہمارے شیریں ترین نغمے وہ ہیں جو ہمیں غم کی یاد دلاتے ہیں۔

عالمِ ایجاد اک مجموعۂ اضداد ہے
اختلافِ رنگ و بو سے انجمن آباد ہے (فانیؔ)

ہم اپنے رنج و خوشی کے پیمانے سے دنیا کے رنج اور خوشی کو ناپتے ہیں بقول[1] فطرتِ گلشن اس قید سے آزاد ہے۔ انسانی زندگی میں غم اور خوشی اس طرح پیوست ہیں کہ ان کو علیحدہ علیحدہ خانوں میں رکھ کر تولا نہیں جا سکتا۔ اس نوع کی تعلیم کا خیال ہمیشہ ان دماغوں میں پیدا ہوتا ہے جو خیالی دنیا میں زندگی بسر کرتے ہیں اور عمل کی دنیا سے کوئی واسطہ نہیں رکھتے۔ جن کے نزدیک تخیل سب کچھ ہے تجربہ کچھ نہیں۔ جو زندگی کے جذبات سے گریز کرتے ہیں۔

فانی کے فلسفۂ غم کے متعلق نقادوں نے طرح طرح کی نکتہ آفرینیاں کی ہیں۔ کوئی انہیں غم زدۂ ازلی قرار دیتا ہے، کسی نے اسے شخصی ناکامیوں کا نتیجہ بتایا ہے کوئی اسے موجودہ ماحول کی پیداوار بتاتا ہے جس میں "احساسِ[2] شکست اور غمِ بے حاصلی زیادہ ہے"۔

کسی کے خیال میں جب شاعر کی انفرادیت زمانے کے آئین و قوانین کو، رسم و رواج کو، ماحول اور سماج کو اپنے بچھے ہوئے تیروں کا نشانہ نہ بنا سکی تو وہ اپنی انفرادیت کے خلاف علمِ بغاوت بلند کرتا ہے اور اس کا گلا گھونٹ کر تسکین حاصل کرنا چاہتا ہے، اپنے ہی گریبان پر زور چلتا ہے اور خواہشِ مرگ قوی تر ہو جاتی ہے۔

اسی سلسلہ میں ایک غیر جانب دار نقاد کے دل میں کچھ وسوسے پیدا ہوتے ہیں۔ فانی کے حالاتِ زندگی سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی زندگی کا وہ دور جو اثرات قبول کرنے کے لحاظ سے سب سے زیادہ اہم ہوتا ہے۔ نہایت خوش حالی اور فارغ البالی کا تھا اور انہیں نکبت و افلاس کی وہ تلخیاں نہیں جھیلنا پڑیں جن کی بدولت زندگی میں تلخی یا جھلاہٹ پیدا ہو سکتی ہے۔ انھیں ایک معقول آبائی ورثہ ملا جسے انھوں نے دونوں ہاتھوں سے لٹایا۔ یار باش آدمی تھے، جہاں رہتے جانِ محفل بنے رہتے احباب کے جمگھٹے رہتے یا شعر و شاعری کی محفلیں اس طرح گرم رہتیں کہ اکثر کاروبار بھی بھول جاتے، لکھنؤ اور آگرہ کے زمانۂ قیام میں "رنگین صحبتوں" کا بھی شوق رہا، اس کے بعد متاہلانہ زندگی نہایت خوش گوار اور کامیاب گزری۔ مزاج میں حلم و مروت

[1] آل احمد سرور صاحب
[2] "کسی" کا اشارہ پروفیسر احتشام حسین صاحب کی طرف ہے۔

کے ساتھ ساتھ خود نمائی اور خود داری بہت تھی، طبیعت میں تکلف اس قدر تھا کہ ملنے کے کمرے میں بھی شیروانی پہنے بغیر نہ آتے تھے جس شخص کی زندگی میں یہ حالات[3] بھی ملتے ہوں اور جس کی سیرت میں یہ خصوصیات بھی پائی جاتی ہوں۔ اس کے منہ سے ہر لحظہ غم کا بیان اور خواہشِ مرگ کی تکرار میں قدرے حیرت ہوتی ہے یہ حیرت ہمیں میر کے سلسلہ میں نہیں ہوتی اس لئے کہ ان کے اشعار پڑھ کر ہم جس قسم کی شخصیت کا تصور کر سکتے ہیں وہی میر کی شخصیت تھی، لیکن فانی کے سلسلے میں اس بیان میں ایک کمزوری ہے۔ ہم ظاہری حالات سے بطون کا قیاس کر سکتے ہیں لیکن یہ ضروری نہیں کہ یہ قیاس ہمیشہ درست ہو اور پھر انسان کی شخصی محرومیوں اور ناکامیوں کا صحیح اندازہ کون لگا سکتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ فانی کو ایسی ذہنی کشمکش اور شخصی ناکامیوں سے دوچار ہونا پڑا ہو جن کا دوسروں کو صحیح علم نہ ہو اور جنہوں نے فانی کے مزاج میں ایک سوگوارانہ کیفیت پیدا کر دی ہو۔ لیکن یہاں ایک اور سوال پیدا ہوتا ہے۔ اگر فانی کا غم ان کی ذاتی ناکامیوں اور محرومیوں کا نتیجہ تھا تو اس کا اثر ان کی تمام عمر کے آخری دور میں ملنا چاہیے، جبکہ وہ اس بات کا اندازہ لگا سکتے تھے کہ ان کی زندگی میں آنسوؤں کا پلڑا بھاری رہا یا قہقہوں کا لیکن فانی کے یہاں غم کے بیان کا ارتقا ترتیب سے نہیں ملتا۔ غزلیاتِ فانی کی (جو کہ جدید اور قدیم کلام کے مکمل مجموعہ پر مشتمل ہے) پہلی غزل میں غم کا بیان جو ملتا ہے وہ تقریباً اسی ردیف کی تبدیلی کے ساتھ اکثر و بیشتر غزلوں میں آخری غزل تک پایا جاتا ہے۔ کلام کی اس ہمواری اور یک رنگی کو دیکھ کر کہ اگرچہ فنی اعتبار سے شبہ ہوتا ہے کہ شاید ان کے تصوف کی طرح غم کا مضمون بھی عقل کا آفریدہ ہے اور غالباً یہی وجہ ہے کہ میر کے اشعار پڑھ کر دل پر جس طرح چوکے لگاتے ہیں اور جس طرح ان کے لہجہ میں گداز اور درد کی کسک ملتی ہے وہ فانی کے یہاں مفقود ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان کی شاعری تمام تر بے اثر ہے ان کے یہاں ایسے اشعار ملتے ہیں جن میں گداز بھی ہے اور حقیقی شعریت اور اثر آفرینی بھی۔ لیکن ایسے اشعار کی تعداد کم ہے۔ ان کم تعداد اشعار کا نمونہ حسبِ ذیل ہے:

[3] یہ حالات ماہر القادری، میکش اکبر آبادی، حکیم مختار احمد بدایونی، تابش دہلوی اور محمد سبطین بدایونی وغیرہ کے مضامین میں ملتے ہیں۔

میں نے فانی[1] ڈوبتی دیکھی ہے نبض کائنات
جب مزاج یار کچھ برہم نظر آیا مجھے

عشق کی وہ لطافتیں، حسن کی وہ نزاکتیں
ہائے وہ زندگی جواب خواب و خیال ہو گئی

آج ہم پی سکے نہ وہ آنسو ∴ ان کے آگے جو بار بار آیا
اک فسانہ سن گئے، اک کہہ گئے ∴ میں جو رویا مسکرا کر رہ گئے

اللہ رے سکون قلب اس کا جس نے دل لاکھوں توڑ دیئے
جس زلف نے دنیا برہم کی وہ آپ کبھی برہم نہ ہوئی

فانی کے یہاں نہ تو سماج کا دکھ درد ملتا ہے اور نہ اس کی ہڈیوں کے چٹخنے کی آواز سنائی دیتی ہے۔ ان کا غم انفرادی ہے اور شاعری میں جبراً رٹ کے وہ قائل تھے اس میں سماج کے دکھ درد کے بیان کا زیادہ امکان بھی نہ تھا۔ "زندگی[2] کب موت بنتی ہے اور موت کب زندگی"۔ یہ آپ کو مزدور کی زندگی میں بھلے ہی مل جائے مگر فانی کی شاعری میں اس کی تلاش کی مثال ایسی ہے جیسے کہ غالب کی شاعری میں سیاسی بیداری کی۔ گنتی کے چند اشعار اور کشمیر پر تین رباعیوں کے علاوہ ہم کو کہیں بھی فانی کی شاعری میں "اس عہد کے ماحول کا عکس نہیں ملتا جس میں احساس شکست اور غم بے حاصلی زیادہ ہے، جس میں اچھی باتیں مٹتی ہیں اور اہل ہنر پریشان رہتے ہیں"۔ واقعہ یہ ہے کہ ایک ایسے شاعر سے جو شعر کو شعر کا مقصد سمجھتا ہو اور اسے غایتی بنانے پر کسی طرح تیار نہ ہو، ہم سماج کی شعوری عکاسی کا مطالبہ بھی نہیں کر سکتے۔ آرٹ اور شعر و ادب میں سماج کی شعوری عکاسی کے سلسلے میں ایک اہم نکتہ قابل غور ہے، دوستوں کی سرد مہری، فلک کی ستم رانی اور زمانہ کی قدر ناشناسی اور شاعری کے ایسے موضوع ہیں جن پر ہر اردو شاعر نے طبع آزمائی کی ہے۔ لیکن ان موضوعات پر جس نوع کے اشعار ملتے ہیں اس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ یہ سب روایتی اشعار ہیں۔ جنھیں محسوس کر کے نہیں کہا گیا اور پھر اساتذۂ قدیم کے یہاں تو ایسے اشعار کے لئے ایک جواز بھی ہے۔ لیکن دور حاضر میں اس قسم کے اشعار کی حیثیت محض روایتی ہے۔ میر و سودا کا زمانہ یقیناً پریشان حالی اور آشفتہ سامانی کا تھا۔ وہ زمانہ ضرور ایسا تھا کہ انفرادی سکون اور اجتماعی چین دونوں مفقود تھے۔ ایک پورا معاشرتی اور سیاسی نظام درہم برہم ہو رہا تھا، مگر نئے نظام کے جنم لینے کے آثار پیدا نہ ہوئے تھے۔ وہ دور احساس شکست اور غم بے حاصلی کا تھا۔ آج اگر کوئی شخص سودا کے ابلق روزگار اور موجودہ زمانہ میں فرق نہیں محسوس کرتا تو وہ نئی قدروں سے عدم آگہی کا ثبوت دیتا ہے۔ آج زمانہ کے تیور یہ ہیں کہ ممولے میں شاہین سے ٹکرانے کا عزم و حوصلہ پیدا ہے۔ اس دور کی شاعری اپنے عہد کی نہایت ناقص ترجمانی کرے گی اگر وہ محض یہ بیان کرے کہ مزدور کی زندگی میں زندگی موت کب بنتی ہے اور موت کب زندگی! اگر اس کی نگاہ صرف دوزخ میں[3] سموئی ہوئی جنت تک پہنچے اور یہ دیکھنے سے قاصر ہے کہ انسانی عزم و حوصلہ اور جد و جہد کس طرح اس دوزخ میں سموئی ہوئی جنت کو سراپا جنت بنانے کی فکر میں منہمک ہے۔ دور حاضر کا شاعر یا ادیب اگر اپنی فنی تخلیق میں عصریت کی صحیح روح پھونکنا چاہتا ہے تو اسے محض ذہنی، مادی اور سیاسی کش مکش اور خلفشار کے بیان پر اکتفا نہ کر کے ان زبردست قوتوں اور محرکات کا بھی جائزہ لینا چاہیئے جو سماج کی زیریں سطح میں پوری شدومد سے مصروف کار ہیں۔ جن سے اک نئی دنیا کی تعمیر ہو رہی ہے اور جن کی بدولت زندگی کی نئی معاشرتی قدریں اور نظریات پختہ اور مستحکم ہو رہے ہیں۔

فانی کے کلام میں غم کا موضوع کس راہ سے آیا یہ ایک دلچسپ سوال ہے لیکن اس سے زیادہ اہم سوال یہ ہے کہ فانی کے غم کی نوعیت کیا ہے۔ غم کے مواقع پر غمگین ہونا یا غم میں آنسو بہانا ایک فطری بات ہے۔ اسی طرح یہ بھی غیر فطری بات نہیں کہ انسان ضبط غم کا حوصلہ پیدا کر لے۔ بڑے سے بڑے صدمے کو دل پر سہہ لے اور زبان سے اف تک نہ کرے، لیکن غم جاوداں[4] کے نہ ملنے کے غم میں گھلنا اور غم میں نشاط کے تمام پہلو تلاش کرنا خلاف فطرت ذہنیت ہے جسے ہم ایک نفسیاتی بیماری سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ اسی منفیت کا اثر تھا کہ فانی خوشی میں بھی غم کے پہلو کرید کرید کر نکال لیتے تھے[5]

---

[1] تا [2] یہ جملے آل احمد سرور کے مضمون "اردو شاعری میں فانی کی قدر و قیمت" سے ماخوذ ہیں۔

[3] پھولوں کی نظر نواز رنگت دیکھی ∴ مخلوق کی دلگداز حالت دیکھی
قدرت کا کرشمہ نظر آیا کشمیر ∴ دوزخ میں سموئی ہوئی جنت دیکھی

[4] وہ بدگماں کہ مجھے تاب رنج زیست نہیں
مجھے یہ غم کہ غم جاوداں نہیں ملتا

۶۰۱

غم عین نشاط در از تخلیقِ نشاط ۰۰ غم حجتِ انبساط و تصدیقِ نشاط
غم کا ہے تبسم جسے کہتے ہیں جو د ۰۰ ہنسی کو ہے غم کے دم سے توفیقِ نشاط

یہ بیمار ذہنیت جتنی خطرناک ہے اتنی ہی ناپسندیدہ اور ناقابل قبول بھی۔ جس طرح زندہ رہنے کی خواہش ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے اسی طرح یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ لمحاتِ غم کو حاصلِ حیات تصور کرنا فطرتِ انسانی کے خلاف ہے۔ شاید اسی لئے انسان غم کے لمحات کو جلد سے جلد فراموش کرنا چاہتا ہے اور خوشی کے لمحات کو غم کی یاد میں غم گین بنانا گوارا نہیں کرتا۔ اس مسلمہ حقیقت کے خلاف جو مثالیں ملتی ہیں ان کی حقیقت مستثنیات کی ہے۔

غم کی طرح "یاس" کی بھی فانی کے یہاں بے حد فراوانی ہے۔ یاس کا جذبہ (اگر اسے جذبہ کہنا درست ہو) روحِ رواں کی طرح ان کے کلام میں جاری و ساری ہے۔ ان کو اپنی بدنصیبی و محرومی پر یقین کامل تھا امید و حوصلہ کی کوئی رمق ان کے کلام میں نہیں ملتی۔ جذبات کا فقدان یاس کی کیفیت پیدا کرتا ہے جو جذبۂ غم سے زیادہ مضرت رساں ہے۔ خوشی کی طرح غم کا بھی ایک اثباتی پہلو ہے۔ مگر یاس ایک منفی کیفیت ہے۔ یہ کیفیت اس وقت پیدا ہوتی ہے جب دل میں کوئی ولولہ، کوئی اُمنگ، کوئی خواہش اور کوئی اُمید باقی نہ رہ جائے۔ زندگی میں ایسے لمحات آتے ہیں جب انسان پر یہ کیفیت طاری ہوتی ہے لیکن یہ کیفیت زیادہ دیر تک قائم نہیں رہتی ورنہ زندگی اور موت میں کوئی فرق نہ رہ جائے۔ دنیا کی رنگا رنگی جذبات سے عبارت ہے۔ جذبات کے فقدان سے یاس کی جو کیفیت پیدا ہوتی ہے اس کا عادی[۵۱] ہو جانا شخصی اور اجتماعی زندگی کے لئے یکساں طور پر ہلاکت آفریں ہے۔

فانی میں یاس کی یہ شدت کچھ تو ان کی قنوطی طبیعت کا اثر ہے اور کچھ عجمی تصوف کا۔ عمل اور جد و جہد میں ناکامی کی صورت میں یاس اور نا اُمیدی کا احساس فطری ہے مگر ہر ناکامی ایک صاحبِ عمل اور بلند حوصلہ انسان کے حق میں مزید کوشش کے لئے ایک تازیانہ ہے۔ اقبال نے اسی لئے زندگی کو جہدِ مسلسل کہا ہے۔ اس جہد میں جو لوگ کھپ جاتے ہیں وہ دوسروں کے لئے راستہ ہموار کر جاتے ہیں۔ فانی کے یہاں عمل اور جد و جہد کی مثالیں نہیں ملتیں۔

ان کے کلام میں شدتِ یاس کی یہی توجیہہ ہو سکتی ہے کہ ان کو اپنی محرومی و نامرادی پر اس درجہ یقین راسخ تھا کہ ان میں کبھی حوصلۂ عمل پیدا ہی نہ ہوا اور یاس کی کیفیت دل و دماغ کے ساتھ ساتھ ان کی ساری شاعری پر مستولی ہو گئی۔ دوسرا اثر عجمی تصوف کا ہے۔ عجمی تصوف کا مسئلہ جبر[۵۲] فانی کو بے حد راس آیا۔ عجمی تصوف نے قومی زندگیاں تباہ کی ہیں انہیں سرد اور بے عمل بنایا ہے۔ زندگی سے فرار کی راہ دکھائی ہے۔ پھر اس تصوف کا فانی کے کلام کو بے ذوق[۵۳] اور افسردہ بنا دینا تو ایک معمولی سی بات تھی۔ جیسا کہ اوپر کسی جگہ ذکر آیا ہے۔ فانی کے یہاں ایسے اشعار ہیں جن کا گداز ہمارے دل میں کسک پیدا کرتا ہے۔ لیکن ان کی شاعری کی عام فضا اور اتنی سرد اور حوصلہ شکن ہے اس میں اس ہمت عالی کی وہ تلقین نہیں ملتی جو درد یا بھی قبول نہ کرے وہ عمل افروز اور حیات افزا جذبہ نہیں ملتا جس کا زمانہ مقتضی ہے اور جس کی گونج ہم اقبال کے یہاں پاتے ہیں۔

غم و یاس کی طرح موت بھی فانی کی شاعری کا ایک مستقل اور محبوب موضوع ہے۔ اردو کے کسی شاعر نے موت کو اپنی شاعری میں مستقل موضوع کی حیثیت نہیں دی لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ اردو شعراء نے اس موضوع پر کچھ نہیں لکھا۔ موت چونکہ ایک ٹھوس حقیقت ہے اس لئے ہر شاعر نے اس کے متعلق اشعار کہے ہیں لیکن غالب، چکبست، اصغر اور اقبال کو چھوڑ کر دیگر شعراء کے یہاں بالعموم مفکرانہ اندازِ فکر مفقود ہے۔ موت کا بیان ہمارے یہاں زیادہ تر دو طرح سے ملتا ہے۔ ایک تو شعراء ہجرِ یار میں روز مرتے تھے۔ دوسرے موت کے بیان سے دوسروں کو عبرت دلانا مقصود ہوتا تھا مگر فانی نے اس سلسلہ میں ایک انفرادی حیثیت حاصل کر لی ہے۔ انھوں نے اس موضوع پر بہت کچھ لکھا ہے لیکن چونکہ اظہارِ خیال متفرق اشعار میں کیا گیا ہے اس لئے ان کے یہاں وہ بلندیِ فکر اور وہ تسلسلِ خیال جو اسی موضوع پر انگریزی نظموں میں نظر آتا ہے۔ تاہم ان کے اشعار میں تفکر کا انداز ضرور ملتا ہے۔ فانی نے موت کو حسین بنانے کی کوشش کی تھی اسے نامرادوں کی مُراد اور علاجِ دردِ زیست کہا ہے۔ فانی کے حق میں ممکن ہے یہ سب کچھ ٹھیک ہو۔ ان کی غم نصیب اور تھکی ہاری زندگی کی مکس ہے

---

۵۱ CHRONIC ۵۲ "جبر و اختیار" اسلامی علم کلام کی اصطلاحات ہیں اگر اسلام کے نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو جبر بھی عین عدلِ خداوندی ہے۔ مگر فانی کی نظر اس مسئلہ کے تاریک پہلو پر پڑی اس لئے ان کے یہاں جبر کا مفہوم انسان کی مجبوریٔ محض ہے۔ صحیح اسلامی عقیدہ مابین جبر و اختیار ہے۔

۵۳ شاعر کی نوا مردہ و افسردہ و بے ذوق ۰ افکار ہیں سرمست نہ خوابیدہ نہ بیدار

صرف موت کی آغوش میں سکون کی متلاشی ہو مگر ہم اسے زندگی کا صحت مند نظریہ کبھی نہیں کہہ سکتے۔ حیات اپنی تمام محرومیوں اور مجبوریوں کے باوجود نہایت عزیز شے ہے اور موت ایک خوفناک حقیقت۔ ہم زیادہ سے زیادہ موت کی طرف سے بے اعتنائی برت سکتے ہیں۔ ہمارا یہ انداز ہو سکتا ہے کہ جب تک جیتے ہیں۔ جیتے رہیں جب وقت آجائے گا تو چل بسیں گے۔ مگر انسان کے پہلو میں جب تک ایک دھڑکتا ہوا دل ہے جو اسے سود و زیاں کا احساس دلاتا ہے۔ اور جس کی بدولت دنیائے آب و گل سے اس کی وابستگی ہے۔ وہ موت کو حسین نہیں سمجھ سکتا۔ اور اس کی تمنا میں مر نہیں سکتا۔ فانی کے دماغ پر موت کا خیال ایک COMPLEX کی طرح مسلط تھا۔ وہ زندگی کے ہر لحظہ کو موت سمجھتے تھے۔ اور ہر[1] گھڑی انھیں موت کا انتظار رہتا تھا؎

ہر نفس عمر گذشتہ کی ہے میت فانی
زندگی نام ہے مر مر کے جئے جانے کا

بجھتی ہی نہیں شمع چلے جاتی ہے
کٹتی ہی نہیں رات ڈھلے جاتی ہے
جاری کا ہے نفس کی آمد و شد فانی
سینے میں چھری ہے کہ چلے جاتی ہے

۷۰

اب سوال یہ ہے کہ کیا فانی واقعی موت کو اتنا ہی حسین اور عزیز سمجھتے تھے۔ جتنا کہ ان کے کلام سے ظاہر ہوتا ہے۔ علیگڑھ میگزین کے فانی نمبر میں ماہر القادری صاحب کا ایک مضمون ہے اس میں فانی کی شخصیت اور سیرت کے چند پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے ان کا بیان ہے: "بیماری کے زمانہ میں ایک دن میں اور نواب نثار یار جنگ بہادر مزاج (پنشنر کلکٹر) فانی کے یہاں گئے۔ مزاج پرسی کے بعد فانی سے نواب صاحب نے کہا۔ فانی تم مر نہیں سکتے، تمھاری انرجی (قوت) ضائع نہیں ہوئی۔ وہی فانی جو ہمیشہ مرگِ ناگہاں کی تمنا کرتا تھا ان لفظوں کو سن کر اس کا چہرہ خوشی[2] سے تمتما اٹھا۔ زندگی کتنی عزیز شے ہے!" اگر اس بیان میں صداقت ہے اور کوئی وجہ نہیں کہ اسے صحیح نہ سمجھا جائے تو اس سے پتہ چلتا ہے کہ فانی کی خواہش مرگ میں صداقت کا وہ درجہ تھا۔ جس کے بارے میں نقادوں نے صفحے کے صفحے رنگ ڈالے ہیں۔

فانی کی خواہش مرگ میں کتنی صداقت تھی وہ موت کو کتنا حسین سمجھتے تھے ان بحثوں سے قطع نظر یہ ایک حقیقت ہے کہ فانی نے جس انداز میں اس موضوع کو پیش کیا ہے وہ انتہائی غیر فطری ہے۔ موت کے مضمون کی کثرت نے ان کی شاعری کو اس درجہ سوگوارانہ رنگ دے دیا ہے کہ وہ کبھی مقبول اور پسندیدہ نہیں ہو سکتا۔ حیات و ممات کے متعدد ایسے مسائل ہیں جنھوں نے فلسفہ، سائنس اور مذہب کو یکساں طور پر اپنی طرف متوجہ کیا ہے۔ شعراء نے بھی ان مسائل کی طرف توجہ کی ہے مگر ان مسائل کی حیثیت کبھی نہ حل ہونے والے معمہ کی سی ہے۔ ان مسائل پر جن مختلف زاویوں سے بحثیں ہوئی ہیں۔ ان کی تفصیلات میں پڑنا نہ تو ہمارا موضوع ہے اور نہ اس مختصر مقالے میں اس کی گنجائش ہے۔ ہمارے مقصد کے لئے صرف اتنا ذہن نشین کر لینا کافی ہوگا کہ زندگی کی ارتقائی نوعیت چاہے ایک مسلمہ حقیقت ہو یا نہ ہو لیکن اس کے جدلیاتی تنوع پر خود ہمارا مشاہدہ شاہد ہے۔ ہم دیکھ رہے ہیں کہ خوشی اور رنج، یاس و امید، نور و ظلمت، صلح و جنگ، اور اسی طرح متضاد کے بے شمار جوڑے آپس میں ٹکرا ٹکرا کر زندگی کے دھارے کو آگے بہائے لئے جا رہے ہیں۔ یہ ڈرامہ نہ جانے کب سے جاری ہے اور نہ جانے کب تک جاری رہے گا۔ پھر یہ تذکرہ تو اس ڈرامہ کا ہے جو ہم اپنی دنیا میں دیکھ رہے ہیں۔ ہماری دنیا سے باہر کائنات کی بسیط اور لا انتہا فضاؤں میں کیا ڈرامے ہو رہے ہیں۔ ان کا اندازہ کون لگائے؟

زندگی کے اس ڈرامے میں ہم ایک لمحہ کے لئے یہ زندہ رہ آتے ہیں اس فرصت میسر کو کسی طرح برتا جائے۔ ہم اس ڈرامہ کے (جس میں طربیہ اور المیہ کا ناقابل تقسیم امتزاج ہے) خاموش تماشائی تو بن

---

[1] جوش نے اسی چیز پر سخت چوٹ کی ہے؎ دامن کو ہمیشہ نم کیا کرتا ہے۔ دریا تیری آنکھوں سے بہا کرتا ہے
یک لخت اجل کو جان دینا بہتر مرتا ہے باقساط یہ کیا کرتا ہے

[2] موت کی خواہش اور زندگی سے بیزاری کی جو شدت فانی کے یہاں نظر آتی ہے اس کے لحاظ سے تو فانی کو یہ سن کر اور بھی غمگین ہو جانا چاہئے تھا کہ وہ ابھی مر نہیں سکتے۔ نفسیات کے ماہر سگمنڈ فرائڈ نے ایک چھپی ہوئی بات کہی ہے۔ اس کا خیال ہے کہ اکثر ہم جن چیز سے اپنی سخت نفرت اور بیزاری کا اظہار کرتے ہیں جس کے لئے ہمارے دل میں ایک دبی ہوئی خواہش ہوتی ہے۔

نہیں سکتے۔ اس لئے کہ یہ تو آئینِ فطرت کے خلاف ہے ہم حصہ لینے پر مجبور رہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ اس لمحۂ فرصت کو محض اس اتفاق یا واقعہ پر آنسو بہانے میں صرف کر دیں کہ پردہ پر کیوں لائے گئے یا ہنسی خوشی اس میں شریک ہو کر اسے اپنی بساط بھر "خوب[1] سے خوب تر" بنانے کی کوشش کریں۔

یہ خیال کہ انسان مجبورِ محض ہے اور قدرت کی اندھی مشین اسے پسینے پر تلی ہوئی ہے عجمی تصوف کا ثمرہ ہے۔ جس کی بنیاد حقائقِ زندگی سے گریز پر قائم ہے یہ خیال شکست خوردہ ذہنیت سے پیدا ہوتا ہے اور دوسروں کو شکستہ پر بنا دیتا ہے۔ اسی عجمی لے سے فانی کی شاعری کا خمیر تیار ہوا ہے یہ لَے زندگی کو صرف بے رنگ ہی نہیں بناتی بلکہ انسان سے زندگی کا سارا حوصلہ چھین لیتی ہے ان اشعار کو پڑھئے اور دیکھئے کہ ان کے اثرات کتنے حوصلہ شکن ہیں

نامرادی حد سے گذری حالِ فانی کچھ نہ پوچھ
ہر نفس ہے اک جنازہ آہ بے تاثیر کا

ہے موت ہی اب زندگیٔ دل کا سہارا
جینے کی جو ایسی ہی تمنا ہے تو مر جا

یہ زندگی کی ہے روداد مختصر فانی
وجودِ درد مسلّم علاج نا معلوم

زندگی جبر ہے اور جبر کے آثار نہیں
ہائے اس قید کو زنجیر بھی درکار نہیں

میں کہاں اور کہاں عمرِ دو روزہ فانی
زندگی اب بہ تقاضائے گراں جانی ہے

پھر اگر یہ خیال یا نظریہ تصوف کے دیگر مسائل کی طرح محض "برائے شعر گفتن خوب است" تک محدود رہے تو ہرج نہیں۔ لیکن شاعر کی اس ذہنیت یا نظریہ کا قومی اور اجتماعی زندگی میں سرایت کر جانا انتہائی ہلاکت آفریں ہے۔ اقبال اس عجمی لے کی زہر آگیں سے آگاہ تھے وہ اس رمز سے واقف تھے کہ صوفی، فقیہ اور شاعر نے مل کر کتنے سفینے ڈبوئے[2] ہیں۔ اقبال کا یہ کارنامہ ہے کہ انھوں نے قومی زندگی کو اس زہر آگینی سے بچانے کی کوشش کی اور اس میں ایک نئی روح ایک نئی تڑپ اور زندگی کا ایک نیا حوصلہ پیدا کیا۔

فانی کا ایک شعر ہے

اب نئے سر سے چھیڑ پردۂ ساز۔ میں ہی تھا اک شکست کی آواز

معلوم ہوتا ہے کہ فانی نے یہ محسوس کر لیا تھا کہ ان کا ساز نہ تو وقت کا ساز ہے اور نہ وہ ساز ہے جسے کاروانِ حیات کے لئے بانگِ درا کہہ سکیں، زمانہ کو جس ساز کی ضرورت تھی وہ ساز اقبال کے پاس تھا۔ اب اقبال کے بعد والے دور میں اس ساز کی لے کیا ہو گی اس پر بحث کرنا ہمارے موضوع سے باہر ہے۔

غم و یاس، خواہشِ مرگ اور انسان کی مجبوریٔ محض فانی کی شاعری، اور شاعری کیا ان کی زندگی کے سنگِ بنیاد ہیں۔ اس بنیاد پر جس زندگی کی تعمیر ہو گی ظاہر ہے کہ وہ مدعائے حیات سے محروم ہو گی۔ مدعائے حیات سے محرومی اور پھر ہمہ وقت اس کا احساس ہمارے تخیلِ حیات کو کتنا تنگ، کتنا محدود اور کتنا بے رنگ و بے آہنگ بنا دیتا ہے یہ کاروانِ حیات کس منزل کی طرف رواں دواں ہے اور کہاں جا کر دم لے گا؟ ان سوالوں کا جواب دینا تو آسان کام نہیں، ہاں اتنا ضرور محسوس ہوتا ہے کہ انسان اپنی تمام کوتاہیوں، تمام کمزوریوں اور تمام محرومیوں کے باوجود آگے بڑھ رہا ہے وہ دیکھتا ہے کہ یہ زندگی خواب نہیں بلکہ ایک عینی حقیقت ہے۔ لیکن فانی کے نظریہ حیات کا نقطۂ عروج دوسری انتہا پر جا کر رکا۔ جہاں زندگی محض خواب ہے اور "بے مدعا و بے مقصد"[3] اگر فانی کا یہ خیال صحیح ہے تو پھر اقبال کا یہ شعر کیا معنی رکھتا ہے۔

عروجِ آدمِ خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں
کہ یہ ٹوٹا ہوا تارا مہِ کامل نہ بن جائے

زندگی کو بے مدعا اور بے مقصد قرار دینے والی شاعری اور اس عمل افروز اور حیات افزا شاعری میں جو آدمِ خاکی میں مہِ کامل سے بھی روشن ترین بن جانے کا حوصلہ پیدا کرے انتخاب کرنا زمانہ کے لئے دشوار نہ ہو گا۔ قرائن بتا رہے ہیں کہ زمانے کا تناظر جیسے جیسے دور ہوتا جائے گا۔ موخر الذکر شاعری کی مقبولیت اور اہمیت جس رفتار سے بڑھے گی۔ اول الذکر شاعری اسی رفتار

---

[1] ہر نگارے کہ مرا پیش نظر می آید
خوش نگارےست ولے خوش‌تر ازاں می باید

[2] خبر نہیں کہ سفینے ڈبو چکی کتنے
فقیہ و صوفی و شاعر کی ناخوش اندیشی

[3] مرگِ حیات ہے محرومِ مدعائے حیات
وہ رہ گزر ہوں جسے کوئی نقشِ پا نہ ملا

سے پس پشت پڑتی جائے گی۔

کہا جاتا ہے کہ یہ نظریۂ حیات صرف فانی کے ساتھ مخصوص نہیں ہے دنیا میں ایسے بہت سے روحانی پیشوا اور مبلغ اسفر گزرے ہیں۔ جنھوں نے دنیا کو غم کدہ تصور کیا ہے اور اس تنگ و تاریک غم کدہ سے فرار کی راہ دکھائی ہے۔ لیکن ان کے خیالات کا اثر ہمیشہ محدود اور وقتی رہا ہے۔ دنیا کی برگزیدہ ترین ہستیاں وہی شمار کی جاتی ہیں اور انہیں کے پیغامات کو عالمگیر اثر اور قبولیت حاصل ہوتی ہے۔ جنھوں نے انسان کو روحانی اور مادی خوشیوں میں منانہ کیا ہے اور ان کی ترقی کے لئے نئی راہیں سجھائی ہیں۔ زندگی کو بے مقصد اور بے مدعا سمجھ کر اور دنیا کو غم کدہ تصور کر کے اس کے ہنگاموں اور محشر سامانیوں سے گریز انسانی فطرت کے منافی ہے۔ جس دن انسان انسان نہ رہ جائے گا اور اس کا دھڑکتا ہوا دل خاموش ہو جائے گا اس دن شاید دنیا محض غم کدہ بن جائے اور اس کی زندگی بے مقصد و بے مدعا۔

تازہ ایڈیشن — زیر طبع

رنگ محل

ساغر دورِ جدید کا پیامی ہے، اس کی بہار آفریں شاعری اِک صبحِ نو کی تمہید ہے۔ اس کے نغمے میں ماضی کی غنائیت نہیں ہے بلکہ اُس رنگ محل کا انعکاس ہے۔ جس کے سندر کلس اور بُرج اور گنبد مستقبل کی زریں دھوپ میں چمکتے نظر آتے ہیں۔

جب ساغر شباب کی تازہ اور سرخ شراب زندگی کے جام میں انڈیلتا ہے۔ تو خود شاعری "ساقی بجلوہ دشمنِ وایمان وآگہی" بن کر محفلِ نشاط میں رقص کرنے لگتی ہے۔ اس رقصِ جادو داں کی دلدوز یوں کو اس کی بلاخیزیوں کو رنگ محل کے ایوانِ خاص میں دیکھئے۔

جب ساغر بہارِ جوانی اور ابدیت کے گیت گاتا ہے تو اس کی شاعری کی ترنم فضا بے تہوروں کے بہاریہ نغمے کی یاد تازہ کر دیتی ہے، وہ جب حسن، سندرتا اور سکنواریوں کی موہنی کو اپنے نغموں میں سمو دیتا ہے تو کیوپڈ کے ترکش سے اندھے تیر بے اختیار مچل کر باہر نکلتے نظر آتے ہیں۔ وہ جب اشتراکیت کے درخشندہ رنگ محل کی جلوہ آفرینیوں کو اپنے مخصوص رجائی انداز میں دکھاتا ہے تو ہمارے ذہن میں سانہ کے مستقبل کی ایک ایسی واضح روشن اور خوبصورت تصویر کھینچ جاتی ہے کہ ساری کائنات پر اک عجب کیف اک عجب سرمستی چھانے لگتی ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ([illegible]) مدہوش ہو کر اس طوفانِ لے کی لہروں پر ناچ رہا ہے۔

رنگ محل میں ساغر نے زندگی کے پیکرِ نو کی تخلیق کی ہے، آپ کے لاشعور کے سپنوں کو الہامی کیفیت بخشی ہے ساغر نے اِک ساغرِ نو کی تشکیل کی ہے جس کی نازک گلکاریوں کے حسین نقش رنگ محل میں دیکھئے۔

کرشن چندر

ملنے کا پتہ:-

ادبی مرکز ہند پبلشرز کرائسٹ چرچ روڈ، بائیکلہ بمبئی ۸

مہندر ناتھ

انسان کی لاش!

شرنارتھیوں کے لئے کیمپ کھل گیا تھا۔ ایک چھوٹے سے مینٹ میں اسکول کھولا گیا تھا۔ اس اسکول میں صرف ہندوؤں کی لڑکیوں کو پڑھایا جاتا تھا۔ لڑکیوں کی عمریں زیادہ نہ تھیں۔ یہ وہ لڑکیاں تھیں، جو پاکستان سے بچ کر آئی تھیں، ان میں کئی کی مائیں مر گئی تھیں کسی کا باپ قتل کر دیا گیا تھا۔ کئی لڑکیوں کی مائیں ابھی تک پاکستان میں تھیں۔ اور کسی کا سارا خاندان تباہ و برباد ہو گیا تھا اور کئی لڑکیوں کو یہ بھی علم نہ تھا۔ کہ اُن کے والدین زندہ ہیں یا قتل کر دیئے گئے ہیں۔ لڑکیاں ہندوؤں کی تھیں۔ لیکن اسکول کی اُستانی مسلمان تھی۔ جب دہلی میں ہندو مسلم فساد شروع ہوا اور ہندوؤں اور سکھوں نے مسلمانوں پر وہ ظلم ڈھائے جن کی نظیر، ہندوستان کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ لوگ کہتے ہیں کہ ہندو اور سکھوں نے مسلمانوں سے بدلا لیا تھا لیکن کن مسلمانوں، کن مسلمان عورتوں سے، کن مسلمان بچوں سے؟ شاید، ان لوگوں نے یہ نہ سوچا، کہ وہ جن مسلمانوں کو تہ تیغ کر رہے ہیں، اُن کا مغربی پنجاب پر ظلم ڈھانے میں کوئی ہاتھ نہ تھا، ہر بربریت کے اس لمحے میں کسی نے کچھ نہ سوچا کہ یہ عورت جس کو وہ ننگا کر کے بازاروں سے لے جا رہے ہیں، یہی ان کی دادی اماں تھی، اسی سے دہلی کی گلیوں میں وہ کئی بار مل چکے تھے، اسی دادی اماں نے ان کے سروں پر شفقت کا ہاتھ پھیرا تھا۔ درازی عمر کی دعا کی تھی۔ ان کی پیشانی چومی تھی، ان کے بیاہ میں ڈھولک بجائی تھی، گیت گائے تھے، لیکن انہی سنگلاخی ہاتھوں نے دادی اماں کا گلا گھونٹ دیا۔ اُس کی کھوپڑی کو نیزہ پر چڑھا کر اپنی اندھی حیوانیت کا ثبوت دیا۔ لوگ کہتے ہیں کہ جب ہندو فسادیوں کے ہاتھ میں ایک دایہ لگی تو انھوں نے اُس سے پوچھا۔

"تمھارا نام؟" "ہندو ہو یا مسلمان؟"

"دایہ!" "دایہ!"

بولتی نہیں۔

میں ہندوؤں کے گھر میں گئی ہوں اور مسلمانوں کے گھروں میں بھی، ہندو بچوں کو اس گودی میں پالا ہے اُن کو ان چھاتیوں سے دودھ پلایا ہے، ان ہاتھوں سے انھیں نہلایا ہے، کھلایا ہے اور اسی طرح مسلمانوں کے بچوں کو پالا ہے، پوسا ہے۔ میں سب کی ماں ہوں!

ایک سکھ نے آگے بڑھ کے اُس کا بازو اس زور سے مروڑا کہ دایہ کے منہ سے اللہ کا کلمہ نکل گیا۔ واہگورو کا نام لے کر سکھ کی کرپان اس دایہ کے پیٹ میں تھی۔ اور دایہ لڑکھڑاتی ہوئی زمین پہ گر پڑی اور دوبارہ زمین سے نہ اٹھ سکی۔

آج ہندوؤں اور مسلمانوں کی مائیں مر چکی تھیں، دونوں کے بچے خون کی ہولی کھیل رہے تھے، ـــ اسکول کی مسلمان اُستانی یہ سوچ رہی تھی کہ گھنٹی بجی، اور لڑکیاں کمرے میں داخل ہوئیں۔ آج سکول میں لڑکیوں کی تعداد زیادہ تھی، سامنے بورڈ پر ہندوستان کا نقشہ لٹک رہا تھا۔ اُستانی نے رجسٹر سے لڑکیوں کا نام پکارا، سب کی حاضری لی اور پھر نقشے کی طرف دیکھنے لگی، اور کہنے لگی، یہ ہے ہندوستان' یہ ہے ہمارا دیس، یہ ہیں اس کے پہاڑ، یہ ہے ماؤنٹ ایورسٹ' دنیا کی سب سے بڑی چوٹی، یہ ہے کشمیر، ہندوستان کی جنت، اور یہ جنگل، دریا، سمندر، ـــ یہ ہے پنجاب۔ راوی کے اُس پار مسلمان بستے ہیں، اور ادھر ہندو، ـــ میں تمھیں ہر روز یہ سبق پڑھاتی ہوں، اس نقشے کی طرف دیکھو، اس کی حدیں بھول نہ جانا (لڑکیوں کی طرف دیکھ کر) "بملا کہاں دیکھ رہی ہو"، اُستانی نے کرخت لہجے میں یہ الفاظ کہے۔

بملا نے استانی کی طرف دیکھا اور کچھ گھبرا سی گئی، وہ کچھ سوچ رہی تھی، اُس کا دھیان نقشے کی طرف نہ تھا۔ بملا کی عمر ہوگی، آٹھ نو برس، اُس کی ننھی ننھی سی آنکھیں حیران اور ششدر

ہوکر رہ گئی تھی۔ وہ کبھی استانی کی طرف دیکھتی، کبھی بورڈ کی طرف
اور کبھی بیٹھی ہوئی لڑکیوں کی طرف، جو اس کی طرف بار بار دیکھ رہی
تھیں، جب کبھی استانی بملا سے کوئی سوال پوچھتی۔ بملا اوٹ
پٹانگ جواب دیتی۔ استانی جواب سن کر ہمیشہ اسے جھڑک دیتی، آج جب
بملا نے پھر اس کے سوالوں کا ٹھیک جواب نہ دیا۔ تو استانی آپے سے
باہر ہوگئی۔ اور چیخ کر بولی۔

ہندوستان کی تقسیم کس نے کی؟ جواب ندارد۔

ہندوستان میں کس قوم کے باشندے بستے ہیں، بملا خاموش تھی

پاکستان میں کون سی قوم بستی ہے، بملا خاموش تھی،

جالندھر کہاں ہے، بملا! استانی نے کڑک کر پوچھا۔

وہاں ہے، بملا نے نقشے کی طرف دیکھ کر کہا۔

وہاں کہاں۔ ہندوستان میں یا پاکستان میں،

پاکستان میں، بملا نے حیران کن نگاہوں سے دیکھ کر۔

یہ جواب سن کر سب لڑکیاں ہنس پڑیں،

استانی کو اور غصہ آیا اس نے بملا کی طرف قہر آلود نگاہوں
سے دیکھا اور کہا "تم کیا کرتی ہو، تمہارا دھیان کس طرف ہے، کھڑی
ہو جاؤ، بنچ پر، دیکھا انگلی کو منہ میں نہ ڈال۔ سیدھی کھڑی رہ،
تمہیں یہ بھی نہیں معلوم کہ جالندھر کہاں ہے، اتنی سی بات، کیا کرتی
ہو دن رات، پڑھتی کیوں نہیں ہو، ناخنوں کو دانتوں سے کاٹتی
رہتی ہو، اگر تم اس طرح پڑھتی رہیں، تو کبھی امتحان پاس نہ کر سکو گی

بملا چپ چاپ کھڑی رہی، اور پریشان کن نگاہوں سے
استانی کی طرف دیکھتی رہی۔

"تو یہ ہے ہندوستان کا نقشہ۔ ادھر پاکستان ہے، یہاں
مسلمان رہتے ہیں، مسلمان جناحی ٹوپی پہنتے ہیں، وہ ہندو اور
سکھوں سے نفرت کرتے ہیں، پہلے یہ دونوں بھائی بھائی تھے، بڑے
آرام اور پیار سے رہتے تھے، اگر گھر میں لڑائی جھگڑا ہوتا تھا۔ تو
خود ہی نپٹ لیتے تھے، اب کے جھگڑا ہوا۔ تو انھوں نے انگریز کو بلایا۔
اور انگریز نے دونوں کو اپنا حصہ دے دیا۔ —— ادھر ہندوستان
ہے، یہاں زیادہ تر ہندو رہتے ہیں، ہندو دھوتی پہنتا ہے، ماتھے
پر تلک لگاتا ہے۔ اور اکثر بڑبڑایا کرتا ہے!، ہندو مسلمان
سے نفرت کرتا ہے۔ تو یہ ہے ہمارا ملک، اور ہم ہیں اس کے باشندے
اگر پاکستان جانا ہو تو پاسپورٹ لے کر جاؤ اور ہندوستان
آنا ہو، تو بھی پاسپورٹ لے کر آؤ۔ ہمارا ملک بہت بڑا ملک ہے

یہاں کارخانے ہیں۔ ریلیں ہیں۔ ہوائی جہاز ہیں، فیکٹریاں ہیں
چمکتی موٹریں ہیں اور پیداوار کافی ہے۔ لیکن لوگ بھوکے مرتے
ہیں۔ کپڑا [illegible] ہے، لیکن لوگوں کو ننگا رہنے کا شوق ہے
اس ملک میں سونے کی کانیں ہیں، چاندی کی کانیں ہیں، کوئلے کی
کانیں ہیں، ہندوستان میں تاج محل ہے، قطب صاحب کی مینار
ہے، لال قلعہ ہے اور اب اس کی آبادی چالیس کروڑ سے پینتیس کروڑ
رہ گئی ہے، سمجھ گئیں بملا، کیا کہا میں نے،

شانتی۔ دنیا میں سچے آدمی کی عزت ہوتی ہے یا جھوٹے کی؟

سچے آدمی کی استانی جی، شانتی نے فوراً جواب دیا،

"شاباش" استانی نے خوش ہو کر کہا

"لڑکیو! بتاؤ کہ ہندو بڑا ہے یا مسلمان؟"

"ہندو" سب لڑکیوں نے یک زبان ہو کر کہا۔

"شاباش" استانی نے چیخ کر کہا

"تم بتاؤ۔ بملا۔ تم کیوں خاموش ہو۔ ہندو بڑا ہے یا مسلمان"

بملا خاموش رہی۔

"بولتی کیوں نہیں، جواب کیوں نہیں دیتی۔ نقشے کی طرف
گھور گھور کر کیوں دیکھ رہی ہو۔ انگلیوں سے نہ کھیلو، گردن اونچی
کرو۔ پیچھے نہ دیکھ، سیدھی کھڑی رہ،

آج استانی کو ضرورت سے زیادہ غصہ آرہا تھا وہ غصہ
میں بھری ہوئی بملا کے قریب گئی۔

بتاؤ۔ ہندو بڑا ہے یا مسلمان۔ استانی نے چیخ کر کہا۔

بملا خاموش تھی۔ ——

نکل جا یہاں سے، اسی وقت چلی جا، نہیں تو مار مار کر جان
نکال لوں گی۔

بملا جانے لگی،

"ٹھیر جا!"

باقی سب لڑکیوں کو استانی نے چھٹی دیدی۔ لڑکیاں
چلی گئیں اور کمرے میں بملا اور استانی رہ گئیں۔

بملا رو رہی تھی۔

اسے روتا دیکھ کر استانی کو رحم آگیا۔

"کیوں رو رہی ہو میری بچی!"

"استانی جی، بملا نے آنکھوں کو پونچھتے ہوئے کہا۔ میں
—— میں —— رات بھر نہ سو سکی۔

"کیوں میری بچی، آواز میں شفقت اور پیار تھا۔

"رات بھر اماں جاگتی رہی، اور روتی رہی؟

"وہ کیوں؟

ماتاجی نے مجھے بتایا کہ میرے پتاجی کو کل گاڑی میں قتل کر دیا گیا۔ وہ چھپ کر ایک مسلمان کے گھر میں ٹھیرے ہوئے تھے کہ باقی لوگوں کو علم ہو گیا۔ اُنھوں نے اس مسلمان کو مار ڈالا اور میرے پتاجی کو، یہ کہہ کر ببلا رونے لگی، میں رات بھر جاگتی رہی، مجھے بالکل نیند نہ آئی، میرے پتاجی معلوم نہیں، اب کہاں ہوں گے ماتاجی کہتی ہیں کہ وہ واپس نہیں آئیں گے۔

یہ سن کر اُستانی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ غصہ کافور ہو گیا اُس نے اپنی ساڑھی کے پلو سے ببلا کے آنسو پونچھے، اور کہنے لگی روؤ مت میری بچی، میں بھی رات بھر نہ سو سکی، میں بہت پریشان تھی۔ ایک پل بھر نہ سو سکی۔

"وہ کیوں، ببلا نے روتے ہوئے کہا

"میرا بھائی جالندھر میں تھا، ہندوؤں کے قبضہ میں آ گیا اور بچارا مارا گیا۔ ایک ہی بھائی تھا میرا۔ خاندان کی آخری نشانی تھی وہ بھی بچارا قتل کر دیا گیا۔

"کس نے مارا، اُستانی جی؟

"ہندو نے"

دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا، سامنے نقشہ لٹک رہا تھا۔ ہندوستان کا نقشہ!

ایک طرف ہندو۔ دوسری طرف مسلمان، ایک دل کے دو ٹکڑے ہو گئے تھے۔ ایک ہی وطن، جسکی تقسیم میں خون کی ندیاں بہہ نکلیں، نہ ہندو بڑا تھا۔ نہ مسلمان، دونوں رہزن تھے۔ دونوں حیوان تھے۔

دونوں نے گھور کر نقشے کی طرف دیکھا۔

ایک طرف ہندو کھڑا تھا، دوسری طرف مسلمان کھڑا تھا۔ اُن دونوں کے درمیان انسان کی لاش تھی۔ دونوں کمرے سے باہر نکل گئیں۔

ترقی پسند تحریکوں کا ترجمان

پندرہ روزہ

نیا پرچم

جو فروری ۴۹ء سے ہر مہینے کی پہلی اور پندرہ تاریخ کو شائع ہوگا

ترتیب دینے والے
وشوامتر عادل
نظر جعفری
محمد حمید راسد

پہلے نمبر کے چند فنکار :- کرشن چندر۔ ڈاکٹر ملک راج آنند۔ سردار جعفری۔ کیفی اعظمی۔ ساغر نظامی۔ مہندر ناتھ ظ انصاری۔ مجروح سلطان پوری۔ ممتاز حسین۔ حبیب تنویر۔ رمیش سنگھوی۔ چیخوف۔

"نیا پرچم" حسن چمبرز، پارسی بازار اسٹریٹ، فورٹ، بمبئے۔

ماہنامہ ایشیا فروری ۱۹۴۹ء

لرزشیں

میراجی

سکوں کا سایہ ابھی اس طرف سے گذرا تھا،
یہ کون؟ آج بھی تم دوریوں کو طے کرکے
اُسی طرح میرے خوابوں کو گدگداتے ہو؟
زمانہ سر پہ کھڑا قہقہے لگاتا ہے
ہجوم — سرد، خموش،
کبھی تو دُور سے تکتا ہے، مُسکراتا ہے،
کبھی قریب جو آئے تو جیسے ایک خیال
اندھیری رات کی تنہائی میں ڈراتا ہے
وہ آگے بڑھتے ہی جلدی سے لوٹ جاتا ہے،
ہجوم کب ہے؟ جھجھکتا ہُوا خیال... جھجھکتا ہوا خیال تو ہے!
تمھیں بھی میرے ستانے میں لطف آتا ہے —
تمھیں بھی شوق یہ رازِ دروں بتاتا ہے —
کہ اک تڑپ کو دوامِ حیات کہتے ہیں؟
ہجوم جہل کی بکھری ہوئی نمائش ہے
ہجوم قتل کی جُراَت نہ ہو تو دور سے ہی
ہزاروں پارۂ سنگ
اُٹھا کے پھینکتا ہے، اور بھول جاتا ہے
کہ ایسے اپنی جہالت کے نقشِ محکم کو
سوارِ وقت کا وہ ہمعناں بناتا ہے،
شکارِ خونِ رگِ دل کے پھوٹ پڑنے پر
سکوں کے سایۂ خاکی میں ڈوب جاتا ہے
سکوں کا سایہ نہ تھا، تم نہ تھے، وہ میں بھی نہ تھا،
یہ چند لمحے تھے جو وقت سے جُدا ہوکر
ہمارے دورِ مکاں میں گداز لائے تھے
اور اب ہمیشہ کو اک کاہشِ بقا ہوکر
اُدھر ہی لوٹ گئے جس طرف سے آئے تھے

اسرار الحق مجاز بی، اے

خوبصورت حقائق

کیا ہوا میں نے اگر ہاتھ بڑھانا چاہا — آپ نے خود بھی تو دامن نہ بچانا چاہا
یوں تو افسانۂ الفت تھا ازل سے رنگیں — ہم نے کچھ اور بھی رنگین بنانا چاہا

سمجھ بوجھ کر پرسشِ حال کیجے — کہیں کوئی عرضِ تمنا نہ کر دے

پہلے وہ جور پر پشیماں تھے — اور اب لطف پر پشیماں ہیں

٧٧

وہ نقاب آپ سے اٹھ جائے تو کچھ دور نہیں — ورنہ میری نگہ شوق بھی مجبور نہیں
خاطرِ اہلِ نظر حسن کو منظور نہیں — اس میں کچھ تیری خطا دیدۂ مہجور نہیں
جرأتِ عرض پہ وہ کچھ نہیں کہتے لیکن — ہر ادا سے یہ ٹپکتا ہے کہ منظور نہیں
دل دھڑک اٹھتا ہے خود اپنی ہی ہر آہٹ پر — اب قدم منزلِ جاناں سے بہت دور نہیں
ہائے وہ وقت کہ جب بے پیئے مدہوشی تھی — ہائے یہ وقت کہ اب پی کے بھی مخمور نہیں

دیکھ سکتا ہوں جو آنکھوں سے وہ کافی ہے مجاز
اہلِ عرفاں کی نوازش مجھے منظور نہیں

کلیم اللہ

مارشل پلان

مارشل پلان گزشتہ سال بھر سے ساری دنیا کا موضوع بنا ہوا ہے اور کوئی دن نہیں جاتا کہ اخباروں اور رسالوں میں اس کی موافقت اور مخالفت میں مضامین نہیں چھپتے۔ خود ہندستان میں لوگوں کو اس سے کافی دلچسپی ہوگئی ہے اس لئے کہ اکثر لیڈر اس کا چرچا کر رہے ہیں کہ اسی منصوبہ کے تحت ہندستان بھی امداد حاصل کر لے۔ امریکہ کے سابق سفیر مسٹر گریڈی کا جب یہاں تھے تو انھوں نے بھی اس کا بہت پروپیگنڈہ کیا اور سفارش کی کہ ہندستان بھی ایک نہرو پلان بنائے اور امریکہ ہر طرح کی مدد کے لئے تیار ہے۔

اس منصوبہ کو شروع ہوئے ایک سال ہوتا ہے اس لئے اسے سمجھنے کے لئے اصولی بحث کی ضرورت نہیں رہی ہے بلکہ ایک سال کے تجربات سے ہم کافی صحیح نتائج پر پہنچ سکتے ہیں۔

۷۸

اس منصوبہ کا اعلان سب سے پہلے امریکہ کے وزیر خارجہ مسٹر مارشل نے ہارورڈ میں کیا تھا۔ جس میں انھوں نے کہا تھا کہ یورپ جنگ کی وجہ سے بڑا تباہ ہوگیا ہے۔ وہاں معاشی بحران بڑھ رہا ہے امریکہ کی یہ خواہش ہے کہ وہ یورپ کی مدد کرے تاکہ وہاں کی زراعت اور صنعتیں اپنے پاؤں پر کھڑی ہو سکیں اور یہ ملک بحران سے نکل سکیں۔ اسی کے ساتھ انھوں نے یہ بھی بتایا کہ خود یورپ کے ملکوں کو اس کا تصفیہ کرنا چاہیئے کہ انھیں کس قسم کی امداد کی اور کتنی ضرورت ہے اور اس کے لئے بہتر ہوگا کہ ایک کانفرنس کی جائے اور سب ملک مل کر ایک مشترکہ پروگرام پیش کریں۔

اسی کے مطابق جون اور جولائی ۱۹۴۷ء میں سوئیٹ یونین برطانیہ اور فرانس کے وزیر اعظموں کی ایک کانفرنس پیرس میں ہوئی سوئیٹ یونین کے نمائندوں نے امریکہ کی امداد کا خیر مقدم کیا اور کہا یہ بات بڑی قابل قدر ہے لیکن ساتھ ہی انھوں نے اس پر بھی زور دیا کہ یہ امداد یورپ کی نئی تعمیر کے لئے اسی وقت مفید ہوگی جبکہ یہ تمام ممالک اپنی تعمیر کی بنیاد اس امداد پر نہ رکھیں بلکہ اپنی بنیاد اپنے وسائل پر رکھیں اور اس امداد کو وسائل میں اضافہ کرنے میں استعمال کریں اسی کے ساتھ یہ امداد دیتے وقت ان ممالک کے اندرونی معاملات میں کسی قسم کی مداخلت نہ کی جائے اور انھیں اس کی پوری آزادی دی جائے کہ وہ اپنی معاشی زندگی کو جس طرح چاہیں تشکیل دیں۔

برطانیہ اور فرانس کے نمائندوں نے اس نقطۂ نظر کی سخت مخالفت کی اور کہا کہ بیرونی امداد ہی فیصلہ کن چیز ہے اور اسی پر یورپ کی تعمیر کا دارومدار ہے۔ برطانیہ اور فرانس امریکہ کی طرف سے یورپ میں اس منصوبہ کو عملی شکل دیں گے۔ اس کے لئے ایک کمیٹی بنائی جائے گی جو امداد حاصل کرنے والے ملکوں کے اندرونی معاملات میں مداخلت کرے گی۔

سوئیٹ یونین اس تجویز کو ماننے کے لئے تیار نہیں ہوا اس لئے کہ معنی صاف طور پر یہ تھے کہ امریکہ کی سرپرستی میں ایک ایسا ادارہ قائم ہو جاتا جو یورپ کے ہر ملک کی معاشی زندگی میں مداخلت کرتا اور اس کا تصفیہ کرتا کہ کون سا ملک کس قسم کی صنعت قائم کرے گا اور اس طرح امریکہ سارے یورپ کو اپنا معاشی غلام بنا لیتا

اس سلسلہ میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ روس اور مشرقی یورپ کے دوسرے ملکوں نے اسے کیوں رد کر دیا اور مغربی یورپ کے ملکوں نے قرضہ کی تھوڑی سی رقم کی خاطر اپنی آزادی کا سودا کیوں کر لیا۔

اس کا جواب بہت آسان ہے گزشتہ جنگ میں تقریباً سارا یورپ تباہ ہوگیا۔ جنگ کے بعد پیداوار گر گئی۔ لوگوں کا افلاس بڑھ گیا۔ بے روزگاری عام ہوگئی اور معاشی بحران بڑھنے لگا۔ مشرقی یورپ کے ملکوں نے اس بحران پر قابو پانے کے لئے اپنے یہاں جاگیرداری مٹا دی۔ بڑی صنعتوں کو قومی ملکیت بنا دیا اور سارے ملک کے لئے ایک معاشی منصوبہ بنایا۔ جس کی وجہ سے یہ ممالک

بڑی تیزی کے ساتھ بحران سے نکل رہے ہیں اور ترقی کر رہے ہیں۔ اس کے مقابلہ میں مغربی یورپ میں ابھی تک اسی طرح سرمایہ داری نظام جاری ہے۔ پیداوار منصوبہ کے تحت نہیں ہوتی بلکہ اس کا انحصار سرمایہ داروں کے منافع پر ہے اور اس لئے بحران گھٹنے کے بجائے اور بڑھتا جاتا ہے۔ مالدار سرمایہ دار دولت لوٹ کر اور امیر ہوتے جاتے ہیں اور غریب اور غریب ہو رہے ہیں اس کی وجہ سے افراط زر اور چور بازاری کے ساتھ ساتھ بے روزگاری اور فاقہ کشی بڑھتی جاتی ہے۔

مغربی یورپ کے سامنے دو ہی راستے ہیں یا تو موجودہ سرمایہ داری نظام ختم کر کے صنعتوں کو قومی ملکیت بنا کر منصوبہ بندی کریں یا یہ بحران بڑھتا چلا جائے۔ وہاں کے حکمران سرمایہ دار سرمایہ داری بھی باقی رکھنا چاہتے ہیں اور ساتھ ہی بحران کو بھی روکنا چاہتے ہیں چنانچہ جب امریکہ نے امداد کا اشارہ کیا تو وہ اس کے پاؤں پر گر پڑے اور اپنی آزادی بیچنے پر تیار ہو گئے۔

اب دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ امریکہ جو خود سرمایہ دار ملک ہے اس قدر رحم دل کیسے بن گیا۔ اس کی رحمدلی کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ وہ نہیں چاہتا کہ یورپ سے سرمایہ داری ختم ہو جائے اور بڑی وجہ یہ ہے کہ گزشتہ جنگ میں امریکہ کا نقصان نہیں ہوا بلکہ پیداوار تقریباً ڈھائی گنا بڑھ گئی۔ اور اس کے لئے اسے منڈیوں کی تلاش ہے اور اسلئے وہ یورپ اور دنیا کے دوسرے ملکوں کو معاشی طور پر غلام بنانا چاہتا ہے تاکہ انھیں اپنی منڈی بنا سکے۔

۱۹۳۶ - ۳۹ء کی امریکہ کی اوسط برآمد سالانہ ۳۶ کروڑ ڈالر یا کل پیداوار کی ۳ء۲ فی صدی تھی۔ ۱۹۴۶ء میں یہ ۱۰۰ کروڑ ڈالر یا کل پیداوار کی ۹ء۴ فی صدی اور ۱۹۴۷ء میں ۱۵۱ کروڑ ڈالر یا کل پیداوار کی ۶ء۷ فی صدی ہو گئی۔ اس کے مقابلہ میں درآمد گر گئی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک سال میں امریکہ اپنا مال بہت زیادہ قیمت پر بیچتا رہا اور وہاں کا مال سستے داموں خریدتا رہا یورپ کی معاشی زندگی پر اپنا کنٹرول بڑھاتا رہا اسے سخاوت اور رحم کا نام دیتا رہا۔

مارشل کی تجویز کو عملی شکل دینے کے لئے جب مغربی یورپ کے ۱۶ ملکوں کی کانفرنس ہوئی تو پہلے ہی دن سے اس کی اصلی تصویر سامنے آنے لگی پہلے تو کانفرنس ہی میں آپس میں خوب جوتا چلا۔ بڑی بحث کے بعد سب نے ملکر ایک مشترکہ فہرست پیش کی اور چار سال کے لئے ۲۹ کروڑ ڈالر کا مطالبہ کیا۔

امریکہ اتنی بڑی رقم اور چیزوں کی فہرست دیکھ کر ناراض ہو گیا۔ نائب وزیر خارجہ کلیٹن اڑ کر پیرس گئے اور اسے کم کرا کے ۲۰۶ کروڑ کروا دیا۔ جب یہ تجویز امریکی حکومت کے سامنے آئی تو اسے اور گھٹا کر ۱۷۰ کروڑ ڈالر کر دیا۔ اور اس کے بعد یہ تجویز کانگرس میں پیش ہوئی تو اور کمی کر دی گئی اور صرف ایک سال کے لئے عارضی امداد منظور کی گئی۔

اس کو عملی شکل دینے کے لئے امریکہ نے یورپ میں اپنے سابق وزیر تجارت ہیری مین کو مقرر کیا اور امریکہ میں ایک کمیٹی بنا دی جس کے صدر امریکہ کی موٹروں کی کمپنی کے ایک سابق صدر ہاف مین مقرر کئے گئے۔

یہ کمیٹی اتنی طاقتور ہے کہ برطانوی پارلیمنٹ میں ایک ممبر نے اس کے متعلق کہا تھا کہ اسے یہ اختیار حاصل ہے سوائے مرد کو عورت بنانے کے۔

ہاف مین ان ۱۶ ملکوں میں سے ہر ایک کی معاشی زندگی میں مداخلت کر سکتا ہے۔ امداد روک سکتا ہے۔ اور انھیں اس پر مجبور کر سکتا ہے کہ صرف انہیں ملکوں سے تجارت کریں جن کی وہ اجازت دے۔

جون ۱۹۴۸ء میں ہاف مین نے ان ملکوں میں سے ہر ایک کے سامنے معاہدہ کا ایک مسودہ پیش کیا اور کہا کہ وہ تین جولائی تک اس پر دستخط کر دیں۔ اس میں کہا گیا تھا کہ ہر ملک کو جو امداد ملے گی اس کا تصفیہ ہر سال کانگرس کرے گی۔ امریکہ ان میں سے ہر ملک کو اپنے سکہ کی قیمت ادا کرنے پر مجبور کر سکے گا اور وہ ملک کوئی جوابی کارروائی نہیں کر سکے گا۔ یہ ممالک درآمد و برآمد کا محصول گھٹا دیں گے۔ یعنی اس طرح امریکہ نے نہ صرف یورپ کے ان ملکوں کی معاشی زندگی پر اپنا کنٹرول قائم کر دیا بلکہ انھیں اس پر بھی مجبور کر دیا کہ وہ اپنی نوآبادیات میں تجارت کے لئے بھی راستے کھول دیں۔

جب یہ منصوبہ منظر عام پر آیا تھا تو اسی وقت سوویٹ یونین نے کہا تھا کہ یہ یورپ کو غلام بنانے کا منصوبہ ہے لیکن اس وقت یورپ اور امریکہ کے سارے پریس نے سوویٹ یونین پر حملے کئے لیکن اب ایک سال بعد وہاں کے سرمایہ داروں میں بھی یہ دم خم نہیں رہا کہ اس کی شان میں قصیدہ پڑھ سکیں۔

گزشتہ جنوری ہی میں برطانیہ کی قدامت پسند جماعت کے

اخبار ایوننگ نیوز نے لکھا تھا۔

" امریکہ ہمیں دیتا تو خشک انڈوں کا سفوف ہے لیکن اس کے معاوضہ میں ہماری آزادی چھین رہا ہے "

۲۰ رجون کو ایک اور رجعت پرست اخبار سنڈے ٹائمز نے بالکل اسی طرح کی شکایت کی تھی۔

اسی تاریخ رائٹر نے فرانس سے خبر دی تھی کہ وہاں کے ذمہ دار حلقے یہ محسوس کرتے ہیں " امریکی بڑے سرمایہ دار فرانس کی معاشی زندگی کا گلا گھونٹ دیں گے۔

آخر کیا بات ہے کہ امریکہ کے قصیدہ خواں آج اس کے خلاف منہ کھولنے کی جرأت کر رہے ہیں ؟ آج اصل حقیقت آنکھوں کے سامنے آگئی ہے اور امریکہ بھی سود خور یہودی کی طرح پیش آرہا ہے وہ بات چبا کر نہیں کرتا بلکہ صاف صاف منہ پر کہتا ہے۔ مارشل پلان کو چلانے والے سب سے بڑے افسر ہاف مین نے ۱۳ مئی ۴۸ء کو سینٹ میں تقریر کرتے ہوئے کہا۔

" ہم بے فکر ہیں اور ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس وقت تک پیسہ نہیں دیں گے جب تک ہماری شرطیں " پوری نہ ہوں۔

اور یہ شرطیں کیا ہیں ؟ برطانیہ کے سخت احتجاج کے باوجود فرانس کے سکہ فرانک کی قیمت کو کم کردیا گیا۔ گرین لینڈ میں امریکہ کو فوجی اڈے دیئے گئے۔ جرمنی کے ٹکڑے کردیئے گئے۔ برطانیہ کا اسٹرلنگ بلاک ختم کردیا۔ ترکی کو بے شمار امریکی مشیر رکھنے پڑتے ہیں اور ان کے اخراجات اٹھانے پڑتے ہیں۔

ہاف مین نے ڈیلی میل کے نمائندوں کو مئی میں بیان دیتے ہوئے یہاں تک کہا ہے کہ اب امریکہ برطانیہ کی ایک تہائی درآمد کو بھی اپنے کنٹرول میں لے لے گا۔ برطانیہ کو اس پر مجبور کیا گیا ہے کہ وہ اپنی صنعتوں کو قومی ملکیت بنانے کا پروگرام ملتوی کر دے۔

جب مارشل پلان آیا تو یورپ کے ان سولہ ملکوں نے یہ سوچا تھا کہ اس امداد سے وہ مشین خریدیں گے اور اپنے یہاں کی صنعتوں کو ترقی دے کر اس بحران سے نکلنے کا راستہ پیدا کرلیں گے اور اسی لئے ...... انھوں نے امریکہ کے سامنے جو فہرست پیش کی تھی اس میں سب سے زیادہ جگہ مشینوں کو دی گئی تھی۔ لیکن ان کی ساری امیدیں خاک میں مل گئیں۔

مارشل امداد حاصل کرنے والے ملکوں میں ایک بلجیم بھی ہے یہ صنعتی طور پر بہت ترقی یافتہ ہے۔ جنگ کے زمانہ میں یہ زیادہ تباہ بھی نہیں ہوا لیکن یہ آج معاشی بحران کا سخت شکار ہے۔ غذائی صنعت کے لئے کچا مال نہیں ملتا ہے۔ فولاد کے کارخانے بند پڑے ہیں۔ یہاں کے فولاد کے کارخانوں کے وائس پریسیڈنٹ نے حال ہی میں اخباروں سے کہا تھا " چند دن سے ہم ایک عجیب و غریب صورت حال کا شکار ہیں مارشل امداد سے ہماری حالت بہتر بننے کی بجائے بگڑ رہی ہے "

یہی حال ناروے سویڈن اور ڈنمارک کا ہے۔ ایک سال ہوتا ہے کہ مارشل پلان کے پرستاروں نے یقین دلایا تھا کہ اس امداد سے وہاں کی معاشی معیار میں ۱۰ فیصدی اضافہ ہو جائے گا۔ چنانچہ ان تین ملکوں نے پانچ سال کے لئے ۵ کروڑ ڈالر کا مطالبہ کیا اور کہا کہ اس قیمت کا انھیں کوئلہ، لوہا اور فولاد دیا جائے تاکہ وہ اپنے کارخانے چلا سکیں۔

انھیں نہ صرف اتنی امداد نہیں ملی بلکہ لوہا اور کوئلہ بھی نہیں ملا اور امریکہ نے انہیں مجبور کیا کہ وہ لوہے اور فولاد کی بنی ہوئی چیزیں خریدیں یعنی اپنے کارخانے بند کردیں۔

سویڈن سے کہا گیا ہے کہ وہ اپنی لوہے کی پیداوار گھٹا دے۔ لیکن یہ کچی دھات اپنی صنعتوں کے لئے استعمال نہ کرے بلکہ جرمنی بھیج دے اور اس کے معاوضہ میں ۱ کروڑ کے سگریٹ دیئے جائیں گے اور ڈنمارک کو پندرہ مہینوں میں امریکہ کی بنی ہوئی اتنی موٹر گاڑیاں دی جائیں گی جو وہ شائد پانچ سال میں بھی نہیں بیچ سکے گا۔

ناروے جہازی اور الیومینیم کی صنعتیں قائم کرنا چاہتا تھا یہ تجویزیں رد کردی گئیں اب اسے امریکہ کے پرانے جہاز خریدنے ہوں گے اور امریکہ کا بنا ہوا الیومینیم کا سامان وہاں بھیجا جائے گا۔

اسی طرح انگلستان نے زرعی مشینری، لوہے فولاد اور فولاد کے سامان کا مطالبہ کیا تھا۔ لیکن اسے ملا کیا؟ شکر، کافی مچھلی، اخباری کاغذ اور چمڑا۔ جن میں سے اس نے کوئی بھی چیز نہیں مانگی تھی۔ لیکن چونکہ یہ امریکہ کے پاس فاضل ہیں اس لئے کسی کے سر تو منڈھنا ہی ہے۔

برطانیہ نے ۱۹۴۷ء میں جتنی موٹریں امریکہ سے منگوائی تھیں اس سال اس سے ۳۴۳ فی صدی زیادہ منگوائی ہوں گی اس لئے کہ ہاف مین صاحب جو مارشل پلان کے کرتا دھرتا ہیں موٹروں کے بہت بڑے کارخانہ دار ہیں۔

یعنی یہ امداد اس لئے نہیں ہے کہ یہ ممالک اپنی ضرورت

کی چیزیں حاصل کر سکیں بلکہ اس لئے ہے کہ امریکہ کا مال بک سکے ان ملکوں کو اس طرح جو مال ملتا ہے اس کے بکنے کے بعد اس کی قیمت ایک الگ فنڈ میں جمع کر دی جاتی ہے اور اس پر امریکہ کا کنٹرول ہوتا ہے۔ چنانچہ اٹلی میں امریکی مشن کے اخراجات اسی فنڈ سے ادا کئے جاتے ہیں۔ یہی حال دوسرے ملکوں کا ہے۔

جرمنی اور اٹلی کو جو امداد دی گئی ہے اس سے بے حساب فائدہ اٹھایا گیا۔ اربوں روپیہ امریکی بینکوں میں منتقل کر دیا گیا ہے۔ کئی بڑے بڑے ماہر کاریگر امریکہ منتقل کر دیئے گئے ہیں۔ جرمن صنعتوں کے پیٹنٹ پر قبضہ کر لیا گیا۔

مغربی جرمنی کی تجارت پر پوری طرح امریکہ کا قبضہ ہو چکا ہے امریکہ یہاں کا بنا ہوا مال مثلاً موٹریں، کیمیائی اشیاء اور فولاد سستا نہایت سستے داموں خریدتا ہے اور اس سے باہر سونا بناتا ہے۔

ٹرکی جیسے ملک کو جو جرمنوں کے ساتھ پوری طرح ملا بھی نہیں تھا، نہیں بخشا گیا اسے جو قرضہ دیا گیا تو اس کے ہاتھ چار آبدوز کشتیاں بیچ دی گئیں۔ جن کی قیمت پورے قرضے سے ۲ کروڑ ڈالر زیادہ ہے۔ ٹرکی میں امریکہ کے جو مشیر اور مشن ہیں ان پر ترکی حکومت کے ۳ کروڑ ۲۷ لاکھ ڈالر سالانہ خرچ ہوتے ہیں۔

حال ہی میں اس سلسلہ میں فرانس اور امریکہ میں جو معاہدہ ہوا ہے اس کی رو سے فرانس کسی ملک سے ایسے تجارتی تعلقات پیدا نہیں کر سکتا۔ جس سے امریکہ کے تجارتی مفاد پر برا اثر پڑے۔ فرانس جو چیز بھی درآمد کرے گا اس کا استعمال امریکہ کے مشورہ سے کرے گا۔ فرانس کو باکسائٹ کروسیم اور دوسری کچی دھاتیں امریکہ کو مہیا کرنی پڑیں گی (یعنی فرانس کو اپنے کارخانے بند کرنے پڑیں گے۔ فرانس میں امریکی تاجروں اور صنعت کاروں کو وہی حقوق حاصل رہیں گے جو فرانسیسیوں کو حاصل ہیں۔ فرانس اپنی معاشی زندگی کے متعلق تفصیلی معلومات امریکہ کو دیتا رہے گا۔ معاشی تعلقات کے سلسلہ میں فرانس جس قسم کی تو قیت امریکہ کو دے گا اسی طرح کی مغربی جرمنی، جاپان اور کوریا کو بھی دے گا۔ یعنی فرانس امریکہ کا محکوم بن جائے گا۔ صنعتیں ختم ہو جائیں گی۔ اور ایک زرعی ملک بن کر رہ جائے گا۔

امریکہ مارشل پلان کے ذریعہ نہ صرف یورپ کو غلام اور زرعی ممالک بنانے کی کوشش کر رہا ہے بلکہ اب ان کی نوآبادیات سے بھی انہیں نکال رہا ہے۔ چنانچہ اس نے امداد دینے کے بعد نہیں اس پر مجبور کر دیا ہے کہ وہ نوآبادیات کے دروازے امریکہ کے لئے کھول دیں۔ اس کی سب سے بڑی زد برطانیہ پر پڑ رہی ہے اس لئے کہ اس کی آمدنی کا سب سے بڑا ذریعہ ملیں تھیں۔

مثلاً ہندوستان ہی کو لیجئے۔ سنہ ۱۹۴۲ء میں امریکی درآمد سنہ ۱۹۳۹ء کے مقابلہ میں ۹ گنا بڑھ چکی تھی۔

اس کے علاوہ انڈونیشیا، انڈوچائنا اور بلجیم کانگو میں امریکی سرمایہ تیزی کے ساتھ داخل ہو رہا ہے۔ ان نوآبادیات پر اپنا اثر قائم کر کے امریکہ چاہتا ہے کہ ساری دنیا کے کچے مال اور منڈیوں کو اپنے قبضہ میں کر لے۔ تمام دنیا کے صنعتی ملکوں کی صنعتیں ختم کر کے انہیں زرعی ملک بنا دے۔ تاکہ یہ سب کچا مال امریکہ بھیجیں اور امریکہ اپنا صنعتی مال وہاں بھیجے۔ جس طرح انگلستان ایک زمانہ میں ہندوستان میں کیا کرتا تھا۔

اس سلسلہ کی یہ بڑی دلچسپ چیز ہے کہ مغرب کے سامراجی مثلاً برطانیہ، ہالینڈ اور فرانس وغیرہ مشرق کے محکوم ملکوں (برما، ملایا، انڈونیشیا وغیرہ) کی ابھرتی ہوئی عوامی تحریکوں کو کچلنے کے لئے کروڑوں روپیہ صرف کر رہے ہیں اور اس کا سارا فائدہ امریکہ اٹھا رہا ہے وہ صرف کچھ مشورے دیدیتا ہے کچھ ہتھیار، مال اور روپیہ دے دیتا ہے۔ اس سے یہ چیز ظاہر ہوتی ہے کہ امریکہ ساری دنیا کے خلاف ایک زبردست معاشی لڑائی چھیڑے ہوئے ہے اور پوری دنیا کو غلام بنانے کے منصوبوں کو آگے بڑھا رہا ہے۔

اس سلسلہ میں اس نے سب سے پہلا قدم یہی اٹھایا کہ مارشل پلان کے ذریعہ یورپ کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا اور مغربی یورپ کو اس پر مجبور کر دیا کہ وہ مشرقی یورپ سے کوئی تجارتی تعلق امریکہ کی مرضی کے بغیر نہ رکھے۔

اس سے خود مغربی یورپ کو زبردست معاشی دھکا لگا۔ اس جنگ سے پہلے مشرقی یورپ مغربی یورپ کی زبردست منڈی تھی۔ مغربی یورپ کا صنعتی مال مشرقی یورپ جاتا اور وہاں کا غلہ اور کھانے پینے کی ضروریات مشرقی یورپ سے پوری ہوتیں۔ اور یہ سلسلہ منقطع ہو جانے سے مغربی یورپ اپنی غذائی ضرورتوں کے لئے امریکہ کا محتاج ہو گیا اور امریکہ اسے استعمال کر کے اپنا معاشی غلام بنائے جا رہا ہے۔

یعنی مارشل پلان سے مغربی یورپ خوش حال ہونے

کے بجائے تباہ حال ہو رہا ہے۔ اس امداد سے بڑے مالدار طبقہ اور حکمران طبقہ کی جیبیں تو چور بازاری سے بھر جاتی ہیں۔ لیکن عوام میں بے روزگاری اور افلاس بڑھ رہا ہے۔

ان سب چیزوں کے باوجود امریکہ کے سرمایہ دار یہ سمجھتے ہیں کہ وہ اس سے سوویٹ یونین اور جمہوری محاذ کو کمزور نہیں کر سکے اور نہ مغربی یورپ اور خاص طور سے فرانس اور اٹلی میں اور ایشیا میں جمہوری تحریک کو کچلنے میں کامیاب ہو سکے۔ بلکہ یہ دن بدن بڑھتی ہی جاتی ہیں وہ جانتے ہیں کہ جب تک انھیں کچلا نہ جائے تب تک ساری دنیا پر تسلط نہیں قائم ہو سکتا اور جب تک تسلط قائم نہ ہو اور ساری دنیا امریکہ کی منڈی نہ بن جائے۔ تب تک اس بحران کو ٹالا نہیں جا سکتا۔ اس لیئے وہ اپنی کوشش بڑھا رہا ہے۔

امریکہ سمجھنے لگا ہے کہ صرف معاشی اور سیاسی لڑائی سے جمہوری طاقتوں کو زیر نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے لئے فوجی لڑائی ضروری ہے۔

اور آج امریکہ پوری تیزی کے ساتھ اس طرف قدم بڑھا رہا ہے۔ امریکہ کی سرپرستی میں مغربی یورپ کا متحدہ فوجی محاذ قائم کیا جا رہا ہے۔ کانفرنس ہو رہی ہیں اور جنگی منصوبے بنائے جا رہے ہیں۔ مغربی یورپ کی حکومتوں کے فوجی بجٹ تیزی کے ساتھ بڑھائے جا رہے ہیں۔ فوجوں کی تعداد بڑھ رہی ہے۔ ساری دنیا میں جنگ کا بخار پیدا کیا جا رہا ہے۔

امریکہ نے فوجی اڈے آرکٹک، اٹلی، یونان، ترکی جاپان، آسٹریا، مغربی جرمنی، ایران، مصر، شمالی افریقہ اور سعودی عرب میں قائم کر دیئے ہیں اور انہیں مضبوط بنایا جا رہا ہے۔

مغرب میں جرمنی اور مشرق میں جاپان میں فوجی صنعتوں کو ترقی دی جا رہی ہے۔ پرانے فاشسٹوں کو پھر سے منظم کیا جا رہا ہے۔ تمام ملکوں میں زبردستی رجعت پرست حکومتیں قائم کی جا رہی ہیں (مثلاً اٹلی، یونان کوریا وغیرہ میں یہی ہو چکا ہے)۔ ایشیاء کی عوامی تحریکوں کو کچلنے میں پوری مدد دی جا رہی ہے۔

لیکن ان سب چیزوں کے باوجود عوامی قوتیں ہر جگہ اس کی مزاحمت کر رہی ہیں۔ خود امریکہ میں ہنری ویلیس اور ان کے ساتھی اس کی سخت مزاحمت کر رہے ہیں۔ مغربی یورپ میں مزدور تحریکیں برابر بڑھ رہی ہیں اور مقابلہ کر رہی ہیں سوویٹ یونین اور مشرقی یورپ کی جمہوریتیں تیزی کے ساتھ معاشی اور سیاسی ترقی کر رہی ہیں اور مضبوط ہو رہی ہیں۔ چین میں رجعت پرست چیانگ کائی شک کی حکومت آخری سانس لے رہی ہے اور برما، ملایا، انڈوچائنا اور دوسرے محکوم ملکوں میں زبردست عوامی تحریکیں اٹھ رہی ہیں۔

امریکہ آج بالکل اسی راہ پر چل رہا ہے جو راہ ہٹلر نے اختیار کی تھی لیکن آج عوامی طاقتیں بہت زیادہ مضبوط ہیں اور امریکہ کا بھی وہی حشر ہوگا۔ جو ہٹلر کا ہوا تھا۔

نہیں کہ تیری محبّت کا اعتبار نہیں
مگر یہ دل کہ مجھے جس پہ اختیار نہیں

گذر رہے ہیں کچھ اس طرح رات دن میرے
کہ جیسے مجھ کو کسی شے کا انتظار نہیں

یہ کیسے مان لوں گلشن میں اب نہیں صیّاد
کہ جس بہار کو سوچا تھا وہ بہار نہیں

نیا زمانہ جنم لے رہا ہے خوف نہ کھا
یہ صبحِ نو کا اُجالا ہے کچھ غبار نہیں

عالؔی جعفری

غلام ربانی تاباں

دیوالی

وقارِ روح کے تاروں کو کیوں چھوا تم نے
تمہاری نظم "دیوالی" بہت ہی اچھی ہے
مگر — یہ رات کی گردن میں دیپ مالائیں
سیاہیوں میں اُجالے کے بد نما دھبّے
غریب حبشی کو جیسے زکام ہو جائے
یہ ٹمٹماتے دیئے —
یہ ٹمٹماتے دیئے صبح کا بدل تو نہیں!؟

میں سوچتا ہوں کہ اس رات چین و برما میں
کسی محاذ پہ کتنے دیئے جلے ہوں گے
جوان خون کی ہر بوند اک کرن بنکر
ایک ایسی صبح کی تشکیل کر رہی ہوگی
ہزار صدیوں کی تاریک سرد راتوں میں
بنی رہی ہے جو انساں کے خواب کا معبود
وہ صبح دور نہیں
اندھیری رات کے سینہ سے نور کا چشمہ
اُبلنے والا ہے

یہ ٹمٹماتے دیئے — لکشمی کے چرنوں میں
جنہوں نے حسنِ عقیدت کے پھول ڈالے ہیں
وہ جن کو لکشمی دیوی سے قربِ خاص نہیں
گھروں میں اپنے بھی دیپک جلائے بیٹھے ہیں
شکستہ جھونپڑیوں کو سجائے بیٹھے ہیں
کہ اس طرف بھی عنایت کی اک نظر ہو جائے
مگر وہ بھولتے ہیں
شکستہ جھونپڑیوں - ٹوٹے پھوٹے کھنڈروں میں
کبھی بھی لکشمی دیوی نہ مسکرائے گی
کبھی بہار نہ اُن کے چمن میں آئے گی
اگر وہ خود ہی نظامِ چمن نہ بدلیں گے

سیاہیوں کے نمائندے — رات کے بیٹے
ہمارے فکر و تخیل کو باندھنے کے لئے
توہمات کی زنجیریں ڈھال لیتے ہیں
کبھی دیوالی کبھی شب برات آتی ہے

راجیندر پرکاش

شادی کا باجا

روپا اچھوت رام دین کی بیٹی تھی۔ صرف یہی اس میں خرابی تھی۔ ورنہ تو وہ بھی اپنے ماں باپ کی اکلوتی بیٹی تھی۔ بڑی منتوں کے بعد انھوں نے اس چاند کے ٹکڑے کو پایا تھا۔ اپنے ٹوٹے پھوٹے مکان میں سب سے اچھے گدڑوں میں لپیٹ کر پالا تھا۔ اپنے پہننے کے سب کپڑے اس کی چارپائی پر بچھا دیئے تھے۔ جس سے اس نازک بدن کو اس کے بان نہ چبھیں۔ رام دین نے اسی لئے زمیندار کے یہاں نوکری بھی کر لی تھی کھیتی کے ساتھ ساتھ........ جس سے اس کی روپا کو زمیندار کے گھر کی جھوٹی گیہوں کی روٹی کھانے کو مل سکتی تھیں ....

..... زمیندار کے گھر کے پھینکے ہوئے بچوں کے ٹوٹے جوتے بھی رام دین اٹھا لاتا اور بڑی خوشی کے ساتھ اپنی روپا کو پہناتا۔ روپا بہت خوش ہوتی۔ اور ساتھ ساتھ رام دین بھی۔

روپا اس گھر کی شہزادی تھی۔ جس کی ایک مانگ پر دو آدمیوں کی زندگیاں نثار تھیں۔ جس کے ایک آنسو کی قیمت کو ادا کرنے کے لئے رام دین اور جیسا کے خون کی بوندیں قربان ہونے کے لئے موجود تھیں۔ اتنا سکھ شاید ہی کسی شہزادی کو ملا ہو........ اور ..... اس کی ہنسی کے ساتھ ساتھ اس ٹوٹے ہوئے گھر کی ایک ایک اینٹ....... ایک ایک ذرہ ہنس پڑتا تھا..........

وہ ...... قسمت۔ انسانوں کی بستی سے باہر پھینکے ہوئے ماں باپ اس لمحہ کم سے کم اپنے کو اصلی معنی میں راجہ رانی سمجھ بیٹھے تھے۔ دھوپ کے جلائے ہوئے چہرے دمک اٹھے تھے ..... اور دکھوں سے تپایا ہوا دل نیا جیون پا جاتا تھا......... یہ تھا اس روپا کا سنہرا بچپن........؟

بچپن کا روپ اب روپا میں نکھرنے لگا تھا۔ آنکھوں کو لال ڈورے گھیرنے لگے۔ چاند کا بکھرا بکھرا سا عکس اسے لبھانے لگا۔ بھونروں کی گنگن گنگن گنگ صدا پھولوں کے چاروں طرف اسے اپنی طرف کھینچنے لگی۔ کالی کالی گھٹاؤں اور گھنگھور پانی کی رِم جِھم کی صدا میں اُسے اکیلے پیڑ کے نیچے بیٹھنا اچھا لگنے لگا......... یہ جوانی کی شروعات تھی۔ .....؟

چندرا ایک دن رام دین سے بولی۔ .... دیکھو۔ اب بٹیا بڑی ہو گئی ہے۔ ان پھٹے چیتھڑوں میں اس کا بدن بھی نہیں ڈھکتا۔ ... کہیں سے کپڑوں کا انتظام کرو"......؟

اسے بھی دھیان آیا اب۔ اس کی بیٹی جوان ہو گئی ہے ... . لیکن نئے کپڑے جو پھٹے ہوئے نہ ہوں کہاں سے لائے .. .. کھیت سے تو مالک کا لگان بھی پورا نہیں ہوتا .... پھر بھی.. ..... روپا اب بڑی ...... ہو گئی ...... ہے'۔ .... "سبھی سوچتا ہوا رام دین نوکری پر چلا گیا....... ...

آج کام کرنے میں اس کا دھیان نہ تھا....... دھیان تو روپا کے کپڑوں کا تھا...... وہ جھنجھلا رہا تھا۔ اپنی قسمت پر۔ درنہ معلوم کیا کیا سوچ رہا تھا....... اس کے سامنے سے زمیندار کی کالی کلوٹی لڑکیاں بھی بنی ٹھنی گذر جاتیں تھیں .... اس کا من۔ اس سے کہنے لگا .....؟

کتنا عجیب اس دنیا کا انتظام ہے۔ یہ بد شکل چھوکریاں اپنے ذرا ذرا سے بالوں میں کیسے خوشبودار تیل ڈالتی ہیں.... گھنٹوں پھولوں کو اپنی چوٹی میں سجاتی ہیں۔ تھوڑی تھوڑی دیر میں نئی نئی ساڑیاں بدل ڈالتی ہیں .... کتنی بے شرم ہے یہ ......

..... اور میری روپا..... ... ان سے سب باتوں میں اچھی ہے۔ پھر بھی۔ اس کے پاس پہننے کو کپڑے نہیں ہیں۔...... کیوں نہیں ہیں"؟ ..... وہ اس سوال کا جواب خود بھی نہ سوچ سکا۔

.... "کچھ بھی ہو آج ضرور مالک سے کچھ روپیہ قرض لونگا.. ...... اس نے سوچ لیا۔ مالک نے بیس روپیہ ..... تیس روپیہ کا رقعہ لکھا کر دو مہینے کے اندر اندر چکا دینے کے وعدے پر دیدیئے۔ ..... بیٹی کی محبت نے ..... بیچی۔

کے ادھ ڈھکے بدن کی بیلو نے باپ کو اتنا بھی سوچنے کا موقع نہ دیا ---
--- بالکل دو مہینے کے اندر یہ روپیہ کہاں سے پیدا کریگا" ......

بہت خوش خوش رام دین ایک لال ساڑی اور پیلا چھپا رانی بیٹی کے لئے لیکر شام کو اپنے گاؤں کو چلدیا ...... جیسے جیسے اس کا گھر قریب آتا جاتا۔ اس کے پیر اور خوشی سے اٹھتے جاتے۔ وہ بار بار ہنس پڑتا تھا سوچکر۔ کہ دھوتی دیکھکر روپا ناچ اٹھے گی ......
اور ہوا بھی ایسے ہی ...... روپا نے وہ کپڑے بسنت کے تیوہار کے لئے رکھ دیئے جس کے ابھی تین مہینے تھے ....

کائنات نے اپنا چولا بدلا۔ درختوں نے نئے بانے پہنے۔ کھیتوں نے رنگ برنگی چادریں اوڑھیں۔ گھر گھر میں جھولے کے گیت ڈھولکوں پر گونج اٹھے۔ جنگل میں منجیرے جھن جھن کرنے لگے۔ اور پرندوں نے نئے راگ گانا شروع کیا۔ بسنت رت آگئی ...... نوجوان دلوں میں نئی امنگیں جاگ اٹھیں ...... اوہ ---- اور
--- روپا نے نہاکر اپنی وہ لال دھوتی اور پیلا چمپر پہنا ----
...... کٹورے کے پانی میں جو منہ دیکھا۔ تو خود بخود اس کی آنکھیں تھوڑی دیر کے لئے بند ہوگئیں ...... اپنی شراب سے خود ہی بیہوش ہوگئی ...... چندا کی آنکھیں بھی اپنی بیٹی کی طرف اٹھ گئیں۔ اس کے ہونٹ خوشی سے تھرتھرا رہے تھے۔ کہ یکایک اسکا منہ پیلا پڑگیا ...... اس کا دل کانپ گیا ...... کیوں ......
--- کیونکہ وہ جانتی تھی کہ غریب کے گھر کی مایا۔ عزت اور بدن سب کچھ ان روپیے والوں کے کھیل کا سامان ہوتا ہے ......
وہ بھی ایک دن روپا کی طرح جوان تھی۔ سُندر تھی ...... اس لئے اُس کے گاؤں کے زمیندار نے ایک دن کھیت پر کام کرتے ہوئے اس کا زبردستی ہاتھ پکڑ لیا تھا ...... وہ گڑگڑائی تھی۔ پیروں پر سر رکھ دیا تھا ...... ظالم کی لاتیں بھی سہیں ...... اس کی عزت کے جانے میں کسر ہی کیا رہ گئی تھی۔ اگر کچھ آدمی ادھر سے نہ نکلے ہوتے ...... اُسے اُس بھوکے جانور کے ہاتھ ڈھیلے ہوتے ہی تو کس طرح جان لیکر بھاگی تھی، ...... وہ یہ سوچ ہی رہی تھی کہ روپا بول اٹھی ...... "ماں ...... یہ ساری کتنی اچھی لگتی ہے" ...... ماں چونک گئی ...... اور "ہاں" کہکر اندر چلی گئی ...... گھر سے تھوڑی دور پر رام دین نے روپا کے لئے آم کے پیڑوں میں جھولا ڈال دیا تھا ...... روپا وہیں دوڑ گئی ......؟

زمیندار کا شوقین اکلوتا بیٹا نرنجن جو لکھنؤ یونیورسٹی کا گریجویٹ تھا ...... اپنے اردلی کے ساتھ اپنی ٹم ٹم پر بسنت موسم کی اداؤں کا لطف لینے گھر سے نکل پڑا۔ اردلی جوان مالک کی عادت سے واقف تھا ...... اور اسی لئے اس نے ٹم ٹم کا رُخ گاؤں کی طرف کردیا ......؟

اس شہر کے رہنے والے۔ عیاشی میں پلے ہوئے اکلوتے نے ابھی تک جوانی دیکھی تھی ...... لیکن رنگ اتری ہوئی ...... پاوڈر اور لپ اسٹک میں چھپی ہوئی۔ ساڑیوں اور جمپروں سے ڈھکی ہوئی ..
--- لیکن آج اس نے قدرت کی خوبصورتی دیکھی جس پر نیا رنگ تھا ...... جس میں عجیب الہڑپن تھا۔ مستی تھی۔ معصومیت تھی۔ اور جو برہنہ تھی ...... آج اس نے وہ حسن دیکھا جو خود اپنے حسن سے بے خبر تھا ...... اس کا دل اچھلنے لگا ...... "کیسے اچھے اچھے پھول ...... اور دھول میں کھیل رہے ہیں ......
اوہ ان سے تو زندگی کی بہت سی راتیں سجائی جاسکتی ہیں ......
کتنے لطف ہوں گے اس زندگی میں ...... کون روک سکتا ہے
...... یہ سب ہمارا ہی تو کھاتے ہیں ...... ہم ہی فائدہ نہ اٹھائیں گے تو ...... ایک سُریلی گلے کی الاپ نے اس کے ہوائی قلعوں کی عمارت کو آدھی بنی حالت ہی میں ڈھا دیا ...
...... روپا گا گاکر پینگیں بڑھا رہی تھی ......
ساری سر سے ڈھلک گئی تھی ...... جھولے کے پیچھے پیچھے سانپ کی طرح لہریں کھا رہی تھی ...... نرنجن نے دیکھا اور دیکھتا ہی رہ گیا۔ کس غضب کی جوانی تھی ...... کیا حسن کی بارش تھی۔ معصومیت نے حسن کو چار چاند لگا دیئے تھے ......
اُسے یاد نہیں پڑتا تھا کہ اپنی یونیورسٹی میں کبھی اس سے زیادہ خوبصورت لڑکی دیکھی ہے ...... ٹم ٹم رک گئی۔ اردلی نے مالک کی طرف دیکھا جیسے وہ مالک کے دل کا حال سمجھتا ہو ......
نرنجن گھورتا رہا۔ جیسے شکاری گھات لگاتا ہے۔ کدھر سے شکار پر وار کرے ...... اردلی اور مالک میں اشارے ہوئے
...... اور دونوں اتر پڑے ......؟

"اے لڑکی ...... ارے۔ اے۔ سنتی ہے یا نہیں۔ ذرا جھولا روکو" ...... اردلی نے آواز دیکر کہا۔ نیچے ایک بیت لئے صاحب کو جو روپا نے دیکھا۔ وہ سہم گئی اور جھولا روک دیا۔
"تمہارا کیا نام ہے"

"روپا"

"کس کی لڑکی ہو"

"رام دین کی"

اوہو۔ جو ہمارے یہاں نوکر ہے۔۔۔۔ تب تو کوئی بات نہیں ہے" نرنجن نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ روپا سمجھی اس سے کوئی خطا ہو گئی تھی۔ لیکن اس بات سے اسے اس کی معافی مل گئی ہے۔ اُسے تسلی ہو گئی اور سہمے ہوئے چہرے پر خوشی کی جھلک دوڑ گئی۔۔۔۔۔ نرنجن کچھ اور ہی سمجھا۔۔۔۔۔ سوچا کہ چڑیا پھنس گئی ہے۔۔۔۔؟

"یہ گھاس جو پڑی ہے۔۔۔۔۔ ذرا اٹھا کر وہ ٹم ٹم کے گھوڑے کے آگے ڈال آؤ"۔۔۔۔۔ اردلی نے مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے کہا۔۔۔۔۔؟

مالک کا کام بھلا کیسے ٹالتی۔۔۔۔ اردلی وہیں رہ گیا اور نرنجن اس کے ساتھ چل دیا۔

روپا گھاس ڈال کر گھومی لوٹنے کو لیکن نرنجن نے اس کی کمر اپنے ہاتھوں میں جکڑ لی تھی۔ اور ٹم ٹم کے اندر لے جانے کی۔۔۔۔۔ کوشش کر رہا تھا۔۔۔۔۔۔ روپا نے مالک کا چہرہ دیکھا اس کی وہ زہریلی آنکھیں دیکھیں۔ اس کی گرم سانس سے اپنے کو جلتے پایا۔ اس نے اپنے بدن کو برہنہ کرتے پایا۔۔۔۔۔ وہ ڈر سے کانپ گئی اور چیخ اس کے منہ سے نکلی۔۔۔۔۔ "کیا کرتے ہو مالک مجھے چھوڑ دو"۔۔۔۔۔ میں ٹم ٹم کے اندر نہ جاؤنگی۔۔۔

نہیں۔ مجھے روپیہ نہ چاہیئیں۔۔۔۔ میری ماں مجھے ڈھونڈ رہی ہوگی۔۔۔۔ مجھے چھوڑ دو"۔۔۔۔ پنجے میں پھنسی چڑیا کو باز اس کے آنسو کی قیمت نہیں دیتا۔۔۔۔۔۔ روپا نے زور سے اپنے باپو کو آواز دی۔۔۔۔۔۔ نرنجن نے اس کا منہ مسل دیا۔۔۔۔۔

وہ مصیبت کے درد میں ڈوبی ہوئی پکار جنگل میں گونج اٹھی۔۔۔۔ اور رام دین کے کانوں میں بھی۔ جو کھیت سے کچھ سبزی توڑ کر گھر لوٹ رہا تھا۔۔۔۔۔ لاٹھی سنبھالتا ہوا ہوا کے مانند وہ ادھر لپک گیا۔

۔۔۔۔۔۔۔۔ رام دین تڑپ کر ایک گز زمین سے اچھل پڑا۔ جیسے بجلی اس پر گری ہو۔۔۔۔۔۔ جیسے کسی نے اس کے سینہ میں چھرا گھونپ دیا ہو۔۔۔۔۔ جیسے دو پہاڑوں کے بیچ رکھ کر اس کا دل مسل دیا ہو۔۔۔۔۔۔ اس کی آنکھوں کے سامنے نرنجن نے اس کی پھول سی بیٹی کے لات ماری۔۔۔۔۔۔ رام دین کی آنکھیں خون سے رنگ گئیں۔ اتنی زور کا بھرپور ہاتھ مارا کہ نرنجن زمین چاٹنے لگا۔ اتنے ہی میں غصہ کم ہوا، اس کے سر پر اور منہ پر نہ معلوم کتنی لاتیں لگائیں۔۔۔۔ وہ تو اُسے مار ہی ڈالتا اگر روپا اُسے اپنے ساتھ نہ کھینچ لیتی۔۔۔۔۔ روپا ابھی تک سسک رہی تھی اور رام دین زخمی سانپ کی طرح پھنکارے مار رہا تھا۔۔۔۔

روپا کا بدن ڈر سے کانپ رہا تھا اور رام دین کا غصے اور انتقام کی آگ سے۔۔۔۔۔ چندا نے جب یہ حال سنا۔ اس کا خون سرد ہو گیا۔۔۔۔۔ اس کے منہ سے صرف یہی نکلا۔۔۔۔۔۔

"کیا دین آدمیوں کا یہی بھاگیہ ہوتا ہے پرمیشور"

تھوڑی دیر بعد اردلی لوٹا۔ مالک کو چت پڑے دیکھا۔۔۔۔۔ جان باقی تھی۔ گھر اٹھا کر لے گیا۔۔۔۔ زمیندار کو سب بات معلوم ہوئی۔ اپنے بیٹے کی اس درگت پر خون کھول گیا۔ لیکن اس وقت چپ رہا۔ یہ کہکر ایک دو دن میں اس کمین کو اس کا مزہ چکھا دوں گا"۔۔۔۔۔؟

سب سے اچھا راستہ اپنی عزت کی بچت کا ان غریبوں نے یہی سمجھا کہ روپا کی شادی فوراً تین چار دن کے اندر ہی کر دینی چاہیئے۔ ۔۔۔۔ کرشن داس پاس کے گانوں کا انھیں غریبوں میں ایک کا لڑکا تھا جو اس ضلع کے اچھوتوں میں پہلا گریجویٹ تھا۔ ۔۔۔۔ اس نے روپا کو ایک دن اسی کے گھر پر دیکھا تھا۔۔۔۔۔ ۔۔۔۔ وہ راضی تھا۔۔۔۔۔۔ شادی طے ہو گئی۔۔۔۔

۔۔۔۔ اس واقعے کے تیسرے دن کی

۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

غریبوں کے گھر کی شادی ہی کیا۔ دوسرے گانوں سے لڑکا اور اس کے پتا۔ چاچا چلے آئے۔ گانوں کے برہمن نے شادی کی رسم ادا کر دی۔۔۔۔۔۔ بدا کی تیاری ہونے لگی۔۔۔۔۔ اپنے جگر کے ٹکڑے کو اپنے سے الگ کرنے ماں۔ باپ انھیں لے کر گھر سے نکلے۔۔۔۔۔ دیکھا تو دو ایک لال پگڑی والے سپاہی اور کچھ زمیندار کے نوکر رام دین کا انتظار کر رہے تھے۔۔۔۔۔۔ بغیر کچھ کہے اس کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈالدیں۔۔۔۔۔ یہی نہیں۔ بلکہ پیروں میں لوہے کی بیڑیاں بھی۔۔۔۔۔۔ جس سے وہ بھاگ نہ جائے۔۔۔۔۔۔ مجھے آخری بار اپنی بیٹی کو گلے تو لگا لینے دو۔ یہ کہکر رام دین اپنی بیٹی کی طرف بڑھا۔ لیکن حاکم صاحب کے بید کی ایک چوٹ نے رام دین کا منہ پھیر دیا۔۔۔۔ بید اس کی آنکھوں پر پڑا اور لڑکھڑا کر گر پڑا۔ چندا اسے سنبھالنے کے

لئے آگے بڑھی - ایک ڈنڈا اس کے ہاتھوں پر بھی پڑا ....
ادھر وہ لوہے کی بیڑیاں جھنکار اٹھیں - اور ادھر جنیدا کی سہاگ کی
چوڑیاں چھن چھن کر کے زمین پر بکھر گئیں .... پردے سے
ڈھکے منہ سے ایک چیخ نکلی .... چھپّر پر بیٹھے ہوئے
پرند چیں، چیں، کر کے اڑ گئے ...... رام دین نے بوبا کو
بدا کر دیا ...... ان سب جھنجھناہٹوں کے درمیان ... یہ کتھا بوبا
کی شادی کا مڈھر باجا .... اس کی زندگی کے سب سے زیادہ
خوشی کے وقت کا باجا .... ؟

افلاس

زندگی کا ایک ناقابل برداشت دَور! جس کے دن بغیر روٹی کے، صبحیں بغیر تازگی کے، شامیں بغیر روشنی کے اور راتیں بے خواب ہوتی ہیں -

بے آگ کے چولھے، بغیر روشنی کے ہفتے اور امید سے تہی مستقبل، کپکپاتا ہوا احساس، لرزتے ہوئے ارادے تھرتھراتے ہوئے پاؤں اور شکست خوردگی کے کُہر میں لپٹے ہوئے تصوّرات، آنکھوں میں احساس کمتری کا کاسۂ دریوزہ گری پھیلائے، ثابت و سالم لباس میں سے نکلی ہوئی کہنیاں، اِک گئی گزری ٹوپی پر زندگی کا بارگراں، چہرہ پر آفات کی گرد، لبوں پر نفسِ گرم کے جھکڑ، بغیر تلوں کی جوتیاں تپتے ہوئے راہیوں کی تپش سے محفوظ برسات کے پانی کی پناہ گاہیں اور پھر تاریک و خاموش گھر میں واپسی اور پھر لرزتے ہاتھوں سے دروازے کا بند کرنا، وہ ہمسایوں کی طعنہ زنی اور گرجتی ہوئی قرض خواہی سے محفوظ ہونا، وہ مکاندار کی گرج دار آواز سے بچنے کی کوشش ناکام - سچ ہے افلاس زندہ موت ہے۔

ضمیر کی ملامت و ندامت، احساسِ وقار کی پامالی، نفرت، حقارت، افسردگی، انسانیت کے حلقوم میں ناقابلِ بیان تلخی!

کس طرح ایک مفلس اس تلخی کو نگلتا ہے اور کس طرح اکثر اوقات یہی غذا نگلنے اور پیٹ بھرنے کے لئے دستیاب ہوتی ہے - افلاس ان حقائق کا علم ہے۔

افلاس کچھ اور حقائق کا کشّاف بھی ہو سکتا ہے اگر انسان اس سے بے نیاز ہو کر اپنی روحانی دولت کا احساس کرے - اگر قدرت اور سماج کی ناانصافی کا سرا تیری جستجو کے ہاتھ پڑ جائے تو تیرے ٹوٹتے ہوئے اعصاب میں آہن کی سی صلابت اور شعلے کی سی حرارت دوڑنے لگے۔

کبھی یہ سوچ قدرت اندھی کیوں ہے؟ اور کبھی یہ غور کر سماج کی آنکھیں چھوٹی اور دانت بڑے کیوں ہیں!؟ کیا تو اس کی طویل انگلیوں میں دو دو گز کے ناخن نہیں دیکھتا!؟

ساغر

مسعود رزمی (میرٹھی)

غزل

بے سوزِ تپشِ نغمہ، بے ذوقِ خلشِ محفل
کچھ اور ابھی ترسے زخمہ کو ربابِ دل

ناقہ کا نشاں پیدا، غائب زِ نظر محمل
منزل جسے ہم سمجھے تھی گردِ رہِ منزل

غافل نہ رہے دل کے سرمایہ سے اہلِ دل
کھونا ہے اسے آساں پانا ہی اُسے مشکل

پیمانہ و ساغر پھر پیمانہ و ساغر ہیں
دریا سے نہیں بجھتی لب تشنگیٔ ساحل

اُس راہ کو طے کرتے گزرے مہ و سال اپنے
جس راہ میں تھا اپنا ہر نقشِ قدم منزل

عقبیٰ کے مناظر تو آنکھوں سے نہاں ٹھہرے
دنیا کی طرف دل کی وحشت نہیں کیوں مائل

واعظ! ترے دوزخ کی یہ آگ معاذ اللہ!
جینا تو کٹھن تھا ہی مرنا بھی ہوا مشکل!

خواجہ احمد عباس

سیاہ حاشئے

عسکری نے منٹو کو، اس کی افسانیت اور اُس کے آرٹ کو بڑے پیار سے، بڑی ملائمت سے، دھیرے دھیرے چھُری سے ذبح کر رہا تھا۔

منٹو نے پوچھا "جان کنی اچھی یا موت؟"

عسکری نے چھُری آہستہ آہستہ چلاتے ہوئے جواب دیا۔ موت بہتر ہے تاکہ ایک بار ہی تکلیف سے چھٹکارا ہو جائے۔"

منٹو نے اپنے بہتے ہوئے لہو سے زمین پر بیل بوٹے بناتے ہوئے کہا "تو پیارے عسکری۔ مہربانی کر کے میری گردن کا جھٹکا کر دو۔ تاکہ میں اس اذیت سے چھٹکارا پا جاؤں"

عسکری نے جواب دیا "تم نے کیا مجھے سِکھ سمجھ لیا ہے؟" اور اس کی کُند چھری دھیرے دھیرے بڑے پیار سے منٹو کی۔ منٹو کے آرٹ کی، منٹو کی افسانیت کی شہ رگ کو کاٹتی رہی۔

ہاہاہا۔ ہنسئے صاحب۔ اور اس بات کا ثبوت دیجیے کہ آپ عسکری کی طرح اُن چند نفوس میں سے ہیں جو قتل و غارت کے مناظر میں بھی ہنسنے ہنسانے کے لطیفے تلاش کرنے کو ہی ادبی تخلیق کی معراج سمجھتے ہیں جو آرٹ کے پاک دامن کو کبھی انسان دوستی، جمہوریت، رواداری، اخوت وغیرہ جیسے ڈھکوسلوں سے ملوث نہیں کرتے۔ اور فسادات کی خوں ریزی میں بھی آپ کو زخمی انسانیت کی پکار نہیں سنائی دیتی۔ کیوں کہ (بقول عسکری) "دراصل ادب کو اس بات سے کوئی دلچسپی نہیں کہ کون ظلم کر رہا ہے کون نہیں کر رہا۔ ظلم ہو رہا ہے یا نہیں ہو رہا۔ جہاں تک ادب کا تعلق ہے۔ ظلم کا خارجی عمل اور اس کے خارجی لوازمات بے معنی چیزیں ہیں۔ .... ادب میں عام زندگی والا خلوص کام نہیں دیتا...... ہم انسانوں سے تو نفرت اور محبت کر سکتے ہیں ظالموں اور مظلوموں سے نہیں۔"

ادب اور آرٹ کے بارے میں عسکری کے غیر ترقی پسندانہ خیالات تو ہمیں معلوم تھے لیکن یہ نہ معلوم تھا کہ "آرٹ برائے آرٹ" آگے چل کر ایک ایسی فن کارانہ بلندی پر پہنچا دے گا۔ جہاں سے ظالم اور مظلوم، انسان اور حیوان، میں تمیز کرنا مشکل ہو جائے گا۔ جس کا اظہار عسکری نے "سیاہ حاشئے" کے دیباچے میں کیا ہے۔ کاش منٹو نے یہ دیباچہ لکھوا کر عسکری کے ہاتھوں اپنا خون نہ کرایا ہوتا۔

منٹو ایک عجیب اور الٹی کھوپڑی کا ریاکار ہے یعنی فطرتاً اور اصولاً ترقی پسند اور انسان دوست ہوتے ہوئے بھی ان لیبلوں سے گھبراتا ہے۔

منٹو اپنی قسم کا ایک ہی ادیب ہے اس کی کہانیاں ہر دوسرے افسانہ نگار سے مختلف ہوتی ہیں۔ منٹو کی ادبی تکنیک صرف منٹو کا حصّہ ہے۔ اس کی وجہ صرف یہ نہیں ہے کہ وہ دوسروں سے منفرد ہونے کے لئے اس طرح لکھتا ہے بلکہ اس نے دنیا میں اتنی ریاکاری دیکھی ہے کہ اسے "اچھے پن" کے اعلان سے چڑ ہو گئی ہے اور نام نہاد "اچھوں" سے نفرت وہ "بُروں" میں اچھائی اور انسانیت تلاش کرتا ہے۔ گھٹیا قسم کی رنڈیوں میں۔ دلّالوں میں "بابو گوپی ناتھ" جیسے عیاشوں میں وہ اپنی انسان دوستی کا اظہار بھی کبھی براہ راست نہیں کرتا۔ مگر جس کسی نے اس کی "ہتک" "کالی" "کھول دو" جیسی کہانیاں پڑھی ہیں وہ انکار نہیں کر سکتا کہ منٹو ظلم سے نفرت کرتا ہے اور مظلوموں سے ہمدردی رکھتا ہے اگرچہ وہ مر جائے گا۔ مگر کبھی بھی اپنی زبان یا قلم سے اقرار نہیں کرے گا کہ وہ اپنے قلم کو اکثر جرّاح کے نشتر سے تشبیہ دیا کرتا ہے۔ وہ سماج کے پکتے ہوئے پھوڑوں پر سے پٹیاں اتار کر نہایت بے رحمی سے ان میں اپنا نشتر چبھوتا ہے تاکہ پیپ اور فاسد مادہ نکل جائے۔

اس لئے اس کے اکثر افسانے (اپنے انوکھے ڈھنگ سے) انصاف

اور انسان دوستی کی قدروں کے حامل ہوتے ہیں اور ان کا شمار ظلوما اور ترقی پسند ادب میں کیا جاتا ہے۔

کبھی منٹو ایسے ادبی تجربے کیا کرتا ہے جو اکثر پڑھنے والوں کو متنفر کر دیتے ہیں۔ مثلاً اس کی چند سطری کہانی "موتری" جس میں اس نے آج سے چار سال پہلے آگاہ کر دیا تھا کہ ہندوستان اور پاکستان کے نام پر کتنی غلاظت اچھالی جائے گی، اس انوکھے اور بے ڈھب دماغ نے (جو فسادات کی ہولناکی) سے پوری حد تک متاثر ہوا تھا جس کا اظہار اس کی کہانی "کھول دو" اور (اغوا شدہ عورتوں کے بارے میں اس کے مضامین میں ہوا ہے) فسادات کا ایک دوسرا پہلو بھی دیکھا کہ قتل اور لوٹ کرنے والوں میں مشاق اور عادی مجرم ہی نہ تھے۔ بلکہ ان میں سے اکثر مضحکہ خیز حد تک سیدھے سادے اور بے وقوف قسم کے معمولی انسان تھے جن سے وقتی جنون کے زیر اثر شرمناک اور ظالمانہ حرکتیں صادر ہوئیں مگر ظلم کے سیدان میں ان قاتلوں کا "اناڑی پن" یا "بھولا پن" فسادات کی ہولناکی کو کم نہیں زیادہ کرتا ہے۔ اگر ایک پیشہ ور عادی مجرم قتل کرتا ہوا پایا جائے۔ تو کوئی خاص تعجب کی بات نہیں مگر جب سیدھے سادھے انسان انسانیت کا راستہ چھوڑ کر قتل و خون کرتے ہوئے پائے جائیں تو سمجھ لیجئے کہ ہمارے تمدن اور تہذیب کی بنیادیں ہل گئی ہیں۔

صحافت کا پرانا اصول ہے کہ اگر ایک کتے نے آدمی کو کاٹ لیا ہے تو یہ کوئی خاص اہم خبر نہیں ہے۔ لیکن اگر کوئی آدمی کتے کو کاٹ کھائے تو ضرور ایک سنسنی خیز خبر ہے۔ میرا خیال ہے کہ "سیاہ حاشئے" والے لطیفوں کو شائع کر کے منٹو اپنے انوکھے اور بے ڈھب انداز میں فسادات کے اس پہلو کی طرف توجہ مبذول کرانا چاہتا تھا کتاب کا نام ہی اس کی دلیل ہے کہ وہ ان حرکتوں کے بیان سے لطف اندوز ہونا یا کرنا نہیں چاہتا تھا بلکہ حقیقت کے شیشے میں انسانیت کو اس کا نیا اور مضحکہ انگیز حد تک مکروہ چہرہ دکھانا چاہتا تھا۔ تاکہ ہم پہچان لیں کہ فسادات میں کون اور لوٹ مار کرنے والے صرف پکے عادی مجرم اور غنڈے ہی نہیں ہمارے آپ جیسے معمولی آدمی بھی تھے۔

مجھے اس کا یقین ہے کہ "سیاہ حاشئے" لکھنے اور شائع کرنے میں منٹو کی نیت اچھی تھی۔ جس کا ثبوت یہ بھی ہے کہ ان واقعات کے انتخاب میں وہ کسی فرقہ وارانہ جذبے سے متاثر نہیں ہوا ہے اور اس نے ان "اناڑی" قاتلوں اور لٹیروں کی فہرست میں ہندو، مسلمان، اور سکھ سب کو شامل کیا ہے۔ مگر میرا خیال ہے کہ باوجود اپنی نیک نیتی کے منٹو یہ کتاب لکھ کر اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوا ہے۔ اس کی پہلی اور بڑی وجہ تو حسن عسکری کا دیباچہ ہی ہے۔ جس میں منٹو کی تعریف کے بہانے نہ صرف انسان دوست ترقی پسندوں پر حملے کئے گئے ہیں بلکہ منٹو کے مقاصد اور اس کی ادبی قدروں کو مسخ کر کے پیش کیا گیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ حسن عسکری کو اپنی رجعت پسندانہ ذہنیت پر پردہ ڈالنے کے لئے منٹو کی آڑ لینے کی ضرورت پیش آ رہی ہے۔ تعجب اور افسوس تو یہ ہے کہ منٹو جیسے ادیب کو اپنی ایک ادبی تخلیق کے لئے عسکری جیسے آدمی کی سفارش اور تعارف کی ضرورت پڑی۔

عسکری کے دیباچے سے قطع نظر بھی منٹو "سیاہ حاشئے" نہ لکھتا تو اچھا ہوتا۔ جس نظر سے منٹو نے فسادات کے اس مضحک المیہ کو دیکھا ہے۔ بہت کم پڑھنے والے وہ نظر یا سمجھ بوجھ رکھتے ہیں۔ ان میں سے زیادہ تر تو ان ہولناک لطیفوں کو مزا لے کر ہی پڑھیں گے، ظلم اور حیوانیت کے بعض مناظر صرف خون کے آنسو رونے کے لئے ہوتے ہیں۔ وہاں منٹو کا زہرخند بھی ممکن نہیں ہوتا۔ منٹو کا تیز نشتر سماج کے پھوڑوں اور ناسوروں میں سے پیپ نکالنے کے لئے اکثر موثر ثابت ہوا ہے۔ مگر اس نشتر سے اس نے چالیس کروڑ دلوں کے پھپھولوں کو نہ چھیڑا ہوتا تو بہتر تھا۔

بامن آمیزش او صورت موج است و کنار
دمبدم با من و ہر لحظہ گریزاں از من

ایم۔ ایم جوہر میرٹھی

گورکی اور ٹالسٹائے

اس کو خواہ اتفاق کہئیے خواہ قدرت کا طریقۂ کار خیال کیجئے کہ بیشتر مشاہیر کی زندگی دنیاوی اعتبار سے مصائب و آلام کا شکار ہی رہی۔ اوّل تو بہت کم ایسے ہیں جو آسودہ گھروں میں پیدا ہوئے اور جو ہوئے بھی انھوں نے بھی عسرت کی زندگی اختیار کر لی۔ شاید عسرت اور مصائب کی زندگی ہی انسان میں وہ خاص ادراک اور نفسی پختگی پیدا کرتی ہے جو اس کو دنیا کا امام بنا دیتے ہیں جذباتی اور نفسیاتی اعتبار سے بھی شاید انسان اسی وقت مکمل ہوتا ہے جبکہ وہ آسودگی کو ہمیشہ کے لیئے خیر باد کہکر دوامی اقدار کو اپنے لیے مشعلِ راہ بنالیتا ہے۔

گورکی بھی مثل دیگر مشاہیر کے ایک نادار گھر میں پیدا ہوا اور ابھی بچہ ہی تھا کہ یتیم ہوگیا۔ گورکی کے نانا نانی اس حادثہ سے بڑے پریشان ہوئے۔ کچھ دن تو وہ خاموش رہے پھر انھوں نے اپنی بیٹی (گورکی کی ماں) کا نکاح ایک گھڑی ساز سے کرنے کا ارادہ کیا لیکن وہ گھڑی ساز اتفاق سے اتنا بدصورت تھا کہ گورکی کی ماں اس سے شادی کرنے پر راضی نہ ہوتی تھی۔ گورکی اپنے بچپن کے حالات قلمبند کرتے ہوئے لکھتا ہے "اس زمانے میں میری ماں بڑی افسردہ رہتی تھی..... اس کی رنگت اڑنے لگی تھی۔ مزاج چڑچڑا ہوگیا تھا۔ اپنے بچپن کے زمانے میں مجھے یوں ہی سا خیال تھا کہ نانا میری ماں سے زبردستی کچھ کرانا چاہتے ہیں جس کو میری ماں پسند نہیں کرتی اس زمانے میں مجھے یاد ہے کہ ایک روز نانا نے دروازہ سے سر نکالا اور میری ماں سے کہا 'وہ آگیا ہے ذرا اچھے کپڑے پہن کر آجاؤ' میری ماں نے یہ سن کر جنبش تک نہ کی اور گردن نیچے کیئے ہوئے دریافت کیا، کہاں آجاؤں؟' نانا بولے 'خدا کے لیے آجاؤ۔ وہ اچھا آدمی ہے اپنے گھڑی سازی کے کام میں ہوشیار ہے اور الیکسی (گورکی) کے ساتھ باپ کا سا سلوک کرے گا۔ ماں نے تیزی سے جواب دیا 'میں کہہ رہی ہوں میں نہیں کروں گی'، اس جواب پر نانا لال پیلے ہوگئے اور چلائے 'چلتی ہے تو چل ورنہ میں تیری چٹیا پکڑ کر گھسیٹتا ہوا لے جاؤں گا' اس پر میری ماں چلائی 'مجھ گھسیٹو گے؟' وہ غصہ میں کھڑی ہوگئی اور اس نے سوائے ایک کپڑے کے باقی تمام کپڑے اتار ڈالے اور کہا 'ہاں اب مجھے گھسیٹو'، اور وہ خود دروازہ کھول کر اسی حالت میں باہر جانے لگی۔ میرے نانا ابا بہت تلملائے انھوں نے بہت دانت پیسے اور کہا 'میری عزت خاک میں ملاتی ہے تو ہمیں تباہ کردے گی'، نانی اماں پہلے ہی سے دروازہ روکے کھڑی تھیں اور میری ماں کو پیرے اس طرح ڈھکیل رہی تھیں جیسے مرغیوں کو ڈربے میں ڈھکیلتے ہیں' میری ماں نے نانی سے کہا 'کان کھول کر سن لو میں اس کے پاس نہیں جانے کی'۔" اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ گورکی کس طبقہ کا آدمی تھا اور اس کی پرورش کس ماحول میں ہوئی تھی۔

اگر مصائب صرف یہیں ختم ہو جاتے تب بھی غنیمت تھا لیکن گورکی کی قسمت میں جلد ہی بیسیر ہونا بھی لکھا تھا۔ چنانچہ اس واقعہ کے کچھ ہی عرصہ بعد گورکی کی ماں فطری جذبات سے متاثر ہوکر ایک شریف زادے کے ساتھ ماسکو بھاگ گئی۔ وہ میاں ابھی کالج ہی میں تعلیم پاتے تھے۔ چنانچہ جب تک روپیہ رہا ماسکو میں خوب عیش کرتے رہے جب روپیہ ختم ہوگیا تو رومانیت بھی ختم ہوگئی اور دولہا صاحب بھی اس پر مجبور ہوئے کہ ساس وسسر کے پاس پناہ لیں۔ گورکی کی زندگی کا یہ زمانہ بہت تاریک گزرا ہے،

کیونکہ اس کا سوتیلا باپ نہ صرف گورکی کے ساتھ بلکہ اس کی ماں کے ساتھ بھی بُرا سلوک کرتا تھا۔ اب اس نوجوان کا دل محبت سے سیر ہو چکا تھا۔ گورکی کی ماں جب ماسکو سے واپس آئی تو حالتِ امید میں تھی اور کچھ اس وجہ سے اور کچھ مالی مشکلات اور شوہر کی بے رحمی کے سبب اپنی رونق کھو رہی تھی۔ اس کا شوہر اس کی صورت کا مذاق اڑاتا اور چڑانے کے لئے اپنی ہی عیاشیوں کے افسانے اس کے سامنے فخریہ بیان کرتا۔ درحقیقت اس کی ان باتوں سے اس قدر رکڑھتی کہ اس کو دق ہو گئی۔ ایک دن کا ذکر ہے گورکی دیوار کے پاس کھڑا تھا کہ اس نے اپنی ماں کو نوجوان سے یہ درخواست کرتے سُنا کہ وہ بھی اس عورت کو دیکھنا چاہتی ہے جو نوجوان کی محبت کی مالک ہو گئی ہے۔ گورکی اپنی سوانح میں لکھتا ہے "میں یہ سُن ہی رہا تھا کہ دیوار کے پیچھے سے گھونسنے کی آواز آئی۔ میں فوراً لپکا۔ دیکھتا کیا ہوں کہ میری ماں گھٹنوں کے بل گری پڑی ہے۔ اس کی بُری حالت ہے اور میرا سوتیلا باپ چمکدار پوشاک پہنے پاس کھڑا ہے اور اس کے سینے پر ٹھوکریں مار رہا ہے۔" گورکی کو یہ منظر دیکھ کر تاب نہ رہی اور اس نے میز سے چھری اٹھا کر اپنے سوتیلے باپ کے ماری جس سے کپڑے تو پھٹے۔ لیکن چوٹ نہ آئی۔ گورکی آگے چل کر لکھتا ہے کہ "اسی روز شام کو اماں جان میرے پاس آئیں۔ پیار کیا اور رو کر کہنے لگیں، میں خود کو مجرم محسوس کرتی ہوں مجھے معاف کر دو۔" یہ اس زمانے کے واقعات ہیں جب گورکی چھ سال کا تھا۔ جب ۴۶ سال کا ہوا اس وقت لکھتا ہے "چالیس برس گزر گئے لیکن آج بھی اس کمینہ پر کو ایک عورت کی چھاتی پر ضرب لگاتے دیکھتا ہوں۔" اس چھری کے واقعہ کے کچھ ہی عرصے بعد گورکی کا سوتیلا بھائی پیدا ہوا۔ ماں زچگی کے زمانے ہی میں رخصت ہو گئی اور ماں کے مرنے کے کچھ ہی دن بعد وہ بچہ بھی چل بسا۔

ماں کے بعد گورکی کا نانا نانی کے سوا کون تھا چنانچہ وہ وہیں رہنے لگا۔ یہاں کا ماحول بڑا خراب تھا۔ گورکی کے ماموں شرابی، کبابی اور عیاش تھے۔ ہر وقت یا تو آپس میں یا اپنے ماں باپ سے برسرِ پیکار رہتے تھے ایک دن ایسی لڑائی ہوئی کہ گورکی کی نانی کی بانہہ ٹوٹ گئی۔ گورکی کا ابتدائی بچپن ان ہی لڑائی جھگڑوں میں گزرا۔ جب ذرا بڑا ہوا تو نانی نے اسکول میں داخل کر دیا۔ لیکن اسکول کے وقت کے علاوہ گورکی ایک بوری لیے سڑکوں پر ردّی۔ دھجیاں اور کیلیں وغیرہ چُنتا پھرتا اور ان کو فروخت کر کے جو کچھ ملتا نانی اماں کو لا کر دیدیتا۔

لڑکپن شروع ہوا تو تعلیم ختم ہو گئی۔ نانی نے ایک جوتے والے کی دوکان پر نوکر کرا دیا۔ اس دوکان پر پہلا سبق یہ ملا "بے ایمانی کے بغیر دکانداری نہیں ہوتی" گورکی اس زمانے کا ایک واقعہ بیان کرتا ہے "دوکان کے نوکر بے ایمان تھے دوکان کی چیزیں اڑا لیتے تھے۔ ایک دن قریب کے گرجے کا دربان میرے پاس آیا اور مجھے پھسلانے لگا کہ اس کے پیر کا ایک جوتا چرا کر اس کو دیدوں۔ میں نے کہا اچھا تم بڈھے آدمی ہو تمھارے سفید بالوں کی خاطر مجھے یہ بھی کرنا پڑے گا۔ یہ بات ختم بھی نہیں ہوئی تھی کہ دربان بولا اگر میں تمھاری چوری کا ذکر مالک سے کر دوں تو کیا ہو؟ دربان کی اس دھمکی سے میں بہت ڈرا۔ میرا خوف دیکھ کر وہ مجھے ایک طرف لے گیا اور چوری کے ارادہ پر مجھے بُرا بھلا کہنے لگا۔ پھر کہا "میاں لڑکے کیا یہ خیال کرتے ہو کہ انسان انسان کے ساتھ بُرائی نہیں کر سکتا۔ اہا ہا تم بڑے بیوقوف ہو۔" گورکی ملازمت چھوڑ کر نانا نانی پر بار ہو گیا۔ اب نانی اور نواسے جنگل میں جاتے اور وہاں سے رس بھری اور خشک میوے چُن لاتے اور ان کو فروخت کر کے جو کچھ ملتا وہ نانی نانا کو لا کر دیدیتیں۔ اس پر بھی نانا آنکھیں نکالتے، غراتے اور کہتے تم تو کھانا جانتے ہو کمانا نہیں جانتے۔ کچھ دن بعد نانی نے اپنی بہن کے لڑکے کے دفتر میں گورکی کو ۲ روبل سالانہ پر رکھوا دیا۔ وہاں رشتہ کی نانی نے گورکی کو اتنا پریشان کیا کہ ایک روز جب اس نے صبح کا ناشتہ لانے کے لئے گورکی کو پیسے دیئے تو بجائے ناشتہ لے کر دفتر جانے کے وہ دریائے والگا کے کنارے نکل گیا اور ایک جہاز پر ملازمت کر لی خدا کی قدرت کہ اس جہاز کے بڑے باورچی کو کتابیں سننے کا شوق تھا اس نے گورکی کو یہ خدمت سپرد کی۔ اس طرح گورکی کو افسانے پڑھنے کا خوب موقع ملا اور شوق بھی بڑھ گیا۔ کیونکہ یہ ملازمت ایک خاص میعاد تک کی تھی اس لئے جب وقت پورا ہو گیا تو ملازمت بھی ختم ہو گئی اور گورکی کے سامنے پھر روزی کا مسئلہ آ گیا وہ تلاش معاش میں شہر بہ شہر پھرتا پھراتا طفلس پہنچا جہاں حسنِ اتفاق سے اس کی ایک ایسے شخص سے ملاقات ہوئی جس کی ہمدردی نے گورکی کی زندگی بنا دی۔ یہ شخص کلی آزنی نامی ایک انقلابی تھا جو سائبیریا میں چھ سال کی قید با مشقت کاٹ چکا تھا اس کا ایک بہت اچھا ذاتی کتب خانہ بھی تھا۔ یہ شخص گورکی کا مشفق ہو گیا اور اس نے آوارہ گرد گورکی کو اپنے کتب خانے سے فائدہ اٹھانے کی اجازت دیدی۔ جب دوستی بڑھی تو ایک دن کلی آزنی نے گورکی

کو کمرے میں بند کر دیا اور کہا کہ جب تک اپنی زندگی کے حالات ایک مضمون کی شکل میں قلمبند نہ کر دو گے دروازہ نہ کھلے گا۔ چنانچہ گورکی نے حکم کی تعمیل کی اور وہ مضمون مقامی سرکاری اخبار میں ۲۴ دسمبر ۱۸۹۲ء کے پرچہ میں طبع ہوا۔ گورکی نے جب اپنی خود نوشتہ سوانح حیات سرکاری اخبار میں دیکھی تو بہت مسرور ہوا اب وہ کہانیاں لکھنے لگا اور رسائل میں بھیجنے لگا جس سے اس کی کچھ کچھ شہرت بھی ہونے لگی لیکن آمدنی کی کوئی صورت نہ نکلی اس زمانہ میں ایک وکیل کی محرری کر لی۔ تنخواہ ملی تو عشق کی سوجھی ایک پولینڈ کی عورت سے شادی کر بیٹھے ایک مکان دو روبل مہینہ کرایہ پر لیا وہاں عسرت میں بسر کی نتیجہ یہ نکلا کہ پھیپھڑوں کی دق ہو گئی۔ بھلا دماغی انسان اور بے دماغ عورت کی کب نبھ سکتی ہے ایک دن گورکی اور اس کی بیوی ہم آغوش تھے تو گورکی نے اس کو محبت کے متعلق اپنا نظریہ سمجھانا شروع کیا۔ گورکی لکھتا ہے "وہ میری باتیں سن کر بھونچکی سی ہو گئی اور کہنے لگی کیا واقعی تمہارا یہ خیال ہے۔ کیا واقعی تم یہ خیال کرتے ہو؟" وہ گورکی کی ہم خیال نہ تھی۔ اسکا نظریۂ محبت محض تفریحی تھا۔ وہ گورکی کے دوستوں سے بے تکلف تھی جس سے اس کو حسد ہوتا تھا۔ گورکی اپنی اس کمزوری کو فلسفہ کے رنگ میں ڈھال کر یوں بیان کرتا ہے "مرد کی زندگی میں چند لمحے ایسے بھی آتے ہیں جب وہ اپنا دل عورت کے سامنے اس طرح کھول کر رکھ دیتا ہے جس طرح کہ خدا کا پرستار خدا کے سامنے اپنے ظاہر و باطن کو بے نقاب کرتا ہے۔ جب عورت کے روبرو مرد کا باطن بے نقاب ہو جاتا ہے تو مرد خود اپنے آپ سے اجنبی سا محسوس کرنے لگتا ہے۔ شاید مرد میں حسد اس خوف سے پیدا ہوتا ہے کہ کہیں اس کی شریک حیات دوسرے مرد سے اتنی مانوس نہ ہو جائے کہ وہ شوہر کی راز کی باتیں دوسرے سے کہہ دے" قصہ کوتاہ کچھ عرصے بعد گورکی اور اس کی بیوی میں علیحدگی ہو گئی اور گورکی از سر نو آوارہ گردی کرتا رہا سمارا پہنچ گیا جہاں اس نے اخبار کے دفتر میں ملازمت کر لی۔

اخباری دنیا میں داخل ہو جانے سے زیادہ میل جول اور شہرت ہو ہی جاتی ہے چنانچہ گورکی کی بھی بہت سے لوگوں سے شناسائی ہو گئی۔ اگر ایک طرف شہرت بڑھی تو دوسری طرف اسکو برقرار رکھنے کے لیے زیادہ محنت کرنی پڑی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ گورکی ۱۸۹۶ء میں بہت سخت بیمار ہو گیا پھیپھڑوں کی دق تو دق کر رہی تھی لیکن جب کمزوری بڑھی تو ایک اور ڈکھ عود کر آیا۔ افلاس و مصائب کے زمانہ میں گورکی نے خود کشی کی نیت سے اپنے گولی مار لی تھی جو کمر میں ہی رہ گئی تھی اب اس گولی نے بھی تکلیف دینی شروع کر دی۔ حرارت ۱۰۳ درجہ رہنے لگی۔ ڈاکٹروں نے کچھ دن تو علاج کیا پھر زندگی سے ناامیدی ظاہر کی لیکن گورکی کی کاٹھی اتنی مضبوط تھی کہ وہ بیماری کو سنبھال لے گیا۔ صحت ہو گئی تو دوستوں نے زور دیا کہ افسانوں کا مجموعہ طبع کرا دیا جائے۔ شاید اس سے گزارے کے لئے کچھ رقم وصول ہو جائے بڑی مشکل سے افسانے طبع ہوئے اور اس سے زیادہ دشواری سے دوکانداران کو ۵۰ فیصدی کمیشن لے کر فروخت کرنے پر راضی ہوئے۔ لیکن کتب فروشوں کی توقع کے خلاف ایک سال ہی میں ساری کاپیاں فروخت ہو گئیں۔ جب افسانے دوسری مرتبہ شایع ہوئے اور ناشروں نے گورکی کو ایک ہزار روبل روانہ کئے تو اس غیر متوقع خوش قسمتی پر گورکی بہت خوش ہوا۔ اس کے پڑوسی کا بیان ہے جب گورکی کو ایک ہزار روبل ملے تو اس کو خوشی کی بہ نسبت حیرت ہوئی وہ میری ماں کے پاس آئے اور ٹانگیں چوڑی کر کے کھڑے ہو گئے۔ اور کہنے لگے "دیکھو! دیکھو!! انھوں نے مجھے پورے ایک ہزار روبل بھیجے ہیں۔ شیطان ان کو سمجھے انھوں نے مجھے پورے ایک ہزار روبل بھیجے ہیں۔ میں اس رقم کا کیا کروں گا۔ اسی دن سے گورکی کی فضول خرچیاں شروع ہو گئیں۔ سمارا میں گورکی کے ساتھ ایک اور دلچسپ واقعہ پیش آیا جس کو اس نے اس طرح بیان کیا ہے۔

"ایک روز دریائے والگا کے کنارے ٹہل رہا تھا کہ آواز آئی مدد کرنا! ارے بھائیو مدد کرنا! رات اندھیری تھی کچھ صاف دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ مجھے اندھیرے میں ایسا معلوم ہوا کہ کوئی دریا میں ہاتھ پیر مار رہا ہے۔ میں فوراً دریا میں کود پڑا تیرتا ہوا ڈوبنے والے کے پاس پہنچا اتفاق سے اس کے بال میرے ہاتھ میں آ گئے۔ میں بال پکڑ کر اس کو کھینچتا ہوا لے آیا جب کنارے پر آ گئے تو اس آدمی نے اچانک میرا گلا پکڑ لیا اور کہنے لگا "ابے! تجھے کیا حق تھا کہ میرے بال پکڑ کر مجھے کھینچا، میں نے

جواب دیا، ارے بھائی تم ڈوب رہے تھے۔ مدد کے لیے چلّا رہے تھے، وہ بولا، ارے احمق پانی تو میرے کندھوں تک تھا۔ رسّی میں نے پکڑ رکھی تھی پھر میں کیسے ڈوبتا؟ کیا تو اندھا ہے؟ میں نے جواب دیا۔ لیکن تم مدد کے لئے تو چلّا رہے تھے کیا نہیں چلّائے اس نے کہا، پھر کیا ہوا اگر میں مدد کے لئے چلّایا۔ فرض کرو کہ میں چلّاؤں تو احمق ہے۔ تو احمق ہے تو کیا تو اس کا یقین کر لے گا۔ اچھا اب یا تو مجھے ایک روبل دے ورنہ تھانے چل، میں نے کچھ دیر تو اس سے حجّت کی پھر احساس ہوا کہ اپنے نقطۂ نگاہ سے یہ بھی درست کہتا ہے میرے پاس تانبے کے کچھ سکّے تھے وہ اس کو دے کر جان چھڑائی اور گھر ہو لیا۔ اس تجربہ کی بنا پر دنیا کو زیادہ بہتر طریقہ سے سمجھنے لگا۔"

گورکی کی شہرت ہوئی تو اسکے دوست چیخوف ..... نے گورکی کو غیر معروف وطن ترک کرنے اور ماسکو کی رہائش اختیار کرنے کا مشورہ دیا لیکن گورکی نہ مانا۔ آخر کار چیخوف کو ایک ترکیب سوجھی اس نے گورکی کو لکھا۔

"کل میں ٹالسٹائے کی خدمت میں حاضر ہوا تھا انھوں نے تمھاری بڑی تعریف کی اور یہ خیال ظاہر کیا کہ تم قابلِ قدر مصنف ہو۔ انھیں تمھارے دو افسانے، گولڈ فنچ، اور اون۔ دی رافٹ، بہت پسند ہیں لیکن مالوا پسند نہیں آیا۔ وہ فرماتے تھے کہ جو کچھ تمھارا دل چاہے تم ایجاد کرلو لیکن نفسیاتی کیفیات ایجاد نہیں ہو سکتیں تم ایسی کیفیات ایجاد کرتے ہو جو کم از کم ٹالسٹائے کے تجربہ میں نہیں آئیں میں نے ان کی خدمت میں عرض کر دیا ہے کہ جب بھی تم ماسکو آؤ گے تو تم اور میں ان کی خدمت میں حاضر ہوں گے ــ ٹالسٹائے تمھارے متعلق مدّت سے دریافت کر رہے تھے مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ تمھاری بابت بہت اچھا خیال رکھتے ہیں۔"

یہ معلوم ہونا کہ ٹالسٹائے ملنا چاہتے ہیں کسی نوخیز مصنف کے لئے باعثِ فخر تھا۔ چنانچہ اس اطلاع کے ملتے ہی گورکی نے ماسکو جانے کی ٹھان لی لیکن اس زمانہ میں اخباری زندگی کے انقلابی مقالے رنگ لا رہے تھے اور پولیس پیچھے پڑی ہوئی تھی ایک مدّت بعد جب پولیس سے رہائی ملی تو جنوری سنہ ۱۹۰۰ء میں گورکی ٹالسٹائے سے ملنے گیا۔ ٹالسٹائے اس ملاقات کے متعلق اپنی ڈائری میں اندراج کرتے ہیں۔

"گورکی ملنے آئے ان کے ساتھ باتوں میں اچھا وقت گزرا مجھے گورکی پسند آئے۔ ایک عام روسی کی نفسیاتی کیفیت کے پورے ترجمان ہیں۔ اور خود بھی انھیں میں سے ایک ہیں"

گورکی اس پہلی ملاقات کو اس طرح بیان کرتے ہیں۔

"ٹالسٹائے مجھے کتب خانے میں لے گئے مجھے بٹھایا اور خود میرے سامنے بیٹھ گئے کہ میرے افسانہ "وارلنکا" کی تحلیل کرنے لگے کہنے لگے۔ تمھارے افسانے کی وہ لڑکی وارلنکا صحت کی اچھی اور عمر بھی پندرہ سال لیکن وہ تخلیقی محبت سے بے پروا اور وہ نوجوان پروفیسر سے ہم آغوش تک نہیں ہوئی یہ کیسے ہو سکتا ہے یہ نفسیاتی طور پر غلط ہے پندرہ سال کی نوجوان لڑکی یہ چاہتی ہے کہ کوئی اس کو چھوئے اور اس سے ہم آغوش ہو۔ ٹالسٹائے نے دورانِ گفتگو میں ایسی بے حجابی برتی کہ میں پریشان سا ہو گیا۔ کبھی کبھی ان کی گفتگو صرف نامناسب ہی نہیں بلکہ گندی تک ہو جاتی تھی"

ٹالسٹائے کی اس غیر متوقع طرزِ گفتگو پر پہلے پہلے تو گورکی کو یہ گمان ہوا کہ شاید ٹالسٹائے اس کی سطح پر آ کر اس سے گفتگو کرتے ہیں شاید یہ روسی ادب کے جنرل اس کو دیہاتی خیال کر کے اس سے گاؤں والوں کی سی فحش گوئی کرتے ہیں۔ دو چار ملاقاتوں کے بعد گورکی پر یہ راز افشا ہوا کہ ٹالسٹائے اصولاً دیہاتی زبان بولنا پسند کرتے ہیں کیونکہ اس میں تصنع اور بناوٹ نہیں ہوتی وہ زبان دانی اور شہری زبان کے تکلفات کو اچھا نہیں سمجھتے جب دوستوں سے باتیں کرتے ہیں تو مچکڑ بن جاتے ہیں گورکی کا بیان ہے "بعض مرتبہ ٹالسٹائے ایسی عریاں گفتگو کرتے تھے کہ ہمارے چہرے شرم سے سرخ ہو جاتے تھے"

ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ ٹالسٹائے، گورکی اور چیخوف ٹہل رہے تھے کہ دفعتاً ٹالسٹائے نے چیخوف سے اس کے نسوانی تجربات بیان کرنے کی فرمائش کر دی۔ چیخوف بہت پریشان ہوا۔ جب ٹالسٹائے نے چیخوف کی گھبراہٹ دیکھی تو خود اپنے نسوانی تجربات ایک خاص لطف اور رنگینی کے ساتھ بیان کرنے شروع کر دیے گورکی لکھتا ہے" اس وقت گندے سے گندا لفظ بھی جو ان بالوں سے ڈھکے ہوئے ہونٹوں سے

نکلتا تھا وہ اپنی غلاظت کھو دیتا تھا اور سادہ قدرتی معلوم دیتا تھا۔" کریمیا کا ایک اور واقعہ گورکی کا ایک دوست گورکی کی زبانی اس طرح بیان کرتا ہے۔

"ایک دن میں اور اس کا دوست سمندر کے کنارے ٹہل رہے تھے کہ ہم نے دیکھا کہ کچھ فاصلہ پر ٹالسٹائے کھڑے ہوئے ہیں اور ایک سمت کسی شے کو آنکھ مار رہے ہیں۔ ہم نے ادھر دیکھا تو کیا دیکھتے ہیں کہ ایک کبوتر کا جوڑا ایک سڑک پر تخلیقی محبت میں مشغول ہے اور جہاں دیدہ ٹالسٹائے لطف آشنا ہو کر ان کی طرف آنکھ مار رہا ہے" کریمیا سے واپسی پر گورکی اور ٹالسٹائے میں خط و کتابت شروع ہو گئی، چند خطوط نمونتاً پیش ہیں۔

گورکی کا خط ٹالسٹائے کے نام۔

لیونیکولیوچ۔ اس حسن اخلاق کا جو آپ نے مجھ سے روا رکھا شکریہ مجھے آپ سے مل کر بہت مسرت ہوئی اور آپ سے نیاز حاصل ہو جانے پر فخر کرتا ہوں۔ اگرچہ مجھے پہلے سے اس کا علم تھا کہ آپ ہر مہمان سے سادہ اور پر خلوص طریقہ پر ملتے ہیں لیکن جو محبت آپ نے میرے ساتھ روا رکھی اس کی مجھے امید نہ تھی۔ اگر نامناسب خیال نہ فرمائیں تو اپنی ایک تصویر روانہ فرمائیں۔ میں ملتجی ہوں کہ تصویر سے محروم نہ فرمائیں۔"

میں ہوں آپ کا نیازمند

اے۔ پیشکوف (گورکی کا نام)

ٹالسٹائے کا خط گورکی کے نام

"معاف کرنا کہ میں ایک عرصہ کے بعد جواب دے رہا ہوں اور ہنوز تصویر بھی روانہ نہ کر سکا مجھے تم سے مل کر اور تم کو زیادہ قریب سے جان کر بہت خوشی ہوئی اور میرے دل میں جو تمھاری محبت ہے وہ مجھے مسرور کرتی ہے۔ اک کوئی کہا کرتا تھا کہ چند مصنف اپنی تصنیف سے بہتر ہوتے ہیں اور چند خراب۔ میں تمھاری تصانیف کا مداح ہوں لیکن ان سے زیادہ تمھارا مداح ہوں میرے اس جملہ سے سمجھ جاؤ کہ میں تمھارا کس درجہ مداح ہو گیا ہوں۔ تمھاری نسبت میری تعریف اگر قابل قدر ہے تو صرف اس لئے کہ یہ بے لوث ہے۔ اچھا رخصت میں خلوص سے اپنا ہاتھ تمھارے مصافحہ کے لئے پیش کرتا ہوں۔"

لیو ٹالسٹائے

گورکی کا خط ٹالسٹائے کے نام

"آپ کی تصویر اور محبت بھرے الفاظ کا بہت بہت شکریہ۔ لیونیکولیوچ۔ میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ میری ذات میری تصانیف سے بہتر ہے لیکن میرا یہ خیال ضرور ہے کہ ہر مصنف اپنی تصنیف سے بہتر ہوتا ہے، آخر کتاب ہے کیا! ایک معرکۃ آلارا کتاب بھی مردہ الفاظ کا مجموعہ ہے جو صرف حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ برخلاف اس کے انسان کی زندہ ذات خدا کی صفات کی حامل ہوتی ہے میرا خدا کا مفہوم وہ جذبہ ہے جو انسان کو حقیقت شناسی، انصاف اور اپنے آپ کو کامل بنانے پر ابھارتا ہے۔ اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ ایک برا انسان بھی ایک اچھی کتاب سے بہتر ہوتا ہے۔ کیا ایسا نہیں ہے؟ میرا یہ راسخ یقین ہے کہ اس زمین پر انسان اشرف المخلوقات ہے اور مجھے ڈیوگرینس کے اس خیال سے اتفاق ہے۔ صرف انسان کا وجود حقیقت ہے باقی سب زاویہ نگاہ ہے۔" میں انسان کا پرستار ہوں اور ہمیشہ رہوں گا۔ ہاں میں اس جذبہ کو پوری طاقت سے ادا نہیں کر سکتا۔ میں تجدید ملاقات کے لئے مضطرب ہوں اور مجھے افسوس ہے کہ فوراً ہی اپنی آرزو پوری نہیں کر سکتا مجھے کھانسی ہے اور دوران سر کی شکایت ہو گئی ہے اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ میں تیزی سے کام کر رہا ہوں۔ آج کل ضرورت سے زیادہ عقلمند لوگوں کے متعلق افسانہ لکھ رہا ہوں میرے خیال میں ایسے افراد جو اپنے آپ کو عقلمند تصور کرتے ہیں ارزل المخلوقات ہوتے ہیں۔ مجھے خوف ہے کہ مزید تحریر کہیں آپ کو اکتا نہ دے۔ اچھا رخصت میں مودبانہ آپ سے مصافحہ کرتا ہوں۔ میری طرف سے گھر والوں کو آداب۔

میں ہوں آپ کی صحت کا دعاگو

اے۔ پیشکوف

کچھ عرصے بعد گورکی پھر روسی قلندر کے پاس آ گئے اور اس کی ہر ادا کا بغور مطالعہ کرنے لگے، دونوں ساتھ ٹہلنے جاتے تو ٹالسٹائے گورکی کے افسانوں کے کرداروں کا بڑا مذاق اڑاتے اور کہتے۔ گورکی تم اپنے کردار ایجاد کرتے ہو۔ کبھی کہتے "تمھاری تصانیف سے تمھاری

.... باتیں زیادہ دلچسپ ہیں،" ایک دفعہ کہنے لگے "گورکی تم رومانیت پسند ہو، متوجد ہو، اس قسم کے لوگ اشتراکی نہیں ہوتے بلکہ ملوکیت پسند ہوتے ہیں۔ ہیوگو۔ ہیوگو بالکل فضول، بکواس، ہاں تمہارا افسانہ مسافر، مجھے پسند ہے کیونکہ اس میں تم نے ایجاد سے کام نہیں لیا ہے اور وہ تمہارا دوست چیخوف شکسپیر سے بھی خراب ڈرامے لکھتا ہے" ایک دن ٹالسٹائے کہنے لگے "ہم سب ادیب بے تکے متوجد ہوتے ہیں۔ مجھے دیکھو جب میں افسانہ لکھتا ہوں تو کسی کردار پر مجھے رحم آنے لگتا ہے اور اس میں چند اچھی خصوصیات پیدا کر دیتا ہوں اور کبھی کسی کردار کو اچھی خصوصیات سے محروم کر دیتا ہوں تاکہ سب کردار ایک دوسرے سے گرنے نہ پائیں" اور پھر سنجیدہ لہجہ میں فرمایا "اسی لئے تو میں کہتا ہوں کہ ادب جھوٹ ہے، ایک دھوکا ہے اور اس وجہ سے مذموم ہے۔"

سنہ ۱۹۰۱ء میں حکومت کی مخالفت کی بنا پر گورکی اپنے ہی شہر کی جیل میں قید کر دیا گیا۔ جب ٹالسٹائے کو گورکی کے منیجر نے اس حادثہ کی خبر دی تو ٹالسٹائے نے فوراً ہی زار روس کے بہنوئی اور وزیر خارجہ کو خطوط لکھے جو حسب ذیل ہیں۔

ٹالسٹائے کا خط زار کے بہنوئی کے نام

جناب نواب صاحب!

رہی مصنف گورکی جس کی بابت گزشتہ سال میری اور آپ کی باتیں ہوئیں تھیں اور جس کی تصانیف کی آپ نے تعریف فرمائی تھی۔ اس پر ایک حادثہ گزر رہا ہے۔ وہ اپنے اہل و عیال سے چھین لیا گیا ہے اور بلا کسی عدالتی سماعت کے نوگورود کی جیل میں ڈال دیا گیا ہے۔ اس کی بیوی حالت اُمید میں ہے۔ جیل کے صحت شکن ماحول کا آپ خود اندازہ لگا سکتے ہیں اور خود سمجھ سکتے ہیں کہ وہ ایک دق کے مریض کے لئے کتنا مضر ثابت ہو سکتا ہے۔ گورکی کی بیوی اور اس کے دوستوں کو چونکہ اس کا علم ہے کہ بحیثیت ایک انسان اور مصنف کے میں گورکی کو پسند کرتا ہوں اس لئے انھوں نے مجھ سے یہ درخواست کی ہے کہ اس مصیبت میں جو کچھ بھی ان کی مدد کر سکتا ہوں کروں یہی وجہ ہے کہ میں آپ کو تکلیف دے رہا ہوں مجھے اُمید ہے کہ گورکی کو اس مصیبت سے نجات دلانے میں آپ سعی بلیغ فرمائیں گے اور نیکی کرنے کا جو یہ موقع ملا ہے اس کو ہاتھ سے نہ جانے دینگے۔ آپکا مخلص تابعدار

ٹالسٹائے کا خط وزیر خارجہ کے نام

جناب عالی۔ گورکی کی بیوی اور اس کے دوستوں نے مجھ سے یہ درخواست کی ہے کہ پیشتر اس کے کہ نوگورود کی جیل میں بلا سماعت مقدمہ گورکی کو قتل کر دیا جائے میں اس کی رہائی کی کوشش کروں جو اس خاص جیل کے صحت شکن حالات مجھے معلوم ہوئے ہیں اُن کی بنا پر مجھے یقین ہے کہ ایک دق کا مریض ان حالات میں زیادہ دن تک زندہ نہیں رہ سکتا میں گورکی کو صرف اسی حیثیت سے نہیں جانتا کہ وہ یورپ کا ایک مشہور ادیب ہے بلکہ میں اسکو ایک معقول اور دلچسپ انسان ہونیکی حیثیت سے بھی جانتا ہوں۔ اگرچہ مجھے ذاتی طور پر آپ سے نیاز حاصل نہیں ہے لیکن مجھے اُمید ہے کہ گورکی اور اس کے اہل و عیال سے آپ ہمدردی فرمائیں گے اور جو کچھ آپ کے قبضۂ قدرت میں ہے اس سے دریغ نہ فرمائیں گے۔ اُمید ہے کہ مجھے نااُمید نہ فرمائیں گے......

لیو ٹالسٹائے

ان خطوط کا یہ اثر ہوا کہ گورکی کو جیل سے نکال کر صرف حراست میں رکھا گیا اس حراست کے دوران میں گورکی ٹالسٹائے کو خط لکھتے ہیں۔

"لیو نیکولیوچ۔ میرے معاملے میں آپ نے جو سعی فرمائی اس کا بہت شکریہ۔ میں جیل سے رہا کر دیا گیا ہوں لیکن حراست میں ہوں۔ میری بیوی حالت اُمید میں ہے اس لئے حراست بھی رحمت ہے شاید ایک ماہ جیل میں رہا ہوں گا۔ اس عرصے میں میری صحت پر کوئی خاص برا اثر نہیں پڑا اور نہ میری بیوی کی صحت پر عدالتی تحقیقات جاری ہے، جہاں تک میں خیال کرتا ہوں اس تحقیقات کا یہ نتیجہ نکلے گا کہ وہ مجھے وطن سے دور کہیں پھینک دیں گے اور پولیس کی نگرانی میں رکھیں گے۔ دوبارہ میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور اس کی معافی چاہتا ہوں کہ اس معمولی سے معاملہ میں آپ کو تکلیف اُٹھانی پڑی۔

یہ حراست بڑی مضحکہ خیز ہے اگر ایک سپاہی باورچی خانہ میں ہے تو دوسرا پھاٹک پر اور تیسرا سڑک پر۔ میں گھر کے قریب چہل قدمی کر سکتا ہوں لیکن پولیس کا سپاہی سایہ کی طرح ساتھ ہے۔ مجھے ان سڑکوں پر جانے کی اجازت نہیں جہاں آمد و رفت زیادہ ہو

سیاسی کو بھی ایک ایسے انسان کی نگرانی کرنا مضحکہ معلوم ہوتی ہے جس کا ارادہ کبھی بھی وطن سے فرار ہونے کا نہیں۔ اچھا رخصت، آپ کو صحت، طاقت اور سکون قلب حاصل ہو۔ میں خلوص کے ساتھ آپ کے معانقہ کے لئے اپنا ہاتھ پیش کرتا ہوں۔

اے چیخوف

۱۶ رجولائی سنہ ۱۹۰۱ء کو جب ٹالسٹائے ایک خطرناک علالت کے بعد صحت یاب ہوئے تو دنیا کی ہر سمت سے تہنیت و مبارک باد کے تار آئے گورکی کے وطن سے بھی حسب ذیل تار آیا جس پر سب سے پہلے دستخط گورکی کے تھے۔

"سب لوگ بے حد مسرور ہیں کہ آپ روبہ صحت ہیں۔ اے بزرگ انسان ہماری یہ دلی تمنا ہے کہ حق پرستی کے لیے تو اس دنیا میں صحت یاب رہے تاکہ میرے انتھک شمشیر بکف الفاظ جھوٹ، کینہ اور افترا کے خلاف ہمیشہ جہاد کرتے رہیں"

سنہ ۱۹۰۱ء میں جب ٹالسٹائے صحت کے خیال سے کریمیا گئے تو اس زمانہ میں دونوں دق کے مریض گورکی اور چیخوف بھی روسی قلندر کے پاس پہنچ گئے گورکی نے ایک یادداشت چھوڑی ہے جس کے حسب ذیل اندراجات دلچسپ ہیں۔

"ایک دن گورکی نے دیکھا کہ ٹالسٹائے اپنی پیٹی میں ہاتھ دیے کھڑے ہیں اور ایک گوہ (بڑی قسم کی چھپکلی) سے جو دھوپ کھا رہی تھی کہہ رہے ہیں "مزا آ رہا ہے نا"، پھر چاروں طرف دیکھا اور گوہ سے کہنے لگے "میں ہوں کہ زندگی میں کوئی لطف محسوس نہیں کرتا"

گورکی لکھتا ہے کہ باوجود اس امر کے کہ ٹالسٹائے نے اپنے پوشیدہ و پوشیدہ واقعات بے کم و کاست سپرد قلم کر دیے ہیں اور ان کا ذہنی رجحان شدت سے مذہبی تھا لیکن وہ زندگی کا معمہ نہ حل کر سکے تھے اور ان کی نگاہ جب بھی اٹھتی تھی تو خلا کے سوا کچھ نہ دیکھتی تھی گورکی لکھتا ہے "یہ خلا میں دیکھنا ٹالسٹائے کے ہر اثبات کی نفی کرتا ہے وہ جب اپنے بے تکلف دوستوں میں بیٹھتے تھے تو کبھی کبھی اس پردہ سے نقاب اٹھتا تھا"

ایک دن چیخوف نے لیو شیسٹوف کی کتاب "نطشے اور ٹالسٹائے کی تعلیمات میں خیر و شر کا تخیل" کا ذکر کیا اور اس پر تنقید کرتے ہوئے کہا کہ اس کو کتاب پسند نہ آئی۔ ٹالسٹائے نے اس کی فوراً مخالفت کی اور کہا "کتاب دلچسپ ہے۔ میں سٹری قسم کے لوگوں کو پسند کرتا ہوں بشرطیکہ ان کے دل میں خلوص ہو۔ چیخوف کہتا ہے کہ حقیقت کی جستجو فضول ہے وہ درست کہتا ہے۔ حقیقت کس مصرف کی، حقیقت معلوم ہو یا نہ ہو آخر مرجاتا ہے" پھر تیزی سے بولے "ایک مرتبہ انسان فکر کرنے کا عادی ہو جائے پھر وہ خواہ کسی مسئلہ ہی پر غور کیوں نہ کرے در اصل وہ موت پر غور کرتا ہے اور جہاں موت ہے وہاں کیا حقیقت ہو سکتی ہے"

ایک دن ٹالسٹائے کہنے لگے "خلیفہ عبدالرحمٰن کہا کرتے تھے کہ تمام عمر میں ان کے چودہ دن خوشی سے گزرے ہیں لیکن میرے اتنے دن بھی خوشی سے نہیں گزرے اور اس کی یہ وجہ ہے کہ میں کبھی اپنے لئے زندہ نہیں رہا . . . دکھاوے اور خود نمائی کے لئے زندہ رہا ہوں"۔ اس خود نمائی کے سلسلہ میں گورکی اور ٹالسٹائے کا حسب ذیل مکالمہ دلچسپ ہے۔

ٹالسٹائے:- گورکی! اسکول کب جا رہے ہو؟

گورکی:- اب تک چلا جاتا لیکن نوجوانوں کی لیگ نے مجھے دعوت دی ہے کہ ان کے جلسہ میں اپنا کوئی افسانہ پڑھوں۔

ٹالسٹائے:- کیا تم بہت اچھا پڑھتے ہو؟

گورکی:- نہیں تو۔

ٹالسٹائے:- تب دعوت قبول کرنے کی کیا ضرورت ہے! کیا خود نمائی مقصود ہے؟

گورکی:- (شرم سے سرخ ہو کر) نوجوانوں کی لیگ مصر ہے اس لئے مجھے دعوت قبول ہی کرنی پڑی۔

ٹالسٹائے:- خواہ کوئی مصر ہی کیوں نہ ہو لیکن اس طرح صرف خود نمائی کے لئے کہیں جانا ناجائز ہے۔ ایک دفعہ ماہرین سائنس کی کانگریس ہوئی ایک دوست مجھے بھی لے گئے جب میں صدر مقام پر پہنچا تو حاضرین نے مجھے پہچان لیا اور میرا استقبال کرنے کے لئے تالی بجائی۔ میرے دوست نے مجھے کہنی ماری اور کہا لیو تمہارا استقبال ہو رہا ہے۔ حاضرین کے سامنے جھکو! میں نے کہا کیوں جھکوں میں نے کیا قصور کیا ہے؟"

اس مکالمے سے اگلے روز گورکی کے ایک دوست پولسی

ٹالسٹائے سے ملنے آئے تو ٹالسٹائے نے کہا بھئی کل میں نے تمہارے دوست کا دل دکھا دیا۔ میں نے اس سے یہ نہیں کہا کہ اس کی سب سے بڑی ادبی خدمت یہ ہے کہ اس نے ہمارے سامنے ایک آوارہ انسان کا جیتا جاگتا مرقع پیش کیا ہے۔ ڈوسٹووسکی نے ایک مجرم کا اور گورکی نے ایک آوارہ انسان کا قابل داد مرقع پیش کیا ہے جو دنیا کے ادب میں یادگار رہے گا۔ گورکی میں صرف یہ کمی ہے کہ وہ بہت کچھ ایجاد کر دیتے ہیں نفسیاتی کیفیات کو وہ قدرتی نہیں رکھتے" ٹالسٹائے ایک دوست کو خط میں لکھتے ہیں "گورکی شاید غیر شعوری طور پر نٹشے کی مقبول تعلیم سے متاثر معلوم ہوتے ہیں مجھے نٹشے کی تعلیم بیحد مکروہ معلوم ہوتی ہے"

گورکی کے جو افسانے ٹالسٹائے کی نظر سے گزرے ان کے حواشی پر ٹالسٹائے کے قلم کے اس قسم کے .. نوٹ درج ہیں "غلط، نفرت آمیز، مکروہ، جب ٹالسٹائے نے گورکی کی تصنیف "اعترافات" پڑھی تو فرمایا "یہ عقل سے بالاتر ہیں" وفات سے دو سال قبل ٹالسٹائے اپنی ڈائری میں لکھتے ہیں "گورکی کی تصانیف پڑھیں بہت برا۔ مجھے ان کی ایجاد و اختراع بہت غلط معلوم ہوتے ہیں۔ اگر گورکی سے لطف اندوز ہونا ہے تو ان کی سقم پر نہیں بلکہ ان کی خوبیوں پر نظر رکھنی چاہیئے" ڈائری میں دوسرا اندراج ہے "گورکی کی تصانیف ختم کیں ایک مصنوعی خیالی طوفانی جذبات جو سب غلط اور اختراع معلوم ہوتے ہیں لیکن گورکی قلم کے دھنی ہیں ان کو شاعری کرنی چاہیئے کیونکہ شاعری میں خیال اور دماغ کے لیئے آوارہ گردی کرنے کا میدان بہت وسیع ہے۔ شاعری میں ہر قسم کا اختراع نبھ جاتا ہے یا پھر ڈراما لکھنا چاہیئے کیونکہ اس میں بھی منظر اور ایکٹر ڈرامے کے سقم چھپا لیتے ہیں۔

ایک دن چیخوف اور ٹالسٹائے باتیں کر رہے تھے دوران گفتگو میں گورکی کا ذکر آگیا چیخوف نے کہا "گورکی بڑا رحمدل انسان ہے" ٹالسٹائے نے فوراً گردن ہلائی اور بولے نہیں نہیں ان باتوں کو میں تم سے بہتر سمجھتا ہوں اس کی بطخ کی سی ناک ہے ایسے لوگ دل کے بڑے خراب ہوتے ہیں دراصل دوسری بات یہ ہے کہ عورتیں گورکی کو پسند نہیں کرتیں اور جس طرح کتا نیکدل انسان کو فوراً سونگھ لیتا ہے اسی طرح عورتیں بھی ایک نیکدل انسان کو سونگھ لیتی ہیں کیونکہ عورتیں گورکی سے محبت نہیں کرتیں اس لئے معلوم ہوتا ہے کہ وہ نیک دل نہیں ہے"

ایک دن ٹالسٹائے اور گورکی ٹہل رہے تھے کہ جھاڑی میں سے ایک چڑیا کے بولنے کی آواز آئی ٹالسٹائے نے اس کی آواز کی نقل کرنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہوا گورکی چڑیا رسیدہ چکا تھا۔ اس لئے چڑیوں کی بابت اس کی معلومات کافی تھی گورکی نے اس چڑیا کی یہ خصوصیت بیان کی کہ یہ چڑیا بہت حاسد ہوتی ہے۔ اس پر ٹالسٹائے بولے "صرف ایک راگ سینے میں ہے اور اس پر بھی حاسد ہے۔ کیا ظلم ہے کہ انسان کے سینہ میں ہزاروں نغمے ہیں اور جب وہ حسد کرتا ہے تو دنیا اس کو برا کہتی ہے پھر حسد کی بابت گفتگو ہونے لگی اور ٹالسٹائے نے اپنے پہلے خیال سے جس کا اظہار وہ اپنے ناول "کوٹرز سوناٹا" میں کر چکے تھے۔ اختلاف کیا گورکی نے کہا "کرٹرز سوناٹا" میں تو آپ نے اور خیال ظاہر کیا ہے اس پر ٹالسٹائے نے ہنس کر جواب دیا "میں چڑیا نہیں ہوں کہ ایک ہی راگ گاتے جاؤں"

اگر ٹالسٹائے گورکی کی تصانیف پر سخت تنقید کرتے تھے تو گورکی بھی ٹالسٹائے کے فلسفہ پر تنقید کرنے میں کچھ کم نہ تھے گورکی کا خیال تھا کہ ٹالسٹائے کا فلسفہ ( ) تراجی اور چینیوں کا فلسفہ ہے۔ ان کا عدم تشدد اور اہنسا کا فلسفہ قوت عمل کو مفلوج کرتا ہے۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ گورکی ڈاکٹر الکوف اور ٹالسٹائے باتیں کر رہے تھے کہ ٹالسٹائے نے ایک مغربی مصنف کے ناول کے ایک سین کی بڑی تعریف کی جس میں ایک شرابی میاں نے اپنی بیوی کو زدوکوب کیا تھا لیکن باوجود خاوند کے اس تشدد کے شریف بیوی نے میاں کا بستر کیا اس کو آرام سے لٹایا اور اس کے سر کے نیچے تکیہ رکھا۔ ٹالسٹائے کی رائے تھی اس سین میں ادبی جوہر موجود ہے۔ گورکی اس وقت تو ٹالسٹائے کی رائے سنتا رہا لیکن جب ڈاکٹر الکوف کے ساتھ گھر واپس ہوا تو خیال میں مستغرق خود ہی خود طعن سے کہنے لگا تکیہ سر کے نیچے رکھ دیا! یہ ادبی جوہر ہے! ایک کفگیر اٹھا کر کھوپڑے پر مارتی"، باوجود ان اختلافات کے گورکی ٹالسٹائے سے بہت محبت کرتا تھا۔ کریمیا کے حالات میں لکھتا ہے۔

"ایک روز چہل قدمی کر رہا تھا کہ دیکھا ٹالسٹائے پتھروں میں گھسے بیٹھے ہیں ..... ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی پرانے پتھر میں جان پڑ گئی ہے ..... ایک پتھر پر کہنی ٹکی ہوئی ہے ٹھوڑی ہتھیلی پر ٹکی ہوئی ہے۔ ڈاڑھی کے سفید بالوں میں سے انگلیاں نکلی ہوئی ہیں اور سمندر کے پار نظر ڈال رہے ہیں..... سمندر کی موجیں اس پہاڑ سے ٹکرا رہی ہیں ...... ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایک جادوگر سمندر کی موجوں کو حکم دے رہا ہے ..... اس سین نے میرے قلب پر عجیب اثر کیا ......

اس وقت مجھے ایسا احساس ہوا کہ جس وقت تک یہ انسان روئے زمین پر موجود ہے۔ میں یتیم و لیسر نہیں ہوں، جب ٹالسٹائے کی وفات کی خبر آئی تو گورکی کی روتے روتے ہچکی بندھ گئی اور اس وقت واقعی اس کو یہ احساس ہوا کہ وہ یتیم و لیسر ہو گیا ہے۔

گورکی اگرچہ ٹالسٹائے کے مذہبی تخیلات سے بیزار تھا، لیکن اتنا نہیں جتنا سمجھا جاتا ہے گورکی لکھتے ہیں:—

"ٹالسٹائے نے اچانک مجھ سے دریافت کیا گورکی تم خدا کو کیوں نہیں مانتے؟ میں نے عرض کیا لیونیکولیوچ مجھے یقین پیدا نہیں ہوتا۔ اس پر وہ فرمانے لگے یہ غلط ہے۔ تم فطرتاً خدا میں یقین رکھتے ہو۔ خدا کو مانے بغیر چارہ نہیں تم تھوڑے ہی عرصے میں اس حقیقت کا احساس کر لوگے۔ دنیا ویسی نہیں جیسا کہ تم اس کا ہونا چاہتے ہو۔ تمہارا خدا پر یقین نہ رکھنا صرف ہٹ دھرمی کی بنا پر ہے۔ کچھ لوگ صرف شرم کی وجہ سے خدا پر یقین نہیں رکھتے جیسے چند نوجوان ہیں کہ عورت ان کو پسند تو ہوتی ہے لیکن شرم یا کم سنی کی بنا پر اپنی پسندیدگی کا اظہار نہیں کرتے یقین مثل محبت کے جرأت چاہتا ہے۔ اگر انسان اپنے آپ سے کہے میں یقین کرتا ہوں تو سب کام درست ہو جائیں تم اپنی پیدائش سے خدا پر یقین رکھتے ہو اب یہ کہنا بیکار ہے کہ تم یقین نہیں رکھتے۔ تم کہتے ہو جمال اور جمال کیا شے ہے؟ یہ خدا کا بلند تر اور مکمل تر راگ ہے کیونکہ ٹالسٹائے نے اس سے قبل کبھی مجھ سے اس موضوع پر گفتگو نہیں کی تھی اس لئے اس غیر متوقع گفتگو نے مجھے متحیر سا کر دیا اور میں کچھ جواب نہ دے سکا۔ پھر ٹالسٹائے نے ہنس کر انگلیاں میری طرف ہلاتے ہوئے کہا تم چپ رہ کر اپنا پیچھا نہیں چھڑا سکتے۔ ہرگز نہیں چھڑا سکتے" اس بات کے بعد گورکی لکھتے ہیں۔

"میں اگرچہ خدا پر یقین نہیں رکھتا لیکن اس وقت میں نے دل میں کہا کہ یہ انسان خدا سے قریب تر ہے"

ایک خط جس سے گورکی کی طبعی شرافت کا پتہ چلتا ہے حسب ذیل ہے جب گورکی کی تصانیف کی شہرت تمام دنیا میں پھیل چکی تھی اور وہ دنیائے ادب کا ایک درخشندہ ستارہ مانا جا چکا تھا اس وقت اپنے دوست اور مربی کلیتی آزنی کو جس نے گورکی کو سوانح حیات لکھنے پر مجبور کیا تھا لکھا:

میرے حبیب دوست اور استاد!

آج ۴۴ سال گزر چکے ہیں جب مجھے پہلی مرتبہ آپ سے نیاز حاصل ہوا تھا۔ جب آپ اور میں آخری مرتبہ ملے تھے اس کو بھی آج ۲۲ سال ہو چکے ہیں۔ اس طویل عرصے میں مجھے سیکڑوں انسانوں سے ملنے کا اتفاق ہوا جن میں امیر بھی تھے اور عالم بھی لیکن یقین کیجئے کہ ان میں سے کسی کی محبت نے اس جذبہ کو مدھم نہیں کیا جو آپ کے لئے میرے دل میں موجود ہے۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ آپ پہلے شخص تھے جس نے میری طرف خاص انسانی ہمدردی کی نظر ڈالی۔ آپ پہلے انسان تھے جس نے مجھ میں خود شعوری پیدا کی اور یہ آپ کی ہمت افزائی کا نتیجہ ہے کہ ۳۰ برس سے میں روسی ادب کی خدمت کر رہا ہوں اس امر کے تحریر کرنے کی ضرورت اس لئے محسوس کرتا ہوں تاکہ دنیا پر روشن ہو جائے کہ انسان کی انسان سے ہمدردی کرنا کتنی عجیب شے ہے۔ میرے دیرینہ دوست۔ میرے حبیب اُستاد میں محبت اور تشکر سے اپنا ہاتھ آپ کے معانقہ کے لئے پیش کرتا ہوں۔

الیکسی پیشکوف (گورکی کا اصل نام)

سیفی بک مینوفیکچرنگ ڈپو

لیٹر بک، رائٹنگ پیڈ، نوٹ پیپر، اکسرسائز بک، نوٹ بک
ڈپلیکیٹ بک

اور

ہر قسم کی اسٹیشنری کے ہول سیل اور ریٹیل کیلئے

ہماری خدمات حاصل کرکے فائدہ اٹھائیے

سیفی بک مینوفیکچرنگ ڈپو

۷۲ - عبدالرحمٰن اسٹریٹ بمبئی ۳





قرآن مجید حمائل شریف

فہرست مفت طلب کریں

کتب خانہ تاج آفس

پروپرائٹرز۔ سیفی فقیہ برادران

محمد علی روڈ بمبئی نمبر ۳

بڑھاپے میں

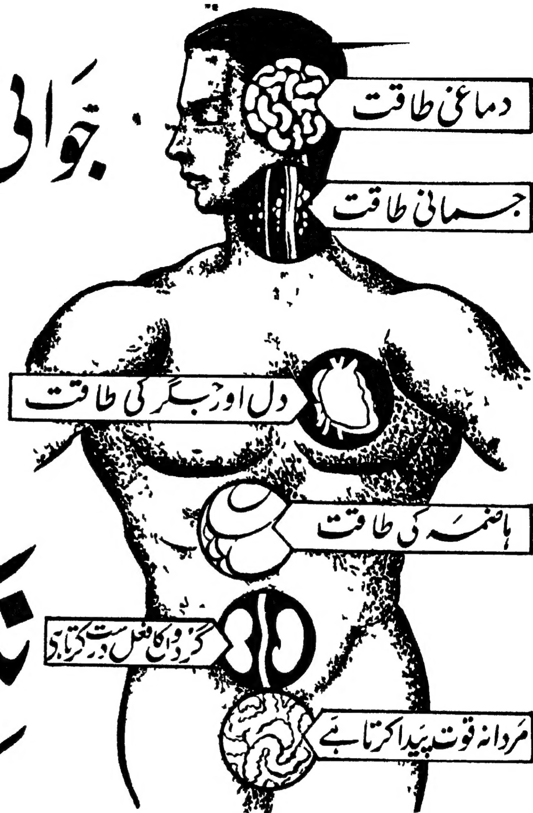
جوانی کی طاقت اور

تندرستی

پھر حاصل کیجیے

NIXOL

نِکسول



چند روزہ نِکسول کے استعمال سے

کمزور اور بوڑھے اشخاص میں بھی جوانوں کی سی طاقت پیدا ہو جاتی ہے اس طاقت کا دارومدار جسم کے غدودوں پر ہے جیسا کہ تصویر میں بتایا گیا ہے نکسول ان تمام غدودوں کو طاقت دے کر انسان کو مضبوط بناتا ہے قیمت فی بکس … روپیہ چھ بکس تین روپیہ۔ اچھے دوا فروشوں سے طلب کیجیے۔

نکسول ڈپو، پوسٹ بکس ۳۰۶۵ بمبئی ۳

Printed and published by Saghar Nizami for the Proprietors Adabi Markaz Hind Publisher
at the Kadri Press Noor Manzil Mohamedali Road BOMBAY 3